[illegible]

مرتبہ

عبدالحفیظ صدیقی

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علمی و ادبی مجلہ

علی گڑھ میگزین

اشاعت ۵۶-۱۹۵۵

نگران
پروفیسر رشید احمد صدیقی
صدر شعبۂ اردو

مینیجر
سید ظہیر الدین علوی
لکچرر شعبۂ اردو

ایڈیٹر
عبد الحفیظ صدیقی
ایم - ایس سی - ایل ایل - بی (فائنل)

ایڈیٹوریل بورڈ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۶ء

علی گڑھ کے "مغنیِ آتش نفس"

مجازؔ مرحوم

کی

یاد میں

ایڈیٹر

نذرِ علیگڑھ

مجازؔ مرحوم

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اِس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات اُبلتی ہے

اسلام کے اس بُت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

یاں حُسن کی برق چمکتی ہے، یاں نور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے

ہر شام ہے شامِ مصر یہاں، ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا، یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

فہرست حصۂ اول

فہرست حصہ دوم

حرفِ اوّل

ایڈیٹر

علیگڈھ میگزین کی تازہ پیشکش حاضرِ خدمت ہے۔ یہ شمارہ مجازؔ مرحوم کے نام سے انتساب پاکر شائع ہو رہا ہے۔ اس کا حصہ اول مجازؔ کی شخصیت اور فن کے مطالعہ کے لئے وقف ہے۔ جوانامرگ مجازؔ کی موت سے علمی اور ادبی حلقوں اور بالخصوص نوجوانوں کو جو ٹھیس لگی ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ مجازؔ کے شعری ترانوں میں جو کیف و سرمستی، طبیعت کا جو بانکپن اور نظر کی جو سرشاری تھی وہ نئی پود کے لئے خاص کشش کا سامان رکھتی ہے۔ مجازؔ سے محرومی نے یہ اثر ڈالا گویا فضا میں کوئی ایسا نغمہ جو بہت دلنواز ہو کھو گیا اور طبیعت اس کے شوق طلب میں بے اختیار بے چین سی ہو گئی۔ علیگڈھ کے ساتھ مجازؔ مرحوم کے جو روابط تھے وہ صرف "ذاتی" قسم کے نہیں تھے۔ ان سے مجاز کی شاعری کو محرکات، موضاعات اور نگاہ کا آب و رنگ سب کچھ ملا۔ مجازؔ نے اپنے سخن کی صہبا میں علیگڈھ کی مستیٔ نظر او مستیٔ کردار کی خوب خوب جلوہ نمائی کی ہے۔ ہمارے اوپر یہ فرض تھا کہ ہم اپنے جوانامرگ شاعر کی یاد میں صرف غم کے آنسو ہی نہ بہائیں بلکہ اس کے ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کریں اور اس کی شخصیت کے جادو اور فن کی ساحری کا بھی سراغ لگائیں ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ ہمیں اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر یہ خدمت انجام دینا چاہئے تھی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے جو کچھ ہو سکا وہ پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔

پچھلے برس ڈیڑھ برس میں اردو ادب "صیادِ اجل" کی بے خطا تیر اندازی کا جس طرح ہدف رہا ہے اس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی۔ ہماری بزم کے کیسے کیسے صاحب گفتار اور مجلس شعر و سخن کے کیسے کیسے نغمہ نواز دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی بھری محفل کو چھوڑ راہ عدم اختیار کر گئے۔ خواجہ حسن نظامی، علامہ بیخودؔ دہلوی،

دتاثر، کیفی، چراغ حسن حسرت، اقبال احمد سہیل، قاضی عبدالغفار، سعادت حسن منٹو، جوش ملیح آبادی، اسلم جیراج پوری، قاضی اختر جوناگڑھی، اعظم کریوی، علی منظور حیدرآبادی اور اسرارالحق مجاز۔ موت نے گویا اردو کا گھر دیکھ لیا ہے۔ ایک جمی جمائی محفل کو بے رونق کرنے پر تُل سی گئی ہے۔ جانے والوں پر چشم حسرت آنسو بہاتی ہے اور ان کی خالی جگہوں کو دیکھ کر دماغ حیران رہ جاتا ہے کہ اب یہ جگہ پر کرنے والے ملیں گے کہاں؟

علیگڈھ کے رشتہ سے ہماری نگاہ اسرارالحق مجاز کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ مولانا اقبال احمد سہیل اور قاضی عبدالغفار پر پڑتی ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے اردو ادب کی جو گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں انھیں ادب کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ مولانا اقبال احمد سہیل کی حیرت انگیز مہارت شعر گوئی اور ادیبانہ ژرف نگاہی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مولانا ایم اے او کالج کی اعلیٰ ترین ادبی روایتوں کے حامل تھے۔ اور قریب چالیس برس تک وہ اپنی بے پناہ علمی صلاحیت اور شاعرانہ عظمت کا ثبوت دیتے رہے۔ قاضی عبدالغفار جن کی زندگی آخری دور میں اردو کی کشمکش حیات سے وابستہ ہوگئی تھی، علیگڈھ کے ان ہونہار فرزندوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے ذہن کے نقوش ادب و تہذیب پر ہمیشہ کے لئے ثبت کردئے۔ ایک صاحب طرز انشا پرداز، ماہر فن صحافی، اور بالغ النظر مورخ کی حیثیت سے قاضی صاحب کو ادب میں جو مقام حاصل ہے اس سے قطع نظر اردو زبان کے لئے عملی جد و جہد کرنے والوں میں ان کا امتیاز خصوصی طور پر قابل لحاظ ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اسرارالحق مجاز ان بزرگوں کے سامنے نوعمر تھے اور ان کی خدمت ادب کا دائرہ بھی اتنا وسیع نہیں تھا۔ ہم نے کام کا آغاز اس کوشش سے کیا کہ زیر نظر شمارہ ایک خصوصی نمبر ہو جو علیگڈھ کے ان تین فرزندوں کی شخصیت و فن کے مطالعہ کے لئے وقف ہو۔ وقت کی تنگی نے ہمیں اخیر میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا اور ہم نے اس شمارے کے ایک حصہ کو صرف مجاز کے لئے وقف کردیا دوسرے حصے میں علمی و ادبی اور تحقیقی مضامین اور نظمیں شامل کرکے اس شمارے کو مجاز کے نام سے معنون کردیا ہے۔ ہماری کوشش جاری ہے اور ہمیں پوری امید ہے کہ تعطیلات کے بعد علیگڈھ میگزین کا جو شمارہ شائع ہوگا وہ علامہ اقبال احمد سہیل مرحوم اور قاضی عبدالغفار مرحوم کی نذر ہوگا۔

یونیورسٹی کی زندگی میں یہ تعلیمی سال کئی حیثیتوں سے بہت ممتاز رہا۔ علی گڑھ کو نئے ہندوستان میں جو اہم تہذیبی اور اجتماعی کام انجام دینا ہے اس کا احساس اس سال کی تقریبوں میں خاص طور سے نمایاں ہوا۔ اسلامی دنیا کے دو خود مختار فرمانرواؤں کا ورود مسعود، قائد وطن پنڈت جواہر لال نہرو، ملک اور بیرون ملک کے نامور زعماء کی آمد اہم تعلیمی اور تہذیبی اداروں کی نشستیں، غرض مختلف حیثیتوں سے اس سال علیگڈھ بیرونی دنیا کے لئے مرکز نظر بنا رہا۔ نئے ہندوستان میں مشترک تہذیب کی صورت گری علیگڈھ کو ایک خاص نہج سے بڑے حسن نظر اور فراخ دلی کے ساتھ انجام دینا ہے۔ ایسی ہی تعمیر پر ملک کی پائیدار اور مستحکم ترقی کا بڑی حد تک مدار ہے۔ یہ ہے وہ حاصل جو ان تمام تقریبات کے نتیجے میں ظاہر ہو کر سامنے آیا۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ ہمارے محبوب وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنی قائدانہ بصیرت اور حیرت انگیز تعلیمی تجربات کی روشنی میں علیگڈھ کی آیندہ ترقی کے جو خطوط قائم کر دئے ہیں وہ حال کی بہ نسبت کہیں زیادہ روشن تر نتائج کے ساتھ مستقبل قریب میں ارباب نظر سے داد و تحسین حاصل کریں گے اور دنیا دیکھ لے گی کہ "بستان سید" کے اس مرد باہمت نے ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہونے والے دور ابتلا میں نہ صرف علیگڈھ کے لئے استحکام زندگی کے روشن امکانات پیدا کئے بلکہ ہندوستان کی نئی تہذیبی اقدار و روایات کی ساخت و پرداخت میں اس کے ذوق نظر کی کتنی کارفرمائی ہے۔

علیگڈھ اور اردو کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایم اے او کالج کے دور قیام سے علم اور عرفان کا یہ مرکز اردو کی نشو و ترقی کے ساتھ خصوصی ربط رکھتا ہے۔ جدید اردو نثر کی بنیاد علیگڈھ تحریک کے بانی اور اس کے رفقا کے ہاتھوں پڑی اور جدید نظم کو جولانی اور تگ و تاز کے وسیع میدان علیگڈھ تحریک ہی کے فیضان سے میسر آئے۔ سرسید اور محسن الملک کی مقالہ نگاری، حالی کی طرز جدید پر نظم گوئی اور سوانحی و تنقیدی خدمات، شبلی کا ذوق تحقیق و تاریخ، نذیر احمد کی خطابت، جدید اردو ادب کے یہ آب و رنگ علیگڈھ ہی کے فیضان کا پرتو ہیں۔ ان بزرگوں نے جو مستحکم ادبی روایات قائم کیں اور ادب میں حیات نو کا جو صور پھونکا اس کے اثرات محض ان کے دور تک محدود ہو کر نہیں رہ گئے۔ علیگڈھ کے ماحول میں اتنی نمو پذیری تھی کہ اس نے ارتقا کے تقاضوں کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے ان روایات کو نئے سے نئے قالب اور حسن و تزئین کے لئے سامان فراہم کئے۔ پچھلے

ستر پچھتر برس میں علیگڈھ نے جو ادیب اور شاعر پیدا کئے ان کے کارنامے کیا بہ لحاظ کمیت اور کیا بہ لحاظ کیفیت تاریخ ادب میں پائیدار قدر و قیمت حاصل کر چکے ہیں۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ خدمت جو علیگڈھ نے اُردو ادب کی انجام دی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ زندگی کے نئے تقاضوں کا ساتھ دیا اور ادب کے ذریعہ سے کاروانِ حیات کی رہبری کی۔ یہ واقعہ ہے کہ اجتماعیت کے زندہ احساس کے ساتھ انفرادیت کے نشو و نما کا جو آئیڈیل علیگڈھ نے پیش کیا ہے وہ ہندوستان کی کسی دوسری تعلیمی درسگاہ کے ہاتھوں سر انجام نہ پاسکا۔ علیگڈھ نے ہمیشہ اردو کی خدمت کو فرض سمجھ کر انجام دیا اور کبھی یہ تصور بھی پیدا نہ ہونے دیا کہ اردو صرف اسی کی جاگیر ہے۔ یہاں مختلف الخیال، مختلف العقائد، دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے ہر دَور اور ہر زمانے میں تہذیب اور تربیت ذہن کے کام میں بلند حوصلگی کے ساتھ شریک ہوئے اور حسن نظر اور حسن خیال کی تصویریں مختلف رنگوں کے خوشگوار امتزاج سے تیار ہوئی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں سابقہ روایات کی بدولت علیگڈھ کی مرکزیت بڑی اہمیت کے ساتھ ابھر آئی ہے اور پورے ملک کی نگاہیں اردو کی ترویج اور ترقی کے لئے علیگڈھ پر لگی ہوئی ہیں۔ ہر عظیم ورثہ اپنے امینوں کے سامنے فرائض کا ایک وسیع میدان کھول دیتا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جس سے علیگڈھ والے آج کل دوچار ہیں۔ ہم اس احساس کو نہ صرف ہندوستان کی ترقی کے لئے بلکہ اردو کے استحکام و بقا کیلئے فال نیک سمجھتے ہیں۔

نئے ہندوستان میں اردو کا سب سے بڑا مرکز علیگڈھ ہی ہوسکتا ہے ہمارے لئے یہ امر خصوصی طور پر وجہ مسرت ہے کہ ذاکر صاحب جن کی قیادت میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اردو کے وجود و بقا کے لئے پچھلے سات آٹھ برس میں بڑے وقار کے ساتھ جد و جہد کی ہے یونیورسٹی میں بھی اردو کے کام کی وسیع پیمانے پر تنظیم کے لئے روز اول سے ساعی رہے ہیں۔ ابھی چند ماہ ہوئے مسٹر عطاء اللہ درّانی نے، جو ایم اے او کالج کے ایک ممتاز اولڈ بوائے اور ذاکر صاحب کے ایک مخلص دوست ہیں، یونیورسٹی کو پچیس ہزار روپے کا ایک عطیہ "سید حسین اردو ریسرچ چیئر" کے قیام کے لئے مرحمت کیا۔ حال ہی میں درّانی صاحب علیگڈھ تشریف لائے اور اس کام کو مستحکم اور پائیدار کرنے کے لئے موصوف نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر کا ایک مستقل فنڈ محفوظ کر کے اردو ادب کی وسیع اور اعلیٰ پیمانے پر خدمت کے لئے ایک نئی راہ کھول دی۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ ہم درّانی صاحب کا اس

گراں قدر عطیہ پر مناسب طریقے سے شکریہ ادا کر سکیں۔

ہمیں دلی مسرت ہے کہ "سید حسین ریسرچ چیر" پر اردو کے مشہور ادیب، نقاد اور سخنور جناب آل احمد سرور صاحب بحیثیت پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ سرور صاحب ہمارے ادارے کے ایک ممتاز اولڈ بوائے ہیں۔ ان کی اعلیٰ علمی، تنقیدی اور تنظیمی صلاحیتوں کی پوری ادبی دنیا معترف ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ سرور صاحب کی مراجعت علی گڑھ سے اس ادارے میں وسیع پیمانے پر منظم ادبی خدمت کے لئے راہیں ہموار ہوں گی۔ ہم محترم سرور صاحب کو اس اعزاز پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ہمیں اس کا بھی یقین ہے کہ سرور صاحب بہت جلد ذاکر صاحب کی رہنمائی میں یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی مدد سے "سید حسین ریسرچ چیر" کو ایک وسیع المقاصد اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی شکل دیدیں گے۔ علیگڈھ سے اردو دنیا نے جو توقعات وابستہ کر رکھی ہیں ان کی ہمہ جہتی تکمیل کی راہ اسی انسٹی ٹیوٹ سے کھلے گی۔

سال گذشتہ علیگڈھ میگزین کا خصوصی شمارہ "علی گڑھ نمبر" کے نام سے محترم نسیم قریشی صاحب کی ادارت میں شائع ہوا اس شمارے کا مقصد اشاعت، علیگڈھ تحریک کے مختلف النوع پہلوؤں کا تنقیدی مطالعہ اور شخصیات علیگڈھ کے کارناموں کا جائزہ تھا۔ کام جتنا اہم تھا اتنا ہی اس کا سرانجام دینا مشکل بھی تھا لیکن ہمیں فخر ہے کہ نسیم صاحب قریشی نے مسلسل تگ و دو سے اس خاص نمبر کو اتنے اہتمام اور اعلیٰ معیار پر شائع کیا کہ علمی اور ادبی حلقوں میں توقعات سے کہیں بڑھ کر اس کا خیر مقدم ہوا۔ اس نمبر کی غیر معمولی مقبولیت سے اندازہ ہوا کہ علی گڑھ تحریک پر سیر حاصل جامع تصنیف کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ یہ فرض علیگڈھ والوں ہی پر عائد ہوتا ہے اور ہمیں یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہے کہ نسیم قریشی صاحب بہت جلد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی نگرانی میں "علی گڑھ نمبر" کو مناسب ترمیم و اضافے کے ساتھ ایک جامع تصنیف کی صورت میں پیش کرنے کے لئے کام شروع کر رہے ہیں امید ہے کہ یونیورسٹی فراخ حوصلگی کے ساتھ اعلیٰ پیمانے پر اس تصنیف کی اشاعت کا اہتمام کرے گی۔

ہمیں اس کا بخوبی احساس ہے کہ اس شمارے کی تیاری بہت عجلت میں ہوئی ہے۔ اور ہم جس پیمانے پر اس کام کو انجام دینا چاہتے تھے اس میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکے ہیں پھر بھی ہمیں مسرت ہے کہ ہم نے

اپنے بزرگوں کی عنایت اور دوستوں کی مدد سے اس کام کو جس طرح انجام دیا ہے وہ غالباً نگاہ پذیرائی کا مستحق ہی قرار پائے گا۔ اس شمارے کی تیاری میں جن بزرگوں اور دوستوں نے ہماری قلمی اعانت کی ہے ان کا شکریہ سب سے پہلے ہم اپنے اوپر واجب سمجھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کے ساتھ ساتھ جن کے مضامین اور نظمیں اس شمارے میں شائع ہو رہی ہیں ہم خصوصی طور پر بیرون علیگڈھ کے کرم فرماؤں، حضرت نیاز فتحپوری، نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی، پروفیسر سید احتشام حسین صاحب، حضرت میکش اکبرآبادی اور محترمہ صالحہ عابد حسین کے ممنون کرم ہیں کہ ان کی قلمی اعانت نے ہمارے خواب کو عملی تعبیر دی۔

ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ ہمیں یہ کام پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کی نگرانی میں انجام دینے کا موقع ملا۔ موصوف نے بڑی شفقت و عنایت سے ہماری رہنمائی کی اور ان کی نگہ توجہ کا یہ فیضان ہے کہ ہم یہ کام انجام دے سکے۔ میگزین کے منیجر سید ظہیر الدین صاحب علوی نے فراخ دلی سے تمام ممکنہ سہولتیں فراہم کر کے اس شمارے کی اشاعت میں ہماری جو مدد فرمائی ہے اس کا اعتراف ہمارا خوشگوار فریضہ ہے ہمیں دلی مسرت ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے کرم و عنایت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ موصوف کی ہمت افزائی اور بیش قیمت مشوروں سے ہمیں جو فائدہ ہوا اس کے لئے ہم تہ دل سے ان کے ممنون کرم ہیں۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ہم اپنے محترم نسیم قریشی صاحب کی اعانت و عنایت کا دلی اعتراف نہ کریں نسیم صاحب کی ہمہ وقتی حوصلہ افزائی، قیمتی مشوروں اور امداد و تعاون کے بغیر غالباً ہم یہ کام اتنی کم مدت میں خوش اسلوبی کے ساتھ انجام نہ دے سکتے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہمارے رفقائے ادارہ نے بڑی جوش و مستعدی سے اس کام کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا اور اس شمارے کی کامیابی کے لئے ہر طرح کوشش کی۔ آخر میں ہم سید انصار حسین صاحب منیجر سرفراز پریس لکھنؤ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے بڑے خلوص و مستعدی سے اپنی ذمہ داریوں کا بار اٹھایا اور بالکل صحیح وقت پر اس شمارہ کی اشاعت کرادی۔

اس احساس کے ساتھ کہ ہمارے ذوق خدمت کی ارباب نظر بہ خیال حوصلہ افزائی پذیرائی فرمائیں گے ہم یہ شمارہ ان کی جناب میں پیش کرتے ہیں۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار خوشۂ نارستہ در رگ تاک است

(عرفی)

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی

میں

سید حسین ادارۂ تحقیق کا قیام

جناب عطاء اللہ خاں صاحب درّانی (علیگ) کا گراں قدر عطیہ

جناب عطاء اللہ خاں صاحب درّانی (علیگ) نے اردو زبان و ادب کی تعمیری خدمت کے لئے ایک ایسا بیش قدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے جس کی نظیر ہندوستان کے تعلیمی اداروں کی تاریخ میں بمشکل ملے گی۔ موصوف ایم۔ اے۔ او کالج کے ممتاز اولڈ بوائے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مخلص دوست اور ہم جماعت ہیں۔ موصوف نے اپنی ذہانت حسن تدبیر اور مسلسل محنت و عمل سے تجارت میں غیر معمولی فروغ حاصل کیا ہے۔ امریکی شہریت اختیار کر لینے کے باوصف موصوف مادر درسگاہ، ہندوستان اور وطن کی زبان و تہذیبی سرمایہ سے دلی شغف رکھتے ہیں۔ مطالعۂ کلام غالب درّانی صاحب کا بڑا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اور اجنبی فضاؤں میں غالب ان کے ہمدم دیرینہ رہے ہیں۔ ان کی تمنا ہے کہ غالب کی فکری عظمت کو بطریق احسن دانشوران مغرب سے روشناس کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر موصوف نے سال گذشتہ کے وسط میں مسلم یونیورسٹی کو پچیس ہزار روپیہ کا ایک عطیہ ڈاکٹر سید حسین اردو ریسرچ چیئر کے قیام کے لئے مرحمت فرمایا۔

ے

حال ہی میں درانی صاحب دوبارہ علی گڑھ تشریف لائے اور اس علمی و تحقیقی کام کو وسیع تر پیمانہ پر منظم و مستحکم کرنے کے لئے موصوف نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر (تقریباً ساڑھے سات لاکھ روپیہ) کا ایک فنڈ سید حسین ادارۂ تحقیق کے لئے محفوظ کر دیا۔ درّانی صاحب نے اس گراں قدر عطیہ سے علی گڑھ کے نامور محب وطن فرزند ڈاکٹر سید حسین مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے جو اقدام کیا ہے، وہ اکابر علم و ادب کی نظر میں ہمیشہ قدر و احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

"سید حسین اردو ریسرچ چیئر" پر ملک کے مشہور ادیب و نقاد جناب آل احمد صاحب سرور بحیثیت پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ موصوف نے یکم دسمبر ۱۹۵۵ء سے اپنے نئے عہدہ کا چارج لیا ہے اور آج کل ادارہ کی تنظیم کے ساتھ ساتھ غالب کے مذاق شعر اور فکر و فن کو مغربی دنیا سے روشناس کرنے کے لئے مواد کی فراہمی اور غالب کے منتخب اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پروفیسر سرور کے ساتھ مسٹر نسیم قریشی مرتب "علی گڑھ نمبر" بحیثیت فیلو کام کر رہے ہیں۔ نسیم قریشی صاحب کے تحقیقی کام کا عنوان ہے "منشی نول کشور اور ان کا عہد" (مجوزہ درّانی صاحب) اور وہ سرور صاحب کی رہبری میں منشی نول کشور کی خدمات زبان و ادب اور نول کشور پریس کی تاریخ اور مطبوعات کے متعلق ایک مفصل جامع تصنیف کی تیاری میں مشغول ہیں۔

امید ہے یہ ادارہ بہت جلد اکابر علم و ادب کے حلقہ میں ممتاز مقام حاصل کرلے گا۔ اور علی گڑھ بحسن و خوبی ان بلند توقعات کو پورا کر سکے گا جو اردو دنیا نے جائز طور پر اس سے وابستہ کی ہیں۔

ادارہ

حصّہ اوّل

مجاز

شخصیت، فکر، فن

"مجاز کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے ' اداسی نہیں ، سرخوشی ہے۔ مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں للکارتے ہیں سینہ کوٹتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے ان کے ذہن میں آمد انقلاب کا تصور طوفانِ برق و رعد سے مرکب ہے نغمہ ہزار اور رنگینی بہار سے عبارت نہیں ۔ وہ صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں اس کے حسن کو نہیں پہچانتے"

فیض احمد فیض

مجاز ـــ رومانیت کا شہید

پروفیسر آل احمد سرور

اپنے ہم عصروں میں جو مقبولیت مجاز کو حاصل ہوئی وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ مجاز نے تقریباً پچیس سال شاعری کی۔ اس طویل عرصے کو دیکھتے ہوئے اُن کا مجموعۂ کلام بہت مختصر ہے۔ اُن کی بہترین نظمیں بیشتر ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان کی ہیں۔ اِدھر چار پانچ سال میں اُنھوں نے مشکل سے کچھ کہا ہوگا۔ خود کہتے تھے کہ شعر کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ اتنا کم سرمایہ لے کر بہت کم لوگ بقائے دوام کے دربار میں داخل ہوئے ہوں گے۔

مجاز کو نہ تو علم و فضل میں کوئی کمال حاصل رہا، نہ انھوں نے کسی بڑی تحریک سے عملی دلچسپی لی۔ ذہنی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے مگر اس قید میں انھوں نے خاصی آزادی روا رکھی۔ مجاز نہ غیر معمولی طالب علم تھے، نہ دنیوی اعتبار سے کامیاب ثابت ہوئے۔ آنے والی نسلوں کو شاید اس بات پر حیرت ہو کہ مجاز اپنے زمانے میں کیوں اس قدر محبوب تھے۔ شراب نے مجاز کو کہیں کا نہ رکھا۔ ریاض نے تو رسمی طور پر خمریات کا یہ شعر کہا تھا ؂

اچھی پی لی خراب پی لی   جیسی پائی شراب پی لی

مگر مجاز نے اس پر برابر عمل کیا۔ اسی کی وجہ سے اُن کی صحت خراب ہوئی۔ اسی نے اُن کو دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا۔ اسی نے بالآخر اُن کی جان لی۔ مرنے کے پانچ مہینے پہلے مجاز میرے ساتھ کشمیر میں تھے۔ کشمیر کے دلکش مناظر کو دیکھ کر وہ شخص بھی جو جمالیاتی ذوق سے بالکل عاری ہو، کچھ دیر کے لئے شاعر بن جاتا ہے۔ مجاز ان سے بھی یونہی گزر گئے۔ کبھی کبھار اُن کی فطری زندہ دلی عود کر آتی تھی اور بس۔ مگر مجاز کی محبوبیت اور مقبولیت، ان سب باتوں کے باوجود کسی وقت ماند نہیں ہوئی۔ مجاز کی حالت پر افسوس

ہوتا تھا، دل کڑھتا تھا، کبھی کبھی جھنجلاہٹ بھی ہوتی تھی، مگر اُن پر غصہ کبھی نہیں آیا۔ آ ہی نہیں سکتا تھا۔

مجاز مرنے کے وقت پینتالیس چھیالیس سال کے تھے۔ میں انھیں سنہ ۱۹۲۹ء سے جانتا تھا جب وہ اور جذبی جو اُس وقت ملال تخلص کرتے تھے فرسٹ ایر سائنس میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخل ہوئے۔ میں اُن سے ایک سال آگے تھا۔ کالج کے مشاعروں میں دونوں شریک ہوتے تھے۔ غالباً سنہ ۱۹۳۱ء میں مجاز کو ایک انعامی مقابلے میں پہلا انعام بھی ملا تھا۔ مجاز کو اُس زمانے میں ٹینس سے خاص دلچسپی تھی اور سکنڈ ڈینٹ کے ممبر ہوگئے تھے۔ فانی اور میکش اکبرآبادی سے اُسی زمانے میں اُن کا ربط ضبط بڑھا۔ فانی نے اُن کی چند غزلوں پر اصلاح بھی دی تھی۔ اُس کے بعد انھوں نے اپنے ذوق ہی کو رہبر بنایا۔ میں جب سنہ ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے کرنے علی گڑھ آیا تو مجاز یہاں سال بھر سے موجود تھے۔ سائنس اُن سے نہ چلی اس لئے اُنھوں نے آرٹس میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کرلیا۔ انگریزی اور فلسفہ کے علاوہ ایک مضمون اور لیا تھا جو اِس وقت ذہن میں نہیں۔ اس زمانے میں اُن کا زیادہ وقت، دوستوں کے کمروں پر گزرتا تھا۔ ان میں جاں نثار اختر، اختر امام اور حامد جو ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے، یاد آتے ہیں۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء میں انجمن حدیقۃ الشعر کا سالانہ مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر نے کی تھی اور جس میں مولانا حسرت، اصغر گونڈوی اور حفیظ جالندھری بھی شریک ہوئے تھے۔ طلباء کے لئے اس میں نظم کا ایک عنوان 'صبح بہار' رکھا گیا تھا۔ مجاز کی نظم پر شروع میں حسب معمول ہوٹنگ ہوئی مگر بعد میں اس کی رنگینی اور دلکشی اور پڑھنے والے کے پرسوز ترنم نے داد بھی حاصل کی تھی۔ یہ مجاز کا علی گڑھ سے پہلا تعارف تھا۔

جاں نثار اختر سے سب سے پہلے مجھے مجاز نے ہی ملایا تھا۔ علی گڑھ میگزین کی ادارت کے لئے اس کے نگراں خواجہ منظور حسین صاحب سے اُنھوں نے ہی ملنے پر زور دیا تھا۔ میری ادارت کے زمانے میں مجاز کی نظم 'نمائش' ایک غزل اور 'انقلاب' اِسی میگزین میں چھپیں۔

اُس زمانے میں بھی مجاز ایک مخلص دوست اور ایک زندہ دل رفیق کی حیثیت سے ممتاز تھے۔ نوجوان طلبا کا محبوب مشغلہ اسٹیشن کی سیر، یا نمائش کے زمانے میں نمائش کے چکر تھے۔ گھنٹوں لوگ اِدھر سے اُدھر ٹہلتے تھے۔ خریداری سے کوئی مطلب نہ تھا ذوق نظر کی تسکین کافی تھی۔ "نمایش" اس زمانے کے تند و تیز اور والہانہ جذبات کی یادگار رہے۔

اِسی زمانے میں علی گڑھ میں نئے خیالات کی رد شروع ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف یورپ سے واپس

آ گئے تھے۔ اختر رائے پوری بی۔ اے کرنے کے لئے آفتاب ہوسٹل میں مقیم تھے۔ وہیں سبط حسن بھی تھے۔ اختر رائے پوری نے اپنا مضمون "ادب اور زندگی" اسی زمانے میں لکھا تھا جب وہ رشید صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ سبط حسن کے بعض ترجمے اور حیات اللہ انصاری کی کہانیاں بھی میں نے علی گڈھ میگزین میں شایع کی تھیں۔ سجاد ظہیر آکسفورڈ میں ایک طویل عرصے تک قیام کرنے کے بعد علی گڈھ بھی آئے تھے۔ "انگارے" شایع ہوتے ہی ضبط ہو چکی تھی۔ میں نے میگزین میں اُس پر سخت تنقید کی۔ خواجہ منظور حسین صاحب نگراں تھے۔ وہ انگارے کو بعض ادبی تجربات کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ میرا مضمون اُنھیں پسند نہ آیا مگر اُنھوں نے اس پر احتساب نہ کیا۔ یہ باتیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ نئے خیالات کی اس رَو کا اثر مجاز پر بھی ہوا اور "نمائش" اور "صبح بہار" کا لکھنے والا "انقلاب" کا نقیب بن گیا۔

جب ۱۹۳۵ میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام وجود میں آیا تو ایک انگریز فیلڈن کا تقرر بحیثیت ڈائرکٹر ہوا۔ یہ بڑا غیر معمولی آدمی تھا۔ سرکاری اور دفتری نظام سے سخت بیزار اور اہلِ علم کا بڑا قدر داں۔ ایک دفعہ لاہور میں تھا۔ صوبے کے گورنر سے مل چکا تھا اور اقبال سے ملنے جا رہا تھا۔ اپنے ایک ملاقاتی سے کہنے لگا کہ میں لاہور کے سب سے چھوٹے آدمی سے مل کر آ رہا ہوں اور سب سے بڑے آدمی سے ملنے جا رہا ہوں۔ اس نے ریڈیو میں تقریرات کرنے کے لئے رشید احمد صدیقی صاحب کو علی گڈھ سے اور پروفیسر بخاری کو لاہور سے بلایا۔ ابتدائی تقرریات میں زیڈ۔ اے۔ بخاری، آغا اشرف اور مجاز لئے گئے۔ مجاز کے سپرد ریڈیو کے رسالے "آواز" کی ادارت ہوئی۔

پروفیسر بخاری کچھ عرصے بعد فیلڈن کے نائب کی حیثیت سے دہلی آ گئے۔ اُن میں اور دہلی والوں میں چشمک شروع ہوئی۔ آغا اشرف نے مجاز کو ملا لیا۔ آغا اشرف کا تو کچھ نہ بگڑا۔ بخاری نے اُن کا تنزل کر دیا۔ مجاز کو علیحدہ کر دیا گیا۔ رشید صاحب نے بخاری کو سمجھایا مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ اسی زمانے میں مجاز ادبی حلقوں میں خاصے مقبول ہو چکے تھے۔ وہ طبعاً سازشی آدمی نہ تھے مگر اُنھیں یہ غلط فہمی ہو چکی تھی کہ ادبی اہمیت کی بنا پر ملازمت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اشرف صاف نکل گئے، غریب مجاز اپنی سادہ لوحی کا شکار ہو گیا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں علی گڈھ میں ایک اُردو کانفرنس ہوئی۔ مولوی عبدالحق صاحب انجمن کا دفتر دہلی منتقل کرنا چاہتے تھے اور انجمن کے کام کو پھیلانا اور بڑھانا چاہتے تھے۔ یہ بڑا شاندار اجتماع تھا۔ مجھے

اچھی طرح یاد ہے کہ مجاز آئے تو دہلی کی ملازمت ختم ہو چکی تھی۔ استفسارِ حال پر انھوں نے اقبال کا یہ شعر پڑھا ؎

اگر لٹ گیا اک نشیمن تو کیا غم   مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

اسی کانفرنس کے دوران میں یونین میں معزز مہمانوں کا خیر مقدم تھا۔ پنڈت کیفی نے اُردو ہماری زبان کے نام سے ایک مقالہ پڑھا۔ پنڈت کیفی کی آواز پست تھی۔ مایک کا رواج اُس وقت تک نہ تھا۔ ہال میں خوب شور رہا۔ غرض جوں توں کر کے مقالہ ختم ہوا تو صدر نے اعلان کیا کہ اب اسرارالحق مجاز ایک نظم سنائیں گے۔ مجاز نے اپنی دل نشین پرسوز آواز میں "نذرِ علی گڈھ" شروع کی مجمع پر ایک بے خودی سی چھا گئی۔ لوگ جھوم جھوم اُٹھے۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے، یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے

تو ہر طرف سے بے اختیار نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ ڈایس پر ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالرحمٰن صدیقی اور مولوی عبدالحق صاحب تشریف فرما تھے ذاکر صاحب نے بے ساختہ کہا، مجاز صاحب پھر پڑھئے۔ اسی زمانے میں علی گڈھ کے اربابِ حل و عقد اولڈ بوائز پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ خلافت کے زمانے کی طرح پھر علی گڈھ کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجاز کے اس شعر میں اس کا جواب بھی تھا۔

یہ زمانہ مجاز کی شاعری کا بہترین زمانہ تھا۔ اُن کی مقبولیت اپنے شباب پر تھی عصمت چغتائی نے اس کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ مجاز میں قوتِ ارادی کی کمی شروع سے تھی۔ دوستوں کی واہ واہ، حسین خواتین کی داد، مشاعروں میں مقبولیت نے ایک نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اِسی زمانے میں شراب کا شغل بھی ہونے لگا۔ مجاز علی گڈھ سے لکھنؤ پہنچے اور کئی سال وہاں قیام رہا۔ جوش سے ربط ضبط شروع ہوا یہ اکثر جوش کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ جوش کا فرض تھا کہ مجاز کو بہکنے نہ دیتے۔ مگر قبلۂ رندانِ جہاں کو اپنی ذمہ داری کا کب احساس تھا۔ کچھ زمانہ اسی طرح گذرا۔ اب تک دل پر جو زخم آئے تھے وہ ذرا ہلکے تھے مگر دہلی میں ایک زخم ایسا کاری لگا کہ اس کی چوٹ ساری عمر نہ گئی۔ شروع میں دلنوازی اور لطف و کرم، سب کچھ تھا، مگر مجاز کچھ اس سے زیادہ چاہتے تھے۔ آخر مایوسی ہوئی مگر مجاز کی خوبی یہ تھی کہ افسردگی کے باوجود لہجے میں تلخی نہ آئی۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں جوش، سجاد ظہیر، سردار جعفری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی اور احتشام حسین کا

ساتھ رہا۔ ان میں سوائے جوش کے شاعری کسی اور کا اوڑھنا بچھونا نہ تھا۔ ان سب کا ایک سنجیدہ مقصد تھا۔ 'نیا ادب' کی ادارت میں مجاز بھی شریک تھے۔ یہ پرچہ ترقی پسند تحریک کا نقیب تھا۔ مجاز کا تعلق اس سے ذہنی زیادہ تھا عملی کم۔ پھر لکھنؤ سے اخبار 'ہندوستان' نکلا۔ اس میں 'اندھیری رات کا مسافر' اور 'سرمایہ داری' جیسی نظمیں شائع ہوئیں۔ 'ساقی' کے سالنامے میں 'آوارہ' نکلی۔ ترقی پسندوں میں اس وقت ایک باغیانہ جوش تھا۔ انقلاب کا ایک رومانی اور طفلانہ تصور تھا۔ ماضی کے شاندار سرمائے سے یکسر بغاوت تھی۔ تہذیب و اخلاق فرسودہ تصور کئے جانے لگے تھے۔ مجاز پر ان خیالات کا گہرا اثر ہوا۔ قدیم شعرا سے واقفیت اور ابتدائی تعلیم و تربیت نے اُنھیں یکسر باغی ہونے سے بچا لیا۔ نعرہ بازی اور سیاسی پروپیگنڈا اُن کے یہاں بھی ہے مگر بہت کم۔ جوش سے وہ متاثر ضرور ہیں مگر اُن کے مقلد نہیں۔ فیض نے ٹھیک کہا ہے کہ وہ انقلاب کے ڈھنڈورچی نہیں، اُس کے مغنی ہیں۔ اس دور کی سب سے اچھی نظم 'آوارہ' ہے۔ یہ ایک نسل کے درد و داغ کی کہانی ہے اس کی آرزو اور جستجو، اُس کی محرومی اور سرشاری کی علامت ہے۔ یہاں ذاتی تجربات ایک دور کی داستان بن گئے ہیں۔

۱۹۴۲ تک مجاز کی سرشاری کا دور رہا۔ اس کے بعد یہ نشہ اُترنے لگا۔ زندگی کے حقائق نے انتقام لیا۔ دوست جو شروع میں دل کھول کر پذیرائی کرتے تھے، کچھ کنی کاٹنے لگے۔ مجاز اب ایک طفیلی تھے اور شاعری سے بہرحال ذہن کی آگ بجھے تو بجھے پیٹ کی آگ تو نہیں بجھتی۔ چنانچہ تنگ آکر نوکری کی جستجو کی۔ بالآخر ہارڈنگ لائبریری دہلی میں ایک جگہ مل گئی۔ ایک طرف مشاعروں کی مقبولیت اور اونچے سے اونچے گھرانوں کی واہ واہ تھی، دوسری طرف ایک کلرک کی زندگی کے مصائب۔ مجاز بیچارے کا کیا قصور۔ بیک وقت آسمان پر پرواز اور وہاں سے فوراً دھرتی پر پٹخ دیا جانا، پھر آسمان کی سیر اور پھر سنگلاخ حقائق کا بوجھ، ایک نازک طبع، کمزور دل کا نوجوان جس کے دل پر کتنے ہی زخم تھے اور جس کی جیب خالی تھی، مگر جو تہذیب اور شرافت کے ایک معیار کو فراموش نہ کرسکتا تھا، کیسے برداشت کرتا۔ چنانچہ خلل دماغ شروع ہوا۔ باتیں اور بے تکان باتیں کرنے کا مرض پیدا ہوگیا۔ ان میں کچھ اپنی تعریف تھی، کچھ لطیفے تھے، کچھ شعر و ادب پر اُلٹی سیدھی باتیں تھیں۔ بارے نینی تال کے قیام سے طبیعت کچھ سنبھلی۔ طبیعت میں ایک ٹھیراؤ پیدا ہوا۔ یہ فکر ہوئی کہ روٹی تو کسی طرح کما کھائے بھنڈرہ۔ چنانچہ بمبئی کا رخ کیا۔ فلمی گانوں سے بہت سے شعرا اچھا خاصا کما لیتے تھے، مگر مجاز اس دنیا کی کاروباری

زندگی اور زمانہ سازی کے لئے نہ بنے تھے۔ چنانچہ وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایسے عالم میں شراب ایک پناہ بن گئی۔ اب مجاز بالکل رندِ خراباتی بن گئے۔ مشاعروں میں آتے تو اکثر بدمست ہوتے۔ جو لوگ شعر سننے آتے تھے اُنھیں بدمستی کے مظاہرے بھی سہنے پڑتے مگر وہ طبعاً اتنے مخلص، نیک، محبت کرنے والے اور وضعدار تھے کہ اُن کی بدمستی سے اُنھیں کو نقصان پہنچا اُنھوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔

۱۹۳۶ء میں مجاز علی گڑھ سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ میں ۱۹۴۵ء تک علی گڑھ میں رہا۔ ڈیڑھ سال کے لئے رام پور گیا تھا۔ وہاں سے ۱۹۴۶ء کے وسط میں لکھنؤ پہنچا۔ اتنے عرصے میں مجاز سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد لکھنؤ میں اکثر ملاقات ہوتی۔ وہ کافی ہاؤس خاص پابندی سے آتے تھے۔ میں کبھی کبھار پہنچتا۔ یونیورسٹی کے ادبی جلسوں میں طلبا مجاز کو بڑے شوق سے بلاتے اور وہ ان کی دعوت کو کبھی رد نہ کرتے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اُن کا اثر مجاز پر بھی ہوا۔ انھوں نے نہ تو آزادی کو ہر خواب کی تعبیر سمجھا اور نہ اسے جھوٹی آزادی قرار دیا۔ جشنِ آزادی میں کہتے ہیں ؎

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں　　یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں　　ابھی وہ سعیِ جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغازِ کارِ مرداں ہے

وہ بڑے درد سے پوچھتے ہیں

سبزۂ و برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا　　سارا چمن اُداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا

مگر اب مجاز بہت کم کہنے لگے تھے۔ شراب نے ان کی صحت تباہ کر رکھی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ اپنی غنودگی سے کچھ چونکے اور 'فکر' جیسی نظم اور "جنونِ عشق اب بھی کم نہیں ہے" جیسی غزل کہی۔ اس کے بعد وہ خاصے سنبھلے ہوئے تھے۔ اُنھیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ کوئی سنجیدہ کام کرنا چاہیئے۔ اردو میں ایم۔ اے کرنے کا ارادہ تھا۔ ان کے سارے احباب کو مسرت تھی کہ اب مجاز راہِ اعتدال پر آ رہے ہیں۔ مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ اجمیر اور دہلی کے مشاعروں میں شرکت کے بعد اور وہاں کی رنگین محفلوں میں شرکت کے بعد ان کا دماغی توازن بگڑ گیا اور اُنھیں اُن کے اعزا نے رانچی پہنچا دیا۔

رانچی میں تقریباً چھ مہینے رہنے کے بعد وہ آئے تو بالکل ٹھیک تھے۔ سہیل عظیم آبادی اُن کے ساتھ تھے۔ مجھ سے ملنے آئے تو کہنے لگے 'سرور صاحب ابکی رانچی میں میں نے ایک ریسرچ کی ہے۔ شراب

نشہ نہیں ہوتا، آدمی پاگل ہوجاتا ہے۔" شراب بالکل چھوڑ دی تھی۔ اُن کے غیر ذمہ دار دوست اصرار بھی کرتے تو معذرت کر دیتے تھے۔ اسی زمانے میں اُن کی بہن صفیہ کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ مجاز پر اس کا بہت اثر ہوا۔ ہفتوں گھر سے باہر نہ نکلے۔ صفیہ کے بچوں کا دل بہلاتے رہتے تھے مگر چند مہینے کے بعد پھر شراب کی کشش غالب آئی اور اب کی وہ اس میں بالکل غرق ہو گئے۔

جولائی ۱۹۵۵ء میں ریڈیو سری نگر کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے میں بھی گیا اور مجاز بھی۔ دوستوں نے مجاز کی اس طرح دیکھ بھال کی جیسے کسی بہت قیمتی اور نازک چیز کی۔ ہم لوگ انھیں گلمرگ اور سری نگر کے شاہی باغات دکھانے لے گئے۔ مجاز اتنے بجھ گئے تھے کہ ان پر کسی چیز کا اثر نہ ہوتا تھا۔ نشاط اور شالامار میں بکثرت فوارے ہیں۔ ان فواروں میں پانی اتنے زور سے چلتا ہے کہ اگر کوئی لیمو فوارے کے منہ پر رکھ دیا جائے تو کچھ دیر کے لئے پانی کے زور سے ہوا میں معلق ہو جاتا ہے۔ ایک دوست یہ کھیل کر رہے تھے کہ ایک پنجابی عورت نے کہا "اللہ دی قدرت ہے" مجاز کو اس جملے نے بہت محظوظ کیا۔ شالامار اور نشاط کے تاثرات کا حاصل مجاز کے نزدیک یہ لطیفہ تھا۔

مجاز سے آخری ملاقات نومبر کے آخری ہفتے میں ہوئی۔ میں علی گڈھ آنے والا تھا۔ ایک رخصتی دعوت میں مجاز بھی تھے۔ کہنے لگے "سرور صاحب۔ یہ بہت اچھا ہے کہ آپ علی گڈھ جا رہے ہیں۔ وہاں جو بات ہے کہیں نہیں۔ میں بھی آؤں گا۔ مجھے "نذر علی گڈھ" بھی سنانا ہے جسے یونین والوں نے اپنا ترانہ بنایا ہے۔ ذرا یہ طلبا کا اردو کنونشن ہو لے تو میں بھی علی گڈھ کا قصد کروں۔" طلبا کا کنونشن ہوا، مشاعرے میں مجاز نے بڑے جوش سے اپنا کلام سنایا اور دوسرے دن اتنی شراب پی کہ اُن کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ علی گڈھ آنے سے پہلے وہ دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ یہ ہے اُردو کے کیٹس کا المیہ۔

مجاز کی شخصیت کے متعلق بھی اپنے تاثرات بیان کردوں۔ مجاز سراپا شاعر تھا۔ خوابوں کی دنیا کا رہنے والا، زندگی کے تلخ حقائق کا علاج مجبوراً شراب میں ڈھونڈھتا تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت نے اُسے شرافت، تہذیب، حسنِ معاشرت کے کچھ معیار دئے تھے۔ طبیعت میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ ان کی خاطر یا اُن معیاروں کی خاطر جو ایک علمی و ادبی تحریک سے وابستگی کی وجہ سے اُس نے قبول کر لئے تھے، وہ ریاض کرتا۔ وہ رند تھا۔ اس میں عاشق کا ولولہ تھا، مجاہد کے کردار کی صلابت نہ تھی۔ اس کی ابتدائی تربیت نے جو نقش دل میں بٹھا دئے تھے اُنھیں وہ محو نہ کر سکا۔ نئے رنگ کا جو نشہ چڑھ گیا تھا وہ

اُتر نہ سکا۔ اس کشمکش نے اسے جہادِ زندگی میں اپنا راستہ نکالنے کے بجائے ناکامی و نامرادی کے راستے پر لگا دیا۔ مگر اُس کے کردار کی خوبی یہ ہے کہ مردم بیزار یا تلخ یا قنوطی کبھی نہیں ہوا۔ پیہم ناکامیوں کو جھیلنے یا بھلانے کی کوشش کرتا رہا۔ کبھی لطیفوں میں کبھی شراب میں۔ اُس کے دو تین لطیفے مجھ سے سُنیئے جو میرے سامنے کے ہیں۔

ایک دفعہ مجاز اور جذبی لکھنؤ میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اس دَور کے ایک مشہور شاعر ملنے آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ "سرور صاحب! سوچتا ہوں شادی کرلوں" مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا۔ میں اُنھیں شادی شدہ سمجھتا تھا۔ پھر کہنے لگے "اور سوچتا ہوں کسی بیوہ سے کروں"۔ اب تک یہ باتیں صرف میں سُن رہا تھا کیونکہ مجاز اور جذبی ایک دوسرے سے کچھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایسی مزے دار گفتگو میں دوسرے شریک نہ ہوں۔ چنانچہ میں نے مجاز کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ صاحب شادی کرنے والے ہیں اور کسی بیوہ سے کرنے کا خیال ہے" مجاز نے بے ساختہ کہا "حضرت آپ سوچئے نہیں کرلیجے۔ بیوہ تو آپ سے شادی کے بعد وہ ہو ہی جائے گی"۔

سلام مچھلی شہری کو ایک زمانے میں لمبے لمبے منظوم خط لکھنے کی دُھن تھی۔ سجاد ظہیر اور کرشن چندر کو لکھ چکے تھے۔ کافی ہاؤس میں ایک دفعہ اسی کا تذکرہ تھا۔ ایک نہایت مختصر قسم کے آدمی تھے۔ بھنیشور (BHUNESHWAR) خدا جانے اب کہاں ہیں۔ ہندی کے بہت اچھے لیکھک۔ اُردو بھی خوب جانتے تھے۔ کسی کو خاطر میں کم لاتے تھے۔ اُنھوں نے کہا سلام صاحب آپ میرے نام خط کب لکھ رہے ہیں۔ مجاز نے کہا "تمھیں اتنا لمبا خط کیا لکھیں گے، ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیں گے"۔

بقرعید کے موقع پر لکھنؤ ریڈیو سے ایک چھوٹا سا مشاعرہ تھا۔ مجاز نے عرصے سے کچھ نہ کہا تھا بشرط یہ رکھی گئی تھی کہ نئی چیز ہوگی۔ مجاز پریشان تھے۔ میں نے مشاعرے کے دن اُن سے پوچھا۔ کہو بھئی آج تو تمھاری قربانی ہے، کہنے لگے "سرور صاحب قربانی نہیں جھٹکا کہیئے"۔

آخر آخر میں مجاز کا یہ رنگ بہت ماند ہوگیا تھا مگر خاکستر میں سے کبھی کبھی چنگاریاں نکل ہی آتی تھیں۔

مجاز نے کبھی کوئی ٹولی نہیں بنائی۔ شہرت کے لئے اُس نے کوئی جال نہیں بچھایا۔ ہم عصروں میں سے ہر ایک سے اُسی کی سطح پر ملتا رہا۔ اس کے دوستوں میں ہر مشرب اور مسلک کے آدمی تھے۔

ایک کی برائی دوسرے سے کرنا اُس کا شعار نہ تھا، وہ سب کا دوست تھا۔ صرف اپنا دشمن تھا۔ ماحول نے اس کے ساتھ بے حسی اور بے رحمانہ برتی۔ مگر اس نے ماحول کی شکایت بھی نہیں کی۔ اس میں بڑا ظرف تھا۔ اُس نے کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلایا۔ نشے کے عالم کی بات دوسری ہے۔ اس عالم میں اکثر لوگ ناقابلِ برداشت ہو جاتے ہیں۔ آخر میں مجازؔ کی بھی یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ مگر نشے میں ایک دفعہ جو اس نے کیا، میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر علیم، احتشام اور میں ایک اُردو کانفرنس میں شرکت کے لئے پٹنے گئے۔ مجازؔ بھی ساتھ تھے۔ ایک ڈبے میں صرف تین برتھ خالی تھے۔ مجازؔ کو دوسرے ڈبے میں جانا پڑا۔ جلد ہی لوٹ آئے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ کہنے لگے وہاں ایک سردار جی کرپان لئے میرے منتظر تھے۔ چنانچہ میں نے شانہ بشانہ پسپائی میں ہی نجات سمجھی۔ فرش پر بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ پٹنے پہنچے تو سب ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ ایک کمرے میں، میں اور احتشام تھے۔ برابر کے کمرے میں پنڈت کیفی تھے۔ اس کے بعد کے کمرے میں مجازؔ اور جذبی تھے۔ رات کو سب سونے لیٹے ہی تھے کہ پنڈت جی کے کمرے سے شور اُٹھا۔ "ارے دوڑیو۔ بچائیو۔ یہ مارے ڈالتا ہے۔" ہم لوگ گھبرا کر دوڑے، تو دیکھا کہ مجازؔ نشے میں پنڈت جی کے پیر زور زور سے داب رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آپ بزرگ ہیں، آپ کی خدمت میں سعادت ہے۔ پنڈت جی چیخ رہے تھے کہ ہائے میں مرا، بڑی مشکل سے مجازؔ کو علیحدہ کیا۔ صبح ہوئی تو اب مجازؔ پنڈت جی کے سامنے نہیں آتے۔ آخر پنڈت جی نے بلایا۔ گلے لگایا اور کہا کہ مجازؔ تم سے اُردو شاعری کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ تمہارے خلوص سے میں بڑا متاثر ہوں مگر خلوص میں تم نے میرا کام ہی تمام کر دیا ہوتا۔ بھائی اپنے آپ کو سنبھالو۔ تمہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔" ہم سب آبدیدہ ہو گئے۔

مجازؔ کے پاس زندگی اور ادب کا ایک خاصا واضح تصور تھا۔ اس نے نہ تو مطالعے سے اسے جلا دی، نہ زندگی کی آگ میں کود کر اسے گلزار بنایا۔ وہ بڑے حسین خواب دیکھتا تھا۔ بعض بڑے حقائق کا بھی اُسے احساس تھا۔ مگر خوابوں کے اس دنیا کو جب حقائق نے چور چور کر دیا تو اس نے پلٹ کر کوئی وار نہیں کیا۔ خاموشی سے سپر ڈال دی۔ میں اسی وجہ سے اُسے رومانیت کا شہید کہتا ہوں۔

عام طور پر رومانیت کے معنی حدیثِ دلبری کے لئے جاتے ہیں۔ دراصل یہ تخیل پرستی ہے۔ یوں تو ادب زندگی کی تخیلی ترجمانی ہے مگر جب تخیل کی لے اتنی بڑھ جائے کہ حقائق یا عقل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو رومانیت کے علم سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اُردو شاعری میں رومانیت کی لے سب سے پہلے

ادب لطیف کے علمبرداروں میں ملتی ہے۔ اس کے بعد اختر شیرانی کے یہاں۔ اختر شیرانی اور مجازؔ میں خاصی مماثلت ہے۔ مگر اختر کے یہاں عنفوان شباب کے عشق کا سوز و ساز اور درد و کرب ہے۔ محبوب کی تصویر سینے سے لگا کر مرجانے کا ولولہ ہے۔ مجازؔ کی رومانیت میں انقلاب کے خواب بھی شامل ہیں۔ مجازؔ کے یہاں رومانیت کچھ تو جوش کی طرح باغیانہ ضربات کی گھن گرج میں ظاہر ہوتی ہے مگر اس میں بھی وہ اپنے آہنگ سے نہیں ہٹتے، دوسرے وہ بعض سماجی حقائق کا بھی گہرا احساس رکھتے ہیں اور انھیں شعر میں بیان کر سکتے ہیں۔ پھر مجازؔ کے لہجے میں اختر شیرانی کی سپردگی اور والہانہ پن کے ساتھ ساتھ نفتگی اور شیرینی کچھ زیادہ ہے۔ جوش کی شوکت و جلالت میں کرختگی کا احساس ہوتا ہے اور اُن کے یہاں باوجود غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے، ناہمواری بھی ہے مجازؔ کے یہاں ہم آہنگی ہے۔ جوش خلوت میں بھی بہت اونچی آواز سے باتیں کرتے ہیں لیکن مجازؔ بھری محفل میں بھی دل نشین نرمی سے اپنی بات کہہ دیتا ہے۔

دراصل مجازؔ کی شاعری پر بے لاگ تبصرہ ابھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے میں اس کی کوشش بھی نہیں کروں گا ہاں مجازؔ کی ادبی اہمیت کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی نسل میں مجازؔ کے یہاں کلاسیکل شعرا کے انداز بیان کی باوقار سادگی ملتی ہے۔ دوسرے اس کے یہاں الفاظ کی صحت اور زبان کی نرمی و نزاکت کا احساس بھی ہم عصروں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ مجازؔ نے ردولی کی فضا اور فانیؔ کی صحبت سے ایک خاموش اثر لیا ہے۔ یہ اثر اس کے یہاں بڑی خوبی سے ظاہر ہوتا ہے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ مجازؔ کے یہاں استعارے اور تشبیہات ایک خلاقانہ ذہن ظاہر کرتے ہیں۔ مجازؔ کی شروع کی نظمیں جیسے نمائش، نذر خالدہ، انقلاب اور رات اور ریل، اسی خصوصیت کی وجہ سے قابل قدر بن جاتی ہیں۔ نمائش میں ایک رنگین فضا کی مصوری ادبی صناعی کا حسن رکھتی ہے۔ انقلاب میں ذہنی بچپن ہے مگر اس کے باوجود انداز بیان میں زور اور کیفیت ہے۔ ''رات اور ریل'' حسن کاری کی اچھی مثال ہے۔ اس میں ارتقا اور سماج کے لفظ تو تعویذ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، مگر نظم میں بڑے شگفتہ اور رواں الفاظ میں ریل کی رفتار اور اس کی نت نئی فضا کو قلم بند کر لیا گیا ہے۔ ''نذر خالدہ'' بھی مجازؔ کی کامیاب نظموں میں سے ہے۔ اس میں خالدہ خانم کی پوری شخصیت کے سمندر کو مجازؔ نے ایک مصرع کے

کوزے میں بند کر لیا ہے۔

روحِ عشرت گاہِ ساحل، جانِ طوفانِ عظیم

اسی طرح 'رات اور ریل' میں یہ شعر دیکھئے :-

تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں — آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں — نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو — آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر — کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

مجاز کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نوجوانوں کے عزمِ سرفروشی، ولولۂ حیات، قلندرانہ آن بان، جرأتِ رندانہ اور شوقِ بے باک کو حسن کے غازے کے طور پر نہیں، چمنِ حیات کی حنا بندی کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ ایک طرف وہ نوجوانوں میں ایک مجاہدانہ جوش پیدا کرنا چاہتا ہے، دوسری طرف خواتین کو بھی رزم گاہِ حیات میں شرکت کی دعوت دیتا ہے وہ نوجوان سے کہتا ہے ؎

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ — نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر — اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر — جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

نوجوان خاتون سے کہتا ہے ؎

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے — تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پردہ اور عصمت میں ارشاد ہوتا ہے

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے — جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے مشیت نہیں ہے — کوئی اور شئے ہے یہ عصمت نہیں ہے
قسم شوخیٔ عشق سنجوگتا کی — قسم جون کے عزمِ صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی، قسم خالدہ کی — کوئی اور شئے ہے یہ عصمت نہیں ہے

مجاز دراصل پرستارِ حسن ہے۔ یوں تو وہ لیلائے انقلاب کا بھی مجنوں ہے مگر حسن کی ہر ادا کا

دمزشناس ہے ۔ اس کی پرستش میں عاشق کا جذب وجنون ہے ۔ حسن اُس کے لئے سب کچھ ہے ۔ اُس نے حسن کو ہر عالم میں دیکھا ۔ ڈھونڈھا اور چاہا اور پایا ہے ۔ اس بصیرت نے اس کے اشعار میں ایک سرمستی اور کیفیت بھر دی ہے ۔ الفاظ میں جادو پیدا کر دیا ہے ، اور اشعار کو پگھلا ہوا لاوا بنا دیا ہے ۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی خاموشی محبوب میں اک سیلِ معانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزہ جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

وہ اک مرمریں حورِ خلدِ بریں کی وہ تعبیر آذر کے خوابِ حسیں کی
وہ تسکین دل تھی ، سکونِ نظر تھی نگارِ شفق تھی ، جمالِ سحر تھی

بہار کے قرب بصد شان احتیاط دلداریٔ نسیم بہاراں لئے ہوئے
رخسار پر لطیف سی اک موجِ سرخوشی لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے

لبِ گلرنگ وحسیں ، جسم گداز وسیمیں شوخیٔ برق لئے لرزشِ سیماب لئے
نرم صوفے گود میں فردوس رعنائی لئے زلف کے خم مرمریں شانوں کی برنائی لئے
قہقہے جن میں صبا کا راگ سیاروں کے گیت نقرئی نے کی صدا جنت کے مہ پاروں کے گیت
بام و در پر اک تبسم تھا فضا گلرنگ تھی جنبش مژگاں دھڑکتے دل سے ہم آہنگ تھی

میرے نزدیک مجازؔ کی بہترین نظمیں 'آوارہ' ، 'خواب سحر' اور 'نذر علی گڑھ' ہیں ۔ 'آوارہ' میں رومانیت کی پوری داستان درد آگئی ہے اور اس داستان میں ایک پوری نسل کے افسانہ فسوں کا المیہ ہے مناظر کا حسن دل میں یوں چٹکیاں لیتا ہے ؎

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں
پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اُٹھی ، چوٹ سی دل پر پڑی اے غم دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

اِس آگ کا بھڑکنا دیکھئے ۔

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

"خوابِ سحر" میں حیرت انگیز سادگی کے ساتھ اپنی بات کہی ہے ؎

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ جاتا تھا اُدھر دیکھا تو ہے

"نذرِ علی گڑھ" میں حیرت انگیز حسن اور سحر کاری کے ساتھ ایک تعلیمی ادارے کی تہذیبی عظمت کا ترانہ گایا ہے ۔

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات اُبلتی ہے
ہر شام ہے شامِ مصر یہاں ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
آ آ کے ہزاروں بار۔ یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
جو ابر یہاں سے اُٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

مجاز کی نظموں کے مقابلے میں اس کی غزلوں کی اہمیت کم ہے، مگر ان میں بھی ہمیں شوق کی بے باکی، جنون کی بلند حوصلگی، جذبے کی مصوری، درد کی داستان، غرض بہت کچھ ملتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

دل دھڑک اُٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ پر — اب قدم منزلِ جاناں سے بہت دور نہیں
کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے — اُلجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم
بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی — بارہا مستی میں لب پر اُن کا نام آ ہی گیا
شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا — عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا
واعظ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں — اِس دنیا میں کیا رکھا ہے اُس دنیا میں کیا ہوگا

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے — مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے
بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا — تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں — ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے
بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث — مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے
یہ بجلی چمکتی ہے کیوں دمبدم — چمن میں کوئی آشیانہ بھی ہے
زمانے سے آگے تو بڑھیے مجاز — زمانے کو آگے بڑھانا بھی ہے

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا، مجاز کی شاعری پر بے لاگ تبصرہ تو ابھی ممکن نہیں ہے، مگر اُس کی شخصیت اور شاعری کے متعلق جو نقش دلوں میں بیٹھ گئے ہیں اُن کی کچھ عکاسی تو کی جا سکتی ہے۔ مجاز کی زندگی اور شاعری میں، رومانیت کی ندی کی ہر لہر ملتی ہے۔ "طفلی کے خواب" سے "اعتراف" تک ایک خاصی مربوط داستان ہے۔ مجاز کی رومانیت میں جو جاندار، صحت مند اور باشعور حصہ ہے اُس کی قدر و قیمت مستقل ہے، لیکن اس کی پوری شاعری بھی ہمارے لئے بصیرت و عبرت کا سامان رکھتی ہے۔ وہ ایک شہاب ثاقب کی طرح ہمارے ادبی اُفق پر رونما ہوا تھا۔ اُس کی روشنی بڑی نظر نواز تھی۔ دیکھتے دیکھتے مستی داد، طبیعت کی کمزوری اور خوابوں کی موجودہ پست اور کاروباری دنیا میں کوئی قیمت نہ ہونے کی وجہ سے اس شعلے کو زمانے کی نظر کھا گئی۔ مگر اس نے ہمیں درد و داغ، آرزو اور جستجو کا جو خزانہ دیا ہے اس سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

مجاز ـــــ فکر و فن کے چند پہلو

سید احتشام حسین

شاعری کس حد تک وقت کے تقاضوں سے بے نیاز، ماحول سے بیگانہ، گرد و پیش سے بے تعلق، کسی مخصوص نقطۂ نظر سے ماوراء اور ازلی اور مثالی تصورات کی حامل ہو سکتی ہے، اس کے متعلق ہمیشہ سے بحث ہوتی آئی ہے۔ یہ خیالات صحیح ہوں یا غلط، کوئی درمیانی راستہ رکھتے ہوں، نفسِ شاعری کے متعلق ان کی حیثیت بنیادی سوالات کی ہو یا بالکل ناقابلِ اعتنا ہوں، اس وقت اپنے فلسفیانہ اور نظریاتی مفہوم میں میرے پیشِ نظر نہیں ہیں۔ جس نے بھی مجاز کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات بغیر کسی بحث کے تسلیم کرتا ہے کہ اُن کے فن میں روحِ عصر جلوہ گر ہے، اُن کے تجربوں میں بیسویں صدی کے حساس نوجوان کے تجربوں کی جھلک ہے، اُن کے موضوعات میں تصوریت اور مثالیت کے مقابلہ میں عمومیت، ارضیت اور اصلیت کی فراوانی ہے اور ان باتوں کو نظر انداز کر کے اُن کے فن یا خیالات کا مطالعہ بے سود اور غیر حقیقی ہوگا۔

یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ شاعری کی دنیا میں انفرادی تجربوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن کیا یہ تجربے اپنی نوعیت اور حقیقت کے لحاظ سے اُسی عہد کے تمام دوسرے انسانوں کے تجربوں سے مختلف ہو سکتے ہیں؟ کیا ان انفرادی تجربوں کو کسی عمومی نظامِ فلسفہ میں منضبط نہیں کیا جا سکتا؟ کیا محض کیف و کم کا اختلاف ہر شاعر سے ایک بالکل نجی اور ذاتی فلسفہ یا اپنی دنیا کی تخلیق کرا سکتا ہے؟ ان اہم سوالات نے ادب و شعر کے فلسفیوں، نفسیات کے عالموں اور نقادوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ انفرادی تجربہ اور عمومی فلسفہ میں کتنا تضاد ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔

اس سے صرف مجاز کی نہیں ہر ایسے شاعر کے سمجھنے میں آسانی ہوگی جس نے اپنی شاعری کو معمہ اور چیستان بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مجاز نے ایک جگہ فخریہ انداز میں اپنے لئے "شاعر بیدار" کا لفظ استعمال کیا ہے، بیداری محض داخلی کیفیت نہیں ہے اپنے اندر ایک خارجی وصعت رکھتی ہے، بیداری فرد اور اس کے ماحول کے درمیان رشتہ اور رابطہ کا نام ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ رشتہ زیادہ تر جذباتی ہوگا (کیونکہ شاعر حقائق کو جذبات کا لباس پہنا کر پیش کرتا ہے) لیکن ان جذبات کی جڑیں احساس محض اور خیالِ محض میں نہیں ہو سکتیں، یہ جذبات انفرادی ہوتے ہوئے بھی عمومی، آفاقی اور سماجی ہوتے ہیں۔ انفرادی تجربوں کا اظہار، شاعرانہ اظہار، اس اظہار کے ذریعہ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے یا اپنے آپ کو پا لینے کی خواہش کچھ ایسی بیجا بات نہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنے آپ کو بھرپور انداز میں دیکھنا اور سمجھنا بھی بعض سماجی رابطوں اور معیاروں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ فرد جن سماجی رشتوں میں جکڑا ہوا ہے وہ حقیقی ہیں، اس کا سماج سے تعلق کیا ہے اس کے مختلف مدارج اور مختلف نوعیتیں ہو سکتی ہیں۔ اس سے آزادی ممکن نہیں ہے۔ یہ "یار" سے غالب کی چھیڑ چلی جانے والی بات ہے، لطف نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔

چونکہ یہ مسئلہ اہم ہے اور بعض لوگوں کی چڑ بن گیا ہے اس لئے اسے ایک اور طرح سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے کسی کو چڑھانا مقصود نہیں ہے، شاعری میں فکر و فن کے امتزاج کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ مشکل ہی سے کوئی شاعر ہوگا جسے سماج کے ہر طبقے، ہر ادارے، ہر عزم اور عمل سے مکمل اتفاق یا سرتاسر اختلاف ہو۔ جزوی اتفاق یا اختلاف کے اخلاقی، سیاسی، ذہنی یا جذباتی وجوہ ہو سکتے ہیں اور جب تک ہم اسے تسلیم نہیں کر لیتے کہ شاعر کے پاس کوئی اخلاقی، سیاسی یا ذہنی نظریہ ہو ہی نہیں سکتا اس وقت تک ہم اس کے مطالعہ میں ان پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر کے پاس مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور فلسفیانہ عقائد ہوتے تو ہیں لیکن شاعری میں ان کی جستجو فضول ہے بہ حالہ قدیم شعراء اپنے ان عقائد سے بلند ہو کر شاعری کرتے تھے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ طرزِ اظہار، حسنِ بیان اور انتخاب الفاظ کے پردے میں وہ ان جذبات کا اظہار کرتا ہے جو اس کے عملی یا ذہنی تجربے

وجود میں آتے ہیں۔ ان کی صداقت کی کسوٹی کسی دوسرے شخص کے لئے کیا ہو سکتی ہے، اس کا جواب بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ماضی کے متعلق اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ قدیم شعرا بھی اخلاقی، جذباتی یا روحانی کشمکش میں مبتلا ہوتے تھے اور اپنے ڈھنگ سے اس کا اظہار کرتے تھے۔ کم سے کم دنیا کے اہم ترین شعرا کے لئے یہی درست ہے۔ اُن کے خیالات، موضوعات اور جذبات کی کوئی نہ کوئی سمت ہے' اس لئے اگر چند شاعر، ادیب یا نقاد یہ کہتے ہیں کہ شاعر کی انفرادیت سماج اور زندگی کے ہر عمل سے آزاد ہے تو انھیں اِس بات کو ثابت کرنا ہوگا۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ شاعر کے انفرادی تجربہ اور عمومی فلسفہ میں تضاد امر لازم نہیں ہے، اگر اتفاق یا اختلاف ہوگا تو اُس کے بھی سمجھ میں آنے والے اسباب ہوں گے۔

اِن خیالات کی روشنی میں مجازؔ کی شاعری ایک مخصوص مفہوم اختیار کرلے گی، انفرادی تجربے عام زندگی سے ہم آہنگ ہوکر وسعت اختیار کرلیں گے، ذاتی خیالات اور تاثرات آفاقی حقیقتوں کا جزو بن جائیں گے اور اِس نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہوگی کہ ان کی شاعری محض چند عقائد کو شاعرانہ لباس اور زیور سے آراستہ کردینے کا نام نہیں ہے بلکہ "خونِ دل" ہے جو "چمن بندیِ دوراں" کی نذر کیا جارہا ہے۔

مجازؔ نے جب باقاعدہ شاعری شروع کی اُس وقت ہندوستان کی زندگی تیز رفتاری سے بدل رہی تھی، یہ کچھ اثرات قبول کرنے اور کچھ روایات کے چھوڑنے، اپنے عزم و عمل کی تنقید کرنے، حوصلوں کی نئی آگ میں جلنے اور انفرادی اور اجتماعی آسودگی کی پیچیدہ اور بے کنار جدوجہد میں شریک ہونے کا زمانہ تھا۔ مشرق اور مغرب، نئے اور پرانے کی کشمکش کسی حد تک ختم ہوچکی تھی یا کم سے کم اس کشمکش کی نوعیت اپنے طبقاتی تعلق یا ذوق اور مطالعہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لئے واضح ہوگئی تھی، سیاست میں قومی بیداری اور معاشی کشاکش کی منزلیں نمایاں تھیں اور اُردو شعر و ادب کی دنیا ان حقائق سے بیگانہ نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے شعرا نے وقت کی آواز پر کان دینا شروع کردیا تھا اور بغیر جھجک کے ادب اور شاعری کو مقصد کے تابع ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ ادب سے زندگی کے اِس نئے تعلق کا اثر اسلوب اور طرزِ اظہار پر بھی پڑا اور اس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ چنانچہ جب ہم اُس ادبی روایت کی تاریخ دیکھنا چاہیں گے، جس سے مجازؔ کی شاعری کا تعلق تھا تو ہمیں ایک طرف حالیؔ، آزادؔ، شبلیؔ

اقبالؔ، چکبستؔ، سرورؔ جہان آبادی، حفیظؔ، جوشؔ، اختر شیرانیؔ کو سمجھنا ہوگا دوسری طرف اس نئی غزل گوئی کو جس کی نمائندگی حالیؔ، شادؔ عظیم آبادی، حسرتؔ، فانیؔ، صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کر رہے تھے۔ ان تمام شعراء کا شعور کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے عہد کے خیالات اور جذبات سے متاثر تھا، روایت کا تسلسل ٹوٹا نہیں تھا لیکن ان شعراء کے یہاں چند روایات کی صدائے بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجازؔ کو زندگی اور شاعری کا یہی ورثہ ملا جس میں اُن کے انفرادی تجربوں، وقت کے تقاضوں، ذہنی صلاحیتوں اور فنی بصیرتوں نے اضافہ کیا۔

مجاز کی ابتدائی شاعری، جسے مشقِ سخن کی منزلِ اوّلین کہہ سکتے ہیں، ہمارے سامنے نہیں ہے۔ معلوم نہیں انھیں لکھنؤ کے ماحول سے فن کے ایک مبہم سے تصور سے سوا اور کیا ملا۔ لکھنؤ میں وہ عمر کی اُس منزل میں بھی نہیں پہنچے تھے جہاں گہری سوجھ بوجھ کی توقع کی جا سکے لیکن جب وہ آگرہ پہنچے تو وہاں انھیں ایک بہتر ادبی ماحول ملا جہاں اتفاق سے عصرِ جدید کے چند اچھے شعراء یکجا ہوگئے تھے۔ اُس وقت اگر فانیؔ کا جادو اُن پر چل گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن شعوری ارتقاء کے لحاظ سے وہ فانیؔ سے بہت مختلف تھے اِس لئے فانیؔ سے اُن کا تعلق ذہنی نہیں فنّی رہا اور وہ بھی تھوڑے ہی دنوں کے لئے۔ علی گڑھ ہمیشہ کسی نہ کسی حیثیت سے ایک ہیجان انگیز ماحول کا حامل رہا ہے اور سنہ ۱۹۳۰ء سے بعد کی سیاسی تگ و دَو نے تو اُسے خاص طور سے متاثر کیا تھا چنانچہ مجازؔ کے شعور کو وہاں پہنچ کر نئی غذا ملی اور احساس کی منزلیں جلد جلد طے ہونے لگیں۔ عمر کی وہ منزل تھی جس کے لئے شادؔ عظیم آبادی نے "اُف ری جوانی ہائے زمانے" کے بولتے ہوئے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہاں جذبات اور تجربات کا تجزیہ آسان نہیں، رہ جاتا تحلیلِ نفسی سے دلچسپی لینے والے تو آسانی کے ساتھ جنسی جذبے کے اُبھار، آسودگی اور ناآسودگی، ارتقائے فن، سماجی شعور کی بیداری، فلسفۂ زندگی کے انتخاب، کچھ کر گذرنے اور محض خواب دیکھنے کو ایک ہی میں منسلک کر دے گا اور ہر طرح کے تجربے اور اُس کے ردِّ عمل کو جنسی یا کسی ایسے ہی جذبے کے غیر معتدل اظہار یا ارتفاع کی شکل میں دیکھیں گے لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ یقیناً جوانی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور وہ تسکین چاہتے ہیں لیکن یہ حیاتیاتی بیداری جب زندگی کے دوسرے جذبات سے آمیز ہو جاتی ہے تو

محض رومانی والہانہ پن بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ شاعر کی دنیا کو وسیع کرتی ہے اور وہ یہ اعلان کرتا ہے ؎

عشق ہی عشق ہے دنیا میری — فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد — اور اک شاعرِ بیدار ہوں میں
زندگی کیا ہے گناہِ آدم — زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں
لے کے نکلا ہوں گہرہائے سخن — ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں
دیر و کعبہ میں ہیں میرے چرچے — اور رسوا سرِ بازار ہوں میں
کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے — اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں — نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں
اہلِ دنیا کے لئے ننگ سہی — رونقِ انجمنِ یار ہوں میں
مجھ سے برہم ہے مزاجِ پیری — مجرمِ شوخیِ گفتار ہوں میں
محفلِ دہر پہ طاری ہے جمود — اور وارفتۂ رفتار ہوں میں
اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں — ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

میں نے اس نظم کے بعض شعر چھوڑ دیئے ہیں اور معنوی تسلسل کے لئے اشعار کی ترتیب بدل دی ہے۔ اس نظم کا لکھنے والا جنسی شعور کی راہوں سے ہو کر سماجی شعور کی وسیع تر دنیا میں قدم رکھ رہا ہے شخصیت مختلف خانوں میں بٹ نہیں رہی ہے بلکہ مختلف قسم کے تجربے سمیٹ رہی ہے، محدود جذباتی دنیا کا خول توڑ کر باہر نکل رہی ہے۔ شعور کی تشکیل میں وقتاً فوقتاً جو عناصر شامل ہوتے ہیں وہ پچھلے عناصر کی مکمل نفی نہیں کرتے، اس لئے اس تبدیلی کی حالت میں جذبات کی ترکیب پیچیدہ ہو جاتی ہے اور ایک ہی نظم کے اندر کئی عناصر یکجا ہو جاتے ہیں جس نظم کے اشعار اوپر دیئے گئے ہیں اُن میں بھی یہی بات دیکھی جا سکتی ہے لیکن یہاں "اَنا" کی حدیں وسیع ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

کسی شاعر کے ذہنی، جذباتی اور فنی ارتقاء کے لئے اُس کی چند اہم نظموں کا انتخاب کر کے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اُس کے تجربے کس طرح زندگی کا جزو بن کر فن کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں۔

احساسِ فن کا ارتقا محض اندازِ بیان کی پختگی نہیں ہے اور نہ ہیئت کے نت نئے تجربے بلکہ فن کار کی اُس صلاحیت کا ارتقا ہے جو موضوع، مواد اور ہیئت کو ایک کرتی ہے۔ اگرچہ نظموں میں بھی فکری اور فنی ارتقا کا تسلی بخش احساس ہو جائے تو یہ شاعر کی کامیابی کی دلیل ہے۔ غزلوں کو چھوڑ کر میں مجاز کی حسبِ ذیل نظموں کا انتخاب اس سلسلہ میں کروں گا۔ آج کی رات، رات اور ریل، انقلاب، تعارف، نذرِ علیگڑھ، اندھیری رات کا مسافر، آوارہ، سرمایہ داری، خوابِ سحر، عشرتِ تنہائی، عیادت، اعتراف، مہمان اور فکر۔ یہ نظمیں مجاز کے ارتقائے ذہن اور فن کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے کسی نظم کو پیشِ نظر رکھ کر کسی نہ کسی حد تک ان کی انفرادیت، سماجی شعور اور احساسِ فن کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

صرف مجاز ہی کے لئے نہیں عہدِ حاضر کے اکثر نوجوان شعراء کے لئے یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ رومان سے انقلاب کی طرف آئے، اِس سے کبھی تنقیص مراد ہوتی ہے اور کبھی توصیف۔ یہ کچھ بھی نہ ہو تو کم سے کم شاعر کے سمجھنے میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ مجاز کی ابتدائی شاعری کی رومانیت آہستہ آہستہ انقلابی رومانیت میں تبدیل ہوتی رہی، وہ اکثر و بیشتر صحت مند اور زندگی بخش رہی، اُس نے مجاز کو گرفتار نہیں رکھا بلکہ اُس کے جوش اور ولولہ کو مہمیز کرتی رہی، انھیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی رہی۔ میں اس سے پہلے ایک مضمون "مجاز کی شاعری میں رومانی عناصر" لکھ کر اس رومانیت کی نوعیت سے بحث کر چکا ہوں، اس وقت اتنا ہی کہنا ہے کہ اس نے شعور کی مختلف منزلوں میں مجاز کے شاعرانہ حسن اور سماجی بصیرت کا ساتھ دیا۔ سچ پوچھئے تو ارتقائے شعور کی یہ رفتار عام ہے اور چونکہ شاعرانہ حسن اور فن کارانہ رنگینی کے ساتھ پیش ہوئی ہے اِس لئے نوجوان نسل کی امنگوں اور خواہشوں، کامیابیوں اور ناکامیوں، ہزیمتوں اور فتح مندیوں کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ اِس نے مجاز کو نوجوانوں کا محبوب شاعر بنا دیا۔ ان کے تجربے ان کے ہوتے ہوئے بھی لاکھوں نوجوانوں کے تجربے تھے۔ یہ تجربے مذہبی، روحانی یا مابعد الطبیعیاتی تجربے نہیں ہیں جن میں دوسرا آسانی سے شریک نہ ہو سکے بلکہ اُس زندگی کے عام تجربے ہیں جو محبت، آرام، سکون، آزادی اور روزگار کی بھوکی ہے۔

اِس جگہ میں اُس صورتِ حال کا جائزہ نہیں لینا چاہتا جو سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہندوستان کی قسمت کی تشکیل کر رہی تھی، معمولی غور و فکر سے ہر شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اِس صورتِ حال کا نتیجہ

تخریب کے جذبے اور تعمیر کی خواہش میں ظاہر ہو تو ہمیں اس کو ایک قدرتی بات سمجھنا چاہیے۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر انقلاب، اندھیری رات کا مسافر، سرمایہ داری، آوارہ اور خواب سحر کا مطالعہ کیجیے تو انفرادی تجربہ اور عمومی فلسفۂ زندگی کے تعلق اور فن میں اُس تعلق کے اظہار کی معنویت کا اندازہ ہو سکے گا۔ مواد اور ہیئت کے تعلق کے یہی معنی ہیں اور یہی شاعری ہے۔

کامیاب اور پُر اثر شاعری کے پرکھنے کے ذرائع کیا ہیں یہ فنِ نقد کا بے حد مشکل مسئلہ ہے۔ اس وقت اس کو چھیڑنا بھی نہیں ہے مگر اتنا کہنا ضروری ہے کہ اس کے بعض مثبت اور بعض منفی عناصر پیش نگاہ ہوں تو پرکھ کا کوئی معیار ضرور قائم ہو سکتا ہے۔ منفی عناصر میں ابہام، پراسرار انفرادی تجربے، غیر واضح مضامین، بے جا اشاریت، دور از کار تشبیہ اور استعارے ہو سکتے ہیں تو مثبت میں مواد کی معنویت اور اظہار کا حسن، شخصیت اور فن میں ہم آہنگی وغیرہ کو شمار کر سکتے ہیں۔ مجاز کی شاعری کے پرکھنے میں ان عناصر سے بڑی مدد ملتی ہے۔ انھوں نے قدیم اور مروّج شاعرانہ روایات اور اسالیب بیان کا احترام کرتے ہوئے اپنے سوزِ نفس سے ان میں تازگی، جدت اور کیفیت پیدا کی۔ مجاز کے لہجے کا دھیماپن، رَس، کیف، گھلاوٹ اور غنائیت، موضوعات کی عمومیت اور عصریت سے مل کر لطیف شاعرانہ پیکر اختیار کرتے ہیں۔

تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ اُن کی بعض نظموں کا تجزیہ ان نتائج کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تاہم خاتمہ پر ایک نظم کے متعلق کچھ کہنا بے سود نہ ہوگا۔ مجاز ذہنی کرب کی منزلوں سے کئی بار گذرے لیکن جیسے ہی اُن کا مزاج اعتدال پر آیا، اُن کے تصورات کی ساری رعنائیاں ایک ایک کر کے واپس آئیں۔ یہ خیال مجھے اُس وقت سب سے زیادہ آتا ہے جب میں اُن کی نظم فکر پڑھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ مجاز کی آخری اہم نظم ہے جسے اُن کی شخصیت اور شاعری، فکر اور فن کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر کے ماضی، حال اور مستقبل کے خیال و خواب، امید اور یاس، پسپائی اور عزم، ناآسودگی اور جذبۂ عمل سبھی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اُن کی دوسری اہم نظمیں ذہنی فضا میں پرواز کی مختلف منزلیں تھیں، فکر اُن کے وجود کی ہمہ گیری اور شخصیت کے اندر شدید انفرادی اور سماجی

کشمکش کی مظہر ہے۔ سات بندوں (چار چار مصرعے کے بند) کی یہ مختصر سی نظم اس بند سے شروع ہوتی ہے

(۱) نہیں ہر چند کسی گم شدہ جنت کی تلاش
اک نہ اک خلد طربناک کا ارماں ہے ضرور

بزم دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے مجھ کو
میری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور

اس میں گم شدہ جنت کی تلاش سے بے تعلقی ظاہر کر کے خیالی اور فرضی مستقبل کے بجائے ایک حقیقی جنتِ ارضی کی خواہش کا شاعرانہ اظہار، مجاز کو عام انسانوں سے قریب رکھتا ہے۔ اِس مستقبل کیلئے شعوری یا غیر شعوری طور پر کس کی روح بے قرار نہیں ہے! "ہر چند" اور "ضرور" کا شاعرانہ استعمال اختصار کے ساتھ اہم مفہوم ادا کرتا ہے۔ جو خوبصورت راتیں دوسروں نے سجائیں اُن کا کیا غم لیکن آنے والی راتوں کی سجی ہوئی محفلیں ضرور اپنی طرف بُلا رہی ہیں، ان میں شرکت کی خواہش ہے۔ نظم شروع ہوتے ہی شاعر کے مزاج، شوق اور حوصلہ کا پتہ دے دیتی ہے۔ معنوی حیثیت سے الفاظ کا انتخاب اتنا ہی فکر انگیز ہے جتنا موسیقی اور ترنم کے لحاظ سے دلکش۔ نظم کے باقی بند بھی لکھ دوں تو کچھ کہنے میں آسانی ہوگی اور اس کا مجموعی اثر بھی منتشر نہ ہوگا ؎

(۲) مٹ کے، برباد جہاں ہو کے، سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں

کارفرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دلِ مضطر ابھی آمادۂ یاس نہیں

(۳) تازہ دم بھی ہوں، مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں

ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا!
کیا یہی ہے اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

(۴) جو شوں کا طرب انگیز تبسم کیا ہے
ہے تو سب کچھ یہ مگر خواب اثر کیوں ہو جائے
حسن کی جلوہ گہِ ناز کا افسوں تسلیم
یہی قربانگہ اربابِ نظر کیوں ہو جائے

(۵) میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل میری
اک حسیں بازوئے سیمیں کا سہارا بھی تو ہو
دشتِ ظلمات سے آخر کو گذرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارا بھی تو ہو

(۶) آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی
ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیقِ مہِ کنعاں نہ بنی

(۷) بایں انعامِ وفا، اُف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کر دے
خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیِ دوراں کر دے

مستقبل کی "خلد طربناک" کا ذکر کرنے اور اُس سے لَو لگانے کے بعد شاعر کو ماضی کا خیال آیا جس میں بہت سے ارمانوں کا خون ہوا تھا۔ وہ اس کی تفصیلات پیش نہیں کرتا محض تین چھوٹے چھوٹے فقروں سے ناکامی اور بربادی کے احساس کی شدت ظاہر کرتا ہے لیکن یہ بھی بتا دینا چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا ہو، اب وہ تازہ دم ہو کر پھر خوشیوں اور آسودگیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ یہ مایوسیاں جنسی، جذباتی اور مادی تھیں، انھوں نے مٹایا اور برباد کیا لیکن جستجو کا حوصلہ نہیں چھینا۔

مجازؔ کے یہاں یہی رجائیت اور اُمید ایک ایسا عنصر ہے جو "تازہ جنونِ تعمیر" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تیسرے بند میں اُس کی جوانی اُسے پھر کسی زہرہ جبین کی یاد دلاتی ہے، ایسی زہرہ جبین جو اُس کے جنونِ تعمیر میں اُس کی ساتھی بن جائے۔ یہ خیال ایک کشمکش کی شکل اختیار کرتا ہے اور بعد کے تین بند شاعر کے دل میں ایک جنگ کی صورت اختیار کرتے ہیں وہ سوچتا ہے کیا زندگی کا مقصد آغوشِ حسین کے سوا اور کچھ نہیں ہے؟ وہ بیراگی یا رہبانیت پسند نہیں ہے، اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ محبت کی نگاہ میں بڑی قوت ہے، ایک حسین بازوئے سیمیں کا سہارا جد و جہد کی منزل میں بڑی مدد کر سکتا ہے لیکن ایک ایسے باشعور نوجوان کی طرح جس کے سامنے انسانیت اور قوم کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہو مجازؔ بھی اسی کو سب کچھ سمجھنے پر تیار نہیں۔ یہ درست ہے کہ اگر سماجی رکاوٹوں کو توڑ کر حسن اور عشق ہم نوا اور ہم آغوش ہو جائیں تو زندگی کا نقشہ بدل سکتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو جوشِ حیات اور جنونِ تعمیر کو ختم نہیں ہو جانا چاہیے۔ مجازؔ نے اِن خیالات کو جن شاعرانہ رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا ہے انھوں نے حقائق کو زیادہ سنگین اور پُر اثر بنا دیا ہے۔

اب آخری بند دیکھئے۔ محبت میں شکست اور پسپائی، ناکامی اور نامرادی نے مجازؔ کو تباہ کیا لیکن اُس نے ایک ہلکے سے طنز کے علاوہ اور کچھ نہ کہا۔ اُس نے کوئی واسوخت نہیں لکھا کیونکہ وہ محبت کی سماجی پیچیدگیوں اور محبوب کی مجبوریوں سے واقف تھا۔ تقاضائے حیات میں جنسی محبت محض ایک جزو ہے، بحرِ حیات کی صرف ایک موج، زندگی محبت سے بڑی ہے اور مایوسی کے بعد بھی کفن باندھ کر اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے نکل پڑنے کی دعوت دیتی ہے۔ تقاضائے حیات کا مطالبہ ہے کہ رگوں میں جو خون بچ رہا ہے وہ بھی کام آئے، مجازؔ نے اپنی روح کی پوری قوت سے لبّیک کہا ؎

خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

ایسے شاعر سے کون محبت نہ کرے گا جو خون کے بچے کھچے قطروں سے چمن بندیٔ دو عالم کا کام لینا چاہتا ہے! اس نظم میں مجازؔ کے فن اور فکر کا خوبصورت امتزاج ہے اور یہی اُن کی شاعری کا بنیادی آہنگ ہے۔ نہ اُن کے خیالات اور تصورات سے شاعرانہ لطافتیں مجروح ہوتی ہیں اور نہ شاعرانہ مینا کاری اور مرصع سازی اُن کے خیالات اور جذبات کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نوجوان شعراء میں جس نے سب سے زیادہ اس راز کو سمجھا وہ مجازؔ ہیں۔

اُردو شاعری گذشتہ پچیس سال میں (اور یہی پچیس سال مجازؔ کی شاعری کی عمر بھی ہے) مختلف قسم کے تجربات سے گذری ہے۔ یہ تجربے صرف ہیئت ہی میں نہیں ہوتے ہیں بلکہ موضوعات کے انتخاب میں بھی ہوتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں آزاد نظم گوئی کا رواج اور شعور اور لاشعور کی پیچیدگیوں کے ساتھ جنسی یا نفسیاتی الجھنوں کا مُبہم بیان، دو مخصوص چیزیں ہیں جن پر ضرور نگاہ جاتی ہے۔ بعض شعراء نے انھیں جدت سمجھ کر اختیار کیا، بعض نے نقل کی، بعض نے اسے اپنی شاعرانہ شخصیت کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا۔ کچھ اس میں بے راہ روی اختیار کر گئے اور کچھ ایک چھوٹی سی دنیا میں محدود ہو کر رہ گئے۔ ان تجربہ کرنے والوں میں سے اکثر اُن قدروں کی کھلی یا چھپی مخالفت کرنے میں لطف محسوس کرتے رہے جنھیں ترقی پسندانہ کہا جاتا تھا، گویا ساری شاعری نے ایک منفی نوعیت اختیار کرلی لیکن مجازؔ نے کبھی محض اس تجربہ کی کشش محسوس نہیں کی اور شاعری کو اُن اعلیٰ مقاصد کے لئے وقف رکھا جو تعمیرِ حیات کے کام آتے ہیں۔ مجازؔ نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شاعری میں تازگی، گرمی اور اثر محض ان تجربوں سے نہیں خلوص، مقصد کی عظمت، الفاظ کے فن کارانہ صرف اور فنی روایات کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتی ہے اس لئے مجازؔ کی شاعری چاہے عظیم نہ ہو پُراثر، پُرسحر اور پُرکار ضرور ہے۔ یہی چیز انھیں اردو کا مقبول اور جوانوں کا محبوب شاعر بناتی ہے۔

منیب الرحمٰن

شاعر کی موت

وہ ایک پھول تھا سورج کو جو ترستا ہو
اسے ملی تھی شبانِ الم کی بیتابی
غموں کی زندہ دلی ، انجمن کی تنہائی
وہ چاہتا تھا کہ جوئے سحر میں غسل کرے
سکھائے اپنے پر و بال نرم کرنوں میں
تجلیوں سے سنے نغمہ ہائے بیداری
سمیٹ لے شفقِ رنگ و نور آنکھوں میں
اسے مسل ہی دیا زندگی کے ہاتھوں نے

فضا میں کھول دئے گیسوئے فغاں ہم نے
اٹھائیں حسن پریشاں کی پتیاں ہم نے
صبا کی راہگذر میں اُنھیں بکھیر دیا
کہ زیرِ خرمنِ مہتاب دفن ہو جائیں
رہیں حضورِ محبت رہینِ بے خبری
روایتوں کے اندھیرے میں جاکے کھو جائیں
لئے غبارِ رہِ ہجر جب قدم لوٹے
لرز رہا تھا افق پر ستارۂ سحری

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

مجازؔ مرحوم

میکش اکبر آبادی

کسے خبر تھی کہ آج کی صحبتیں کل افسانہ بن جائیں گی اور مستزاد یہ کہ ہم میں ہی سے کسی کو خود ہی یہ افسانہ سُنانا پڑے گا مگر واقعہ یہ ہے کہ مجاز کی اور میری ملاقاتوں اور صحبتوں میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جس کا افسانہ بنایا جا سکے ہاں اُن کی زندگی میں کچھ راز ضرور تھے کیوں کہ جب وہ شام کو ہوسٹل سے شہر آنے کو ہوتے تو آدھ گھنٹہ آئینے کے سامنے سنورتے رہتے۔ یوں تو شاید ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے اپنے آپکو اچھا لگتا ہے اور جتنا اچھا لگتا ہے۔ اس سے زیادہ اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے خصوصاً جب وہ کسی کی نظر میں محبوب بننا چاہتا ہو۔ یہ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ کس کی نظر میں محبوب بننا چاہتے تھے۔

البتہ ایک روز ایسا ضرور ہوا کہ وہ شام کو حسب معمول میرے یہاں آئے اور ہم سب کی طرف پشت کر کے ایک مکان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ مجھے یہ بات خصوصیت سے بُری معلوم ہوئی کیونکہ اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی بیٹھے تھے جن کی میں عزت کرتا تھا اس لئے میں نے مجاز کو تنبیہ کی اور خلاف عادت سخت لہجے میں تنبیہ کی مگر وہ بالکل خاموش رہے میں ان کی خاموشی سے ڈر گیا میں نے سوچا یہ بہت زیادہ خفا ہو گئے مگر ایسا نہ تھا وہ برابر آتے رہے اور انھوں نے بغیر معذرت کئے میری معذرت قبول کر لی ان کا انداز ایسا تھا کہ ان کا غصہ نفرت اور محبت کچھ بھی ان کے چہرے سے محسوس نہ ہوتا تھا وہ ایک دہکتا ہوا انگارہ تھے جو راکھ میں دبا ہوا ہو۔ میں نے انھیں مختلف عمروں مختلف حالتوں اور مختلف ماحول میں دیکھا ہے۔ کبھی بے خود ہو کر قہقہہ مارتے نہیں دیکھا کبھی غصے میں آپے سے باہر نہیں دیکھا اور کبھی غم میں

بے ساختہ نہیں پڑا اُن کے ہاتھ اکثر لرز جاتے تھے اور ان کی آنکھیں ضرور سب کچھ کہہ دیتی تھیں۔
میں دوستوں کو نوازنے اور انھیں یاد رکھنے کا بھی جوہر تھا ایسے کتنے ہی لوگ میرے پاس آتے رہے ہیں جو مجاز کے ذریعے سے میرے ملنے کے مشتاق ہوئے وہ میرے یہاں کی صحبتوں کا ذکر بھی اکثر کرتے رہتے تھے ان صحبتوں کی کیا باتیں انھیں یاد آتی تھیں مجھے نہیں معلوم وہ مجھے برابر وہ رسالے بھیجتے رہے جن سے ان کا تعلق رہا۔

مجاز سے میری ملاقات کی ابتداء کب اور کس طرح ہوئی تھی یاد نہیں ان کی آمد بالکل اس طرح ہوئی تھی جس طرح ایک مصرع کے بعد بغیر سوچے ہوئے دوسرا مصرع ہو جائے پہلا مصرع جذبی تھے اور دوسرا مجاز۔ وہ جذبی صاحب کے ساتھ آئے اور پھر جب تک آگرے میں رہے آتے ہی رہے۔

جذبی صاحب سے میری ملاقات ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ کا طرحی مشاعرہ تھا۔ فرسٹ ایر کے ایک نوعمر طالب علم نے جگر کی دھن میں کڑکتی ہوئی آواز سے غزل پڑھی اور سارے مشاعرے پر چھا گیا میری غزل بھی بہت کامیاب رہی اور اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے اور دوسرے ہی دن بے تکلف دوست۔ یہ سابق ملال اور حال کے جذبی صاحب تھے کچھ روز بعد جذبی صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب ملے۔ دبلے پتلے منحنی سے لباس اور وضع سب سے تحمل اور درست مگر مجبوری یہ تھی کہ گال پچکے ہوئے اور جوانی کی بھی کوئی کشش ان میں۔ یہی یہ مجاز صاحب تھے شعر بھی معمولی سا کہتے تھے اور پڑھنا بھی خدا کا نام تھا بولتے بھی بہت نہ تھے اور چہرے سے بھی دل کی آگ کا پتہ نہ چلتا تھا ہاں آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی وہ ایسے لگتے تھے جیسے کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو۔ تقریباً روزانہ شام کو جذبی صاحب کے ساتھ آتے گپیں لگتیں ہنستے ہنساتے اور چلے جاتے کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہو جاتی مگر صحبت کا اصل موضوع تو ہنسنا ہنسانا اور بننا بنانا ہی تھا شام کی صحبت میں یہی کام سنجیدگی کے ساتھ کیا جاتا تھا کام کے لیے سارا دن پڑا تھا کام تو یہ لوگ کرتے تھے میرے لیے تو سنجیدگی سے ملاقاتیوں سے ہم کلام ہونا اور ان کے مذاق کا لحاظ رکھنا ہی بڑا کام تھا مختلف مذاق اور مختلف عمر کے لوگوں کو مطمئن کرنا بڑا فن بھی ہے اور بڑی ریاکاری بھی اور میں اس فن اور ریاکاری دونوں میں

ناقص ہوں اس لیے شاید اس مجلس کا دن بھر انتظار رہتا جہاں نہ سوچ کر بات کی جاتی تھی اور نہ بات کر کے سوچنا پڑتا تھا مگر مجاز تو اس وقت بھی ایسے ہی معلوم ہوتے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں ان کی فطرت عجیب تھی رنگی بے تکلفی ان کے مذاق اور ان کی ہنسی سب کی ایک حد تھی معلوم نہیں سب کے ساتھ وہ ایسے تھے یا میرے ہی ساتھ یہ معاملہ تھا یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ جب انھوں نے علانیہ شراب نوشی شروع کر دی تھی تب بھی وہ مجھ سے حجاب رکھنے کی کوشش کرتے رہے ایک بار وہ میرے یہاں جوش صاحب کے ساتھ آئے اور جوش صاحب نے مجھ سے ان کا یہ حجاب توڑنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہو گئے مگر پھر اس کے بعد ہمیشہ اپنی پرانی وضع اور روادت کا لحاظ رکھتے رہے نہ کبھی میرے سامنے پی اور نہ کبھی یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ پیے ہوئے ہیں ان کا رکھ رکھاؤ یکساں ہی رہا یہاں تک کہ جب ان کا دماغی توازن خراب ہونے کو تھا مگر محسوس نہ ہوا تھا تب بھی وہ میرے یہاں آکر ٹھہرے ان کا انداز وہی تھا یہ ضرور ہوا کہ انھوں نے میری ٹوپی دیکھتے ہی اپنی ٹوپی پھینک دی اور میری ٹوپی مانگ کر پہن لی کہنے لگے میری ٹوپی بہت خراب ہو گئی ہے ان کی ٹوپی واقعی خراب ہو گئی تھی میں نے کہا میرے وہ فلاں دوست ہیں نا! ان کی ایک ترکی ٹوپی تھی وہ بہت میلی ہو گئی جہاں کہیں وہ ٹوپی چھوڑ آتے صاحب خانہ انھیں واپس کر دیتا آخر ایک دن وہ آگرہ فورٹ اسٹیشن گئے اور ٹوپی ہاتھ میں لیے ٹہلتے رہے جب گارڈ نے سیٹی دی اور ٹرین چل نکلی تو انھوں نے ٹوپی ایک خالی ڈبے میں ڈال دی اور کھڑے ٹرین کو دیکھتے رہے جب گاڑی نظر سے غائب ہو گئی تب ہاں سے ہٹے مجاز ہنسنے لگے۔

اس روز وہ دن بھر میرے پاس رہے اور پھر غائب ہو گئے میں ان کا انتظار کرتا رہا آخر معلوم ہوا کہ میڈیکل کالج کے طالب علموں کے ہاتھ پڑ گئے ہیں وہ بلا دیتے ہیں اور گھنٹوں غزلیں سنتے رہتے ہیں۔

میری یہ عادت نہیں ہے کہ میں اپنے شاعر دوستوں سے کچھ سنوں یا انھیں سناؤں مجھے ان کی باتوں میں زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ مجاز بھی خواہ مخواہ شعر سنانے کے عادی نہ تھے اور سچ یہ ہے کہ میں برسوں اس فیصلے پر قائم رہا ہوں کہ مجاز نہ کامیاب شاعر ہو سکتے ہیں نہ کامیاب عاشق اور یہ کہ وہ جنس کی دیکھا دیکھی

شعر کہتے ہیں جب ان کے شعور سن کر اکثر دل میں کہا کرتا عزیب سے کس نے کہہ دیا ہے کہ شاعری کے ساتھ زبردستی کرے۔ مگر جب مجاز نے اپنی نظم آوارہ لکھنی شروع کی اور اس کے چند بند مجھے سنائے تو میں نے سنجیدگی سے ان کی ہمت افزائی کی اور مجھے محسوس ہوا کہ اب شاعری نے مجاز سے زبردستی شروع کر دی ہے پھر بہت دن بعد ایک روز ایسا ہوا کہ مجاز جوش کے ساتھ آئے ہم تینوں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کسی طرح نظمیں شروع ہو گئیں ایک کے بعد ایک نظم سناتا مجاز نے ایک نظم سنائی جو کسی نرس پر لکھی تھی میں نے کہا اس عنوان پر میری نظم سنیے مجاز نے سن کر کہا آپ کی نظم میری نظم سے اچھی ہے جوش صاحب نے بھی تائید کی جوش نے کہا مجاز وہ رات اور ریل انہیں سناؤ مجاز رات اور ریل سنانے لگے میں حیرت زدہ مجاز کا منہ تک رہا تھا جوش جھوم رہے تھے اور مجاز لہک لہک کر نظم سنا رہے تھے ان کی آواز معمول سے زیادہ کپکپا رہی تھی میں نے اس روز مجاز کو صرف شاعر ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ میں واقعی ان سے مرعوب بھی ہو گیا اور مجاز اس بات پر مسرور تھے بہت مسرور۔

مجاز سے میری آخری ملاقات دہلی کالج کے مشاعرے میں ہوئی تھی یہ مشاعرہ غالباً ۱۹۵۰ء میں پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے اہتمام سے ہوا تھا اس میں مجاز بھی شریک تھے اور جوش صاحب بھی مگر دونوں علیحدہ علیحدہ سے تھے میں جوش کے ساتھ تھا مگر مجاز سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہو رہی تھیں وہ بڑی محبت سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔
سگریٹ کا کش لیتے اور میرا یہ شعر پڑھتے اور مسکراتے۔

کبھی تو سینکڑوں سجدے ہیں ماہ جبینوں کو
کبھی اُٹھا کے نظر ان کو دیکھتا بھی نہیں

مجاز — میرا بھائی

حمیدہ سالم

مجاز میرا بھائی ایک ڈرامائی انداز سے اس زندگی میں ابھرا اور اسی انداز سے ڈوب گیا۔ اس کی زندگی امنگوں حوصلوں سے بھرپور شروع ہوئی اور محرومیوں مایوسیوں میں گھر کر ختم ہو گئی وہ زندگی کو روشن سے روشن تر دیکھنے کی تمنائیں پالتا رہا اور اس کی اپنی زندگی اندھیرے سے تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی۔ اس نے زندگی کو اپنی تخلیقی قوتوں کا قیمتی سرمایہ سونپا — اپنی شاعری دی جس میں کائنات کو حسین بنانے کے حوصلے ہیں۔ مستقبل کو سنوارنے کی امنگیں ہیں جوانی کی جولانی ہے تجربہ کا شعور ہے ہوش مندی ہے۔ تڑپ ہے شوریدہ سری ہے حسن ہے نفاست ہے۔ سادگی ہے پرکاری ہے اور زندگی نے اسے پریشانیاں دیں پشیمانیاں دیں۔ الجھنیں دیں بے چینی دی وہ زندگی سے محبت مانگتا رہا مسرت مانگتا رہا سکون چاہتا رہا آسودگی چاہتا رہا اور زندگی رفتہ رفتہ اس سے دور کھنچتی گئی یہاں تک کہ زندگی کی کھیتی کو خون دل سے سینچنے والے شاعر کو موت کی آغوش میں پناہ ملی۔

مجاز کی زندگی اور مجاز کی شخصیت کی کمزوریوں اور خوبصورتیوں کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے جس کے ساتھ مجاز کی زندگی شروع ہوتی ہے مجاز اودھ کے ایک مشہور قصبہ ردولی کے ایک کھاتے پیتے خاندان میں پیدا ہوئے یہ خاندان اور یہ قصبہ جس میں مجاز نے جنم لیا دونوں ہی کچھ اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ زمینداری کے خاتمے سے پہلے ردولی کی تمام تر آبادی زمینداروں اور تعلقداروں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے ماحول میں جاگیردارانہ

نظام کی تمام خوبیاں اور خامیاں سمٹی ہوئی تھیں بظاہر وہاں کا کلچر اور تہذیب کی سطح بہت بلند تھی وہاں کی زندگی میں سلیقہ تھا خوش مذاقی تھی۔ لوگ اچھا کھاتے تھے اچھا پہنتے تھے۔ رکھ رکھاؤ میں وضعداری میں خاطر تواضع میں یقین رکھتے تھے پرانی روایتوں سے آخر دم تک چمٹے رہنے میں عقیدہ تھا۔ رسم و رواج کی پابندی ایمان تھا۔ دکھاوے اور نمائش کو اہمیت حاصل تھی۔ ہر خوشی اور غم کے موقعہ پر دھوم دھام کی تقریبیں ضروری تھیں۔ ہر تہوار پر برادری بھر میں حصے بٹنے لازمی تھے یہ ڈھانچا زمینداری کی کمزور بنیادوں پر کب تک کھڑا رہتا۔ آخر کو بیٹھ گیا۔ اور آج ردولی میں سوائے عمارتوں کے کھنڈر اور افسردہ اداس چہروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مجاز کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اپنے بچپن کی ہر یاد انھیں عزیز تھی اس خود فراموشی کے عالم میں بھی جب کبھی اماں ان کے بچپن کی ردولی کا ذکر چھیڑتیں وہ بہت دلچسپی سے اس میں حصہ لیتے ہر چھوٹے بڑے کو پوچھتے۔ اب سے آٹھ دس سال پہلے تک وہ اکثر ردولی جایا کرتے تھے لیکن اب باوجود اصرار کے بھی وہ وہاں نہیں جاتے تھے انھیں اپنے وطن کے زوال پر بہت دُکھ تھا۔

ہمارے دادا چودھری احمد حسین گو کہ تھے متوسط درجہ کے زمیندار لیکن بڑی سمجھ بوجھ اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے قصبہ بھر میں مشہور تھے۔ ان کے سات اولادیں تھیں چار بیٹے اور تین بیٹیاں سب کے سب ذہین اور ضابع تھے۔ یہانتک کہ معاملہ فہمی اور کارگزاری میں اس خاندان کی بیٹیاں اس قدر مشہور تھیں کہ قصبہ میں اب تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا سوال تھا مسجد کے مکتب تھے اور کھاتا پیتا خاندان گھر میں مولوی رکھتا تھا غرضکہ عربی فارسی کی تعلیم اور حساب سے اتنی واقفیت کہ زمینداری کا پیشہ کامیابی سے چلایا جا سکے یہ تھا معیار۔ دادا کی دو اولادیں بچپن ہی سے کچھ مختلف اور ذرا غیر معمولی سی طبیعتیں رکھتی تھیں۔ ایک تو میرے چچا بہت ہی بے خبر مدہوش رنگین مزاج آزاد منش۔ دوسرے میرے والد بہت ہی سنجیدہ بردبار کم سخن محنتی اور مرنجان مرنج قسم کے انسان تصوف پرستی کا رنگ طبیعت پر غالب۔ دادا کو ان دونوں ہی کی طرف سے پریشانی تھی۔ میرے چچا تو قابو میں آنہ سکے ان کا پڑھنے لکھنے میں بالکل دل نہ لگا گو کہ

کہتے ہیں کہ سب بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور تیز دہی تھے۔ باپ کی زندگی میں چھپ چھپ کر
اور ان کے بعد کھلم کھلا جائداد کی پائی پائی بیچ کر خوب خوب طوائف بازی کی اور رنگ رلیاں
منائیں کہتے ہیں کہ اس خاندان کی ہر نسل میں ایک ہکا ہوا فرد ضرور ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک
خوبصورت روایت ہے کبھی خاندانی جنات دادا کسی کی دلہن اڑا لائے تھے۔ ایک منچلا لڑکا بار بار بجاتا اور
کہتا جنات دادا دلہن دکھاؤ۔ جنات دادا آخر کو جھنجھلا اٹھے اور ایک کنکری اٹھا کر پھینکی جو اس
لڑکے کے ماتھے پر لگی۔ اسوقت سے اس خاندان کی ہر نسل میں ایک دیوانہ پیدا ہونے لگا۔ میرے والد
دنیا کے بکھیڑوں میں پھنسا ہی دیے گئے۔ چودہ برس کی عمر میں چچا زاد بہن سے شادی کر دی گئی
لیکن ان کی علم دوستی میں فرق نہیں آسکا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک تعلقدار گھرانے میں فیض آباد
سے آئے ہوئے ایک انگریزی داں استاد رکھے گئے تھے۔ والد نے ان سے استفادہ اٹھایا اور
زیادہ تر اپنی لگن کے نتیجہ پر پرائیوٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ قصبہ میں اپنی نوعیت کا
یہ پہلو واقعہ تھا۔ دادا کی بھی ہمت بڑھی والد لکھنؤ بھیجے گئے اور کچھ اپنی کاوش اور کچھ گھر والوں کی
مدد سے تعلیم کا انتظام ہوا۔ بی اے ایل ایل بی تک کی نوبت آئی تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری
ملازمت کی۔ ردولی کے یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے زمینداری کے باوجود کسی دوسرے پیشے کو اپنایا
غرض کہ مجاز اس ابھرتے ہوئے خاندان میں پیدا ہوئے۔ جو ایک طرف تو پرانی قدروں کو سینہ
سے لگائے ہوئے تھا دوسری طرف نئی قدروں کو بھی اپنا رہا تھا۔ اس خصوصیت کی جھلک مجاز کی
شخصیت میں بھی تھی اور کلام میں بھی۔ ہماری ماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بالکل
ان پڑھ لیکن بہت تیز ذہن زمانہ شناس۔ فطرتاً شوقین مزاج تفریح پسند اور طبیعت پر جذباتیت کا
رنگ غالب۔ مجاز کی شخصیت میں ماں باپ دونوں کی خصوصیات کا ملا جلا رنگ تھا باپ کی طرف سے
نیک نیتی کم سخنی حقیقت پسندی اور طبیعت کی گہرائی پائی ماں کی طرف سے طبیعت میں حسن پرستی
اور بے حسی اثر پذیری اور جذباتیت ملی۔ کاش ان کے حصہ میں باپ کی طبیعت کا ٹھہراؤ استقلال
اور ارادے کی مضبوطی ہوتی۔ لیکن ان کی زندگی کو تو یوں بکھرنا تھا۔ زمانہ کو تو حالات کے ہاتھوں

فنکاری موت کے تماشے دیکھتے تھے ان کی طبیعت میں وہ مضبوطی نہ تھی جو ان کے دل و دماغ کی نزاکت دُھواں بن کر محفوظ رکھ سکتی۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مبارک سلامت کی صداؤں کے درمیان پیدا ہوئے۔ ان سے بڑا ایک بچہ دو ڈھائی سال کی عمر میں ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ بہت لاڈ اور منتوں مرادوں سے پالے گئے۔ محرم کی ساتویں کو فقیر بنتے دسویں کو پایک ساتھ ایک کان میں بندا ڈالا گیا جو سات سال کی عمر میں اجمیر شریف لے جا کر اتار اگیا۔ ہر بیماری پر صدقے اترتے خیراتیں ہوئیں۔ نو دس سال کے ہوئے کہ اٹھارہ سالہ بڑے بھائی کا درخت سے گر کر انتقال ہو گیا پھر کیا تھا ماں اور نانی دیوانہ وار ان کو تمام حوادث اور خطرات سے بچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگ گئیں مجال نہ تھی کہ گھر سے اکیلے باہر قدم نکال لیں ہر وقت ایک نوکر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ عمر کے آخر دن تک کوئی صبح ایسی نہ گزری جب ماں نے ان کے لیے دو رکعت شکرانہ کی نہ پڑھی ہوں۔ اب سے چھ سات سال سے دو آنہ روزانہ رات ان کے سرہانے رکھے جاتے جو صبح خیرات کر دیے جاتے غرض کہ ان کی ہر سانس کے ساتھ ماں کی دعائیں وابستہ تھیں اور ہر قدم کے ساتھ تمنائیں اور آرزوئیں۔ بچپن سے ہم سب نے یہ محسوس کیا گویا ماں کی زندگی کا محور وہی ہوں ان حالات میں ہم بھائی بہنوں کے دل میں ان کی طرف سے رقابت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری تھا۔ لیکن یہ ان کی اپنی طبیعت کی سادگی معصومیت اور خلوص تھا جو ایسی بدمزگی کی فضا گھر میں نہ پیدا ہو سکی ماں نے ان کی پرورش میں کتنی راتیں جاگ جاگ کر گزاری ہیں آنے والی مسرتوں کے خواب دیکھے ہیں اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ان کی عوفیت جگن اسی بنا پر پڑی کہ بچپن سے راتوں کو جاگنے کی عادت تھی کسے معلوم تھا کہ بچپن کی یہ شب بیداری اور بے چینی آخر عمر تک ان کا ساتھ دے گی۔

جگن بھیا بچپن سے بلا کے شریر اور بے خبر تھے بہنوں کو چھیڑنا بھائی سے لڑنا سب کے مٹھائی کے حصے چھپ چھپ کر کھا لینا۔ کھلونوں کو توڑ پھوڑ کر ان کے اندر کی ماہیت سے واقف ہونا گلی ڈنڈا اور دھول دھپا ان کے محبوب مشغلے تھے۔ آپا میری بڑی بہن ان سے بہت بڑی تھیں سو ان سے

ڈرتے تھے اور ان کے رعب میں رہتے تھے۔ ان کا برتاؤ بھی بہن سے زیادہ ماں کا سا تھا۔ صفیہ آپا اور نصار بھائی سے انکا اوپر تلے کا سا معاملہ تھا۔ بچپن میں ایک منٹ بھی تو ان تینوں کی آپس میں نہ بنتی۔ صفیہ آپا کی گڑیوں کی مینا پکڑ کر بچانے میں انھیں خاص لطف ملتا تھا۔ غرضکہ ہر وقت ان تینوں کے مقدمے پیش ہوتے رہتے تھے۔ پر فیصلہ زیادہ جگن بھیا کے حق میں ہوتا تھا کیونکہ ابا کے علاوہ کوئی بھی غیر جانبدارانہ طور پر فیصلہ نہیں دیتا تھا۔ جگن بھیا سب ہی کے لاڈلے تھے اور ابا ملازمت کے سلسلہ میں لکھنؤ رہتے تھے جب تعطیل میں آتے تو جگن بھیا کا رنگ ہی بدلا ہوا ہوتا ابا کا ایک حد تک۔ روایتی ادب لحاظ انھوں نے اپنی عمر کے آخر دم تک کیا۔ دیوانگی کے دور بھی گذرے لیکن ابا کے سامنے کبھی انھوں نے سگریٹ نہیں پی۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے اپنا کلام بھی نہیں سناتے تھے۔ میں ان سے بہت چھوٹی تھی۔ میری طرف ان کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ مجھے بہت چاہتے تھے۔ دوسروں کی مٹھائی چراتے اور مجھے کھلاتے۔ میری پرورش میں ماں کا ہاتھ بٹاتے۔ ماں کے بعد میں انھیں سے مانوس تھی ہر وقت انھیں سے چمٹی رہتی۔ میرا نام بھی انھوں نے ہی رکھا۔ اس کے ساتھ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ جگن بھیا بچپن ہی سے بہت حسن پرست تھے کوئی خوبصورت بی بی دیکھ لیں پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے کھیل کود کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک خوبصورت دلہن ردولی بیاہ کر آئیں۔ ان کا نام حمیدہ تھا۔ ان کے پیچھے جگن بھیا کا دیوانگی کا عالم تھا۔ میرا نام ذکیہ رکھا گیا تھا۔ ضد کر کے بدلا اور حمیدہ رکھ دیا جانے محض چاہت میں یا اس امید پر کہ شاید نام ہی کی لاج کی خاطر میں حسین نکل جاؤں۔ بڑھ کر میں اکثر ان سے لڑتی تھی کہ چہرہ کی خوبصورتی الگ رہی مجھے نام کی خوبصورتی سے محروم کر ڈالا ہنستے تھے اور کہتے تھے ارے پگلی خوبصورتی کہیں ناک آنکھوں کی ہوتی ہے اصل خوبصورتی تو دل کی ہے جو چہرہ پر دمکتی ہے میں پانچ سال کی تھی کہ مجھے چیچک نکلی اور اس غضب کی کہ سارا جسم دانوں سے لد گیا ایسی حالت میں جو گھناؤنا عالم رہا ہوگا اس کا اندازہ ہو بھی سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دور سے بو آتی تھی ابا نے احتیاطاً سب بچوں کا میرے پاس آنا منع کر رکھا تھا۔ لیکن جگن بھیا چھپ چھپ کر میرے پاس

پہونچ جاتے میرے دانوں پر نیم کی پتیوں سے کھجلی کرتے۔ مجھے کہانیاں سناتے لطیفے سناتے آخر کو انھیں منع کیا، پر چھوڑ دیا گیا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ ان کے دل میں کتنی نرمی تھی۔ کیسا گداز تھا طبیعت میں کتنا اخلاص تھا کتنی ہمدردی تھی جو وہ میرے، کھٹائی نے قریب کو اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر ترجیح دیتے تھے۔ ویسے بھی بیماروں کی تیمارداری کا انہیں بڑا ہنر تھا ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا تو دوا پلانے کی ذمہ داری انھیں کے سر ہوتی اور خاندان کا یہ بے خبر لاابالی اور لاپرواہ بچہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو پوری کامیابی کے ساتھ سنبھالتا۔

لیکن بھیا کی طبیعت میں بچپن ہی سے ایک قسم کی معصومیت اور سادگی تھی جسکی وجہ سے وہ سب کو عزیز تھے۔ جاگیردارانہ ماحول میں ملکیت کا احساس بچے کی گھٹی کے ساتھ سرایت کرتا ہے لیکن وہ فطرتاً بے خبر اور لاابالی تھے۔ دوسروں کی چیز اپنے تصرف میں لے آنا اپنی چیز دوسروں کو دے دینا ان کی عادت رہی گھر کے نوکروں چاکروں سے ان کی بھائی برادری کے تعلقات تھے۔ ایک گھر کا پلا ہوا نوکر شرف الدین سے ان کی بہت گہری پٹتی تھی۔ وہ ان کے گلی ڈنڈے کا ساتھی تھا جوان ہو کر اس نے دوسری جگہ نوکریاں کیں لیکن اکثر وہ بڑے بھیا سے ملنے آیا کرتا۔ غرضکہ بچپن ہی سے وہ کچھ غیر معمولی تھے۔ ایک کان کچھ خراب رہتا تھا۔ اس لیے ذرا اونچا سنتے تھے۔ میرے ایک ماموں نے انھیں "بنک بہرے اونٹ" کہتے تھے۔ ایک چچا انھیں "سڑے اونٹ" کہتے تھے اور کچھ سنکی۔ یہ نام سولہ سترہ سال کی عمر تک رائج رہے یہانتک کہ ماں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ اب لڑکا جوان ہو گیا ہے اسے سڑی سنکی کہنا مناسب نہیں۔

شوخ شریر اور بے خبر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین تھے اور پڑھائی میں ہوشیار حساب میں بہت تیز تھے۔ جماعت میں ہمیشہ اچھے طالب علموں میں شمار ہوا۔ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ کھیل کود کی وجہ سے گھٹنے ہمیشہ زخمی رہتے تھے اور ماں بے چاری نئے نئے پاجاموں میں پیوند لگاتے لگاتے اور رفو کرتے کرتے عاجز تھیں۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی مشق ہر وقت ہوتی رہتی تھی۔ گھر کے نہ جانے کتنے پلنگ ان کی اس مشق کی نذر ہوتے تھے

پلنگ کھڑے کر کے ان پر سے کودتے تھے۔ غرضکہ گھر میں ہم سب کے لیے ہر وقت وہ تفریح کا دلچسپی کا سبب بنے رہتے۔

پڑھائی میں ہوشیار ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کا بھی سلیقہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کی تعلیم میں انھوں نے بہت دلچسپی لی۔ صفیہ آپا کو انگریزی انھوں نے ہی شروع کرائی۔ میری تو درس تدریس کی تمام ذمہ داری انھیں کے سر تھی اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ کی یاد کا نقش میرے ذہن پر بہت گہرا ہے۔ میرا پڑھنے میں بالکل دل نہ لگتا تھا۔ نہ جانے کتنے قاعدے میرے لیے آئے ہوں گے اور میں الف زبر آ اور بے زبر با سے آگے نہ پڑھ سکی جانے میں غائب کر دیتی تھی یا غائب ہو جاتے تھے میری تمام دلچسپی گڑیوں ہنڈکلیوں یا پھر سہیلیوں کے ساتھ محدود پھرنے گھومنے میں تھی۔ ایک دن جب استانی جی نے میری طرف سے بالکل مایوسی کا اظہار کیا تو ماں نے بہت ہی رقت آمیز لہجہ میں مجھے سمجھایا کہ نہ میری شکل نہ صورت آخر پڑھو لکھو گی نہیں تو پھر کہاں کھپو گی۔ تصور بہت خوفناک تھا میں نے رونا شروع کر دیا۔ جگن بھیا اس منظر سے بہت متاثر ہوئے فوراً اٹھے اور ردی والے صندوق سے ایک بادامی رنگ کا قاعدہ نکال کر لائے اور استانی جی سے میرا پڑھنا ختم کروا کر خود پڑھانا شروع کیا۔ بس اس دن سے میں چل نکلی کہہ نہیں سکتی کہ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ تھا یا ہم دونوں کے درمیان کا جذباتی ہم آہنگی بہر حال وجہ کچھ بھی ہو اس دن سے پڑھائی میں میری بزدلی اور بدشوقی ختم ہو گئی۔ جس وقت تک میرا اسکول میں داخلہ نہ ہوا وہی مجھے پڑھاتے رہے۔ اردو انگریزی حساب سب ہی کچھ ان کی ذمہ داری تھی۔ چھوٹے موٹے مضمون لکھواتے اور سب کے سامنے پڑھوا پڑھوا کر سنتے اور بہت خوش ہوتے لیکن اسے بھی فطرت کی ستم ظریفی ہی سمجھیے میرا رجحان ان کے مذاق کے بالکل برعکس رہا بی اے کے بعد ان کا بہت اصرار تھا کہ میں ایم اے میں اردو لوں لیکن مجھے اپنے ادبی مذاق کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی سو میں نے معاشیات کا انتخاب کیا جگن بھیا کو اس وقت بہت خاصی مایوسی ہوئی۔

غرضیکہ جگن بھیا نے جب بچپن سے جوانی میں قدم رکھا ان کا شمار ہونہار نوجوانوں میں ہوا ۔ جائداد تھی گھر بندھا ۔ باپ سرکاری ملازم تھے ۔ شکل وصورت تھی صحت تھی ۔ تعلیم تھی کیا کمی تھی ۔ ہر لڑکی والے کی نظر ان پر تھی ۔ شادی کی باتیں شروع ہوئیں نانی کی خواہش تھی کہ دلہن کم عمر ہو ۔ ماں کی تمنا تھی کہ بہو خوبصورت ہو ۔ بہنوں کی آرزو تھی بھاوج پڑھی لکھی ہو ۔ باپ نے کہا کہ بیٹا جب تلک تعلیم سے فراغت حاصل کرکے اپنے پاؤں پر نہ کھڑا ہو شادی کا کوئی سوال نہیں نانی اور ماں دباؤ میں آکر چپ ہو گئیں ۔ بہنوں نے باپ کی بات کا وزن محسوس کیا اور معاملہ دب گیا ۔ جن لوگوں کے دلوں میں جگن بھیا کو داماد بنانے کی آرزو تھی ان کے دلوں میں رنجش نے جگہ لی ۔ رویہ اور رجحان بدلنے لگے جگن بھیا کی رنگین مزاجی اور حسن پرستی ۔ ہم عمر لڑکیوں اور بھاوجوں سے چھیڑ چھاڑ دلچسپی جو ان کے حسن اخلاق کی دلیل سمجھی جاتی تھی اب ان کی آوارگی سمجھی جانے لگی ان کے لاابالی پن کا جو ان کی معصومیت کا ثبوت سمجھی جاتی تھی غیر ذمہ داری میں شمار ہوا ۔ دھیرے دھیرے عیب جوئی ونکتہ چینی کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہوتا گیا اور خاندان کا یہ محبوب نوجوان محض تفریح کی صورت اختیار کرکے رہ گیا

جگن بھیا نے میٹرک امین آباد ہائی اسکول سے کیا ۔ اسی زمانہ میں ابا کا تبادلہ آگرہ کا ہو گیا تھا ۔ ۲۹ء میں سینٹ جانس کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا ۔ انجینیرنگ کی لائن اختیار کرنے کے خیال سے ریاضی کا مضامین میں انتخاب کیا ۔ آگرہ میں پڑوس فانی کا ملا ۔ اور کالج میں جذبی کا ساتھ ہوا طبیعت کا فطری رجحان جو ابتک اپنے کمروں کو پھولوں کے گلدان سے سجا کر رکھنے بچوں کو ڈرائنگ بنا کر دینے دیوالی پر میرے لیے گھروندا سجانے اور اچھی صورتیں دیکھ کر خوش ہونے پر مطمئن تھا ۔ ابھرا اور اپنا صحیح راستہ ڈھونڈھنے پر مائل ہوا شاعری کا دور شروع ہوا ۔ ۳۰ء میں ہم لوگ انھیں بورڈنگ چھوڑ کر علی گڑھ آگئے یہاں سے ان کی زندگی کا پہلا موڑ شروع ہوا وہ خود بھی اس موڑ پر کچھ وقفہ حیران پریشان ٹھٹک کر رہ گئے ۔ پڑھائی میں ابتری پیدا ہونی شروع ہوئی ۔ زندگی کا نظام درہم برہم ہونے لگا امتحان میں فیل ہوئے ۔ خود بتلاتے تھے کہ

امتحان کی کاپیاں بالکل سادی چھوڑ آتے تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں گرم کرتے رہتے تھے صبح کو پرچہ کیونکر حل ہوتا وہ بھی حساب کا گھبرائی کا گھر والے پریشان ہو اٹھے۔ انھیں علیگڈھ لے آئے۔ مضامین بدلے گئے فلسفہ معاشیات اور اردو کا انتخاب ہوا دو سال حاضریاں پوری نہ ہو سکنے کے سبب امتحان نہ دے سکے اللہ اللہ کر کے ۳۵ء میں بی اے کیا۔ ایم اے میں داخلہ لیا پرانی روایتوں کے خلاف پریوس کے اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میگزین کے ڈیٹر مقرر ہوئے داخلہ کے ایک دو مہینہ کے بعد دلی، ریڈیو اسٹیشن سے آواز کی سب اڈیٹری کی جگہ نکلی بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ جگہ رکھی ہے۔ مذاق کے مطابق ہے مواقع بار بار نہیں آتے درخواست دی اور لے لئے گئے علیگڈھ کے قیام کا دور مجّن بھائی ادبی زندگی اور شعور کا ذہنی تربیتی دور ہے زیادہ تر اچھی نظمیں اسی زمانے میں کہیں سردار بھائی سبطے بھائی اور بھائی اختر ان سب کا ایک گروہ تھا۔ بہر حال یہ سب نام ایسے ہیں کہ علی گڈھ یونیورسٹی کی تاریخ انھیں بھلا نہیں سکتی، کوئی اچھا مقرر تھا کوئی چوٹی کا ادیب تو کوئی محبوب شاعر سب اپنے اپنے ہتھیاروں سے فرسودہ نظام سے لڑ رہے تھے اور نئی قدروں کو زندہ رکھنے میں منہمک تھے علی گڈھ میں ایک نیا شعور پیدا ہو رہا تھا ایک نئی زندگی ابھر رہی تھی۔ لیکن مقرر کبھی کبھی اپنی زبان درازی سے دوسروں کو تکلیف پہونچا جاتا ہے ادیب کے قلم کی نوک کی تیزی کبھی کبھی کھٹکنے لگتی ہے۔ لیکن شاعر۔ وہ تو دلوں کا رازداں ہوتا ہے وہ تو روح کا پیغامبر ہوتا ہے اس کی بولی میٹھی ہوتی ہے اس کا پیام سچا ہوتا ہے پھر مجاز — جس کے یہاں "شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز" دونوں ہی ہیں جس کے دل میں باغی کی آگ۔ جس کی رگوں میں جوانی کا جوش جس کے گلے میں نغمہ سنج کا وفور تھا۔ جس نے انقلاب کے نعرہ لگانے کے بجائے انقلاب کے راگ گائے جس نے علیگڈھ کو اپنا چمن قرار دیا اور ایسا چمن جہاں

ہر آن یہاں صہبائے کہن ایک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی اُبلتی ہے
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں

شبنم، اپنے چمن میں سب ہی کو عزیز تھا۔ استادوں کا منظور نظر اور طلبا کیلیے باعث فخر۔ گرلس کالج میں ہر زبان پر اس بلبل کے راگ تھے۔ عورت کو نکتہ داں بتانے والا شاعر لڑکیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا مجازکی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں اس کا قد کتنا اچھا ہے وہ کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے کسی سے نسبت تو نہیں کرلی یہ لڑکیوں کے محبوب موضوع تھے۔

جگن بھیا دلی گئے اور ایک سال تک آواز کی سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے ملازمت کے زمانے میں گھر کا ایک پرانا ملازم ان کے ساتھ جو سیاہ و سفید کا مالک تھا پہلی کو تنخواہ اس کے سپرد کر دیتے اور پلٹ کر نہ پوچھتے کہ کب اور کیسے صرف ہو رہی ہے۔ ان کا گھر مہمانوں اور ٹھہرنے والوں کی وجہ سے ہمیشہ کیمپوں کی صورت اختیار کئے رہتا۔ شاعر ہونے کی رعایت سے شراب کی عادت تھی ہی ریڈیو اسٹیشن کے ماحول میں اور بھی چمکی لیکن اسوقت تک مجاز شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں تھا۔ اس کی زندگی "غرق شراب تند و تیز" نہ ہوئی تھی وہ اب تک علیگڈھ کا شاعر تھا۔ دلی کا شرابی نہ تھا بہرحال ریڈیو اسٹیشن کی اندرونی پالٹکس اور یوپی و پنجابیوں کی رسہ کشی نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ جگن بھیا ۱۹۳۶ء میں ملازمت ترک کرکے یہ کہتے ہوئے دلی سے رخصت ہوئے

رخصت اے دلی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بلب جاتا ہوں میں
جاتے جاتے تجھ سے اک پیماں کیے جاتا ہوں میں
اپنے عزم سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
تیری اس بزم میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤنگا اور باندازِ دگر آؤں گا میں

ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے اس مختصر سے عرصہ میں ماں بہن چاند سی دلہن لانے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں۔ تلاش جاری تھی۔ انتظامات ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ نادونوں میراثنوں کے سیلے جوڑے۔ پرجوں کیلیے لہنگے کرتیاں۔ پاسیوں کے لیے شال دوشالے خریدے گئے تھے

اور بس صرف چاند سی دلہن کا انتظار تھا کسے معلوم تھا کہ جگن بھیا کی زندگی کا افق ہمیشہ ہی ابر آلود رہیگا یہ چاند کبھی نہ نکلے گا ماں کے خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے بہنوں کی آرزوئیں کبھی بر نہ آئیں گی۔ انسان کی ضرورت تشنہ ہی رہے گی شاعر کا تصور کاغذی پیکر پہنے رہے گا جگن بھیا وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے تھے۔ شاعر سے عقیدت رکھی جا سکتی ہے بہت سے بہت محبت کی جا سکتی ہے۔ پر شادی تو نہیں پیٹ روٹیوں سے بھرتا ہے اشعار سے تو نہیں۔

دلی کے قیام کے دوران جگن بھیا کے دل نے ایک ایسی چوٹ کھائی جس کا زخم ان کی زندگی میں کبھی نہ بھر سکا۔ مرہم اور پھائے کا ذکر کیا۔ اس پر مزید چوٹیں لگتی گئیں۔ اور دھیرے دھیرے ان کا وجود ایک ناسور بن کر رہ گیا۔ ان کے اپنے لیے گھر والوں کے لیے اور سماج کے لیے انھوں نے محبت کی ایسی گہری ایسی پائیدار کہ آخر لمحے تک ان کے دم کے ساتھ رہی لیکن قسمت دیکھو ہاتھ بھی بڑھایا تو شجر ممنوعہ کی طرف ـــ دلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی۔ چنچل۔ البیلی اور خوب صورت لاڈ و پیار میں پلی ہوئی۔ عیش و عشرت کی عادی۔ ایک عدد بھاری بھرکم شوہر کی ملکیت یا مالک جو کچھ بھی سمجھیے۔ بیل منڈھے چڑھتی تو کیونکر۔ لیکن شاعر قدموں پر موتی بکھیرتا ہے۔ سر پر پھولوں کی بارش کرتا رہے اور بدلے میں چند مسکراہٹوں کا خواہشمند ہو تو سودا مہنگا تو نہیں شاعر بھی اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ ؎

میرا نغمہ باعث دلداری خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہ نشاط جاں تو ہے

لیکن برا ہو اس سماج کا۔ اس کی ٹیڑھی ترچھی سخت نگاہوں کا۔ اس کی انگشت نمائی کا ہر کھیل بگڑ کر رہ جاتا ہے انسان کی آہ کا ذکر کیا شاعر کی واہ بھی خطرے میں پڑ گئی۔ غریب انسان کا کہنا کیا گھٹ کر رہ گیا۔ بے چارے شاعر کا دل ٹوٹ گیا۔

یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربط شکستہ سے

بظاہر تو اتنا ہی ہوا لیکن قریب سے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کا پورا وجود سلگ کر رہ گیا اور سلگتے سلگتے ۱۹۴۲ء میں یہ آتش فشاں پھوٹ ہی نکلا۔ نروس بریک ڈاؤن کا یہ حملہ تھا۔ آج بھی مجھے وہ دن یاد ہیں۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھی اور لکھنؤ ہی میں تھی صبح سے شام تک اخبار سناتے سناتے یا پھر تسلیے اور کیٹس کے مجموعے سناتے سناتے میری زبان خشک ہوجاتی تھی ایک لمحہ کی خاموشی گوارا نہ تھی ایسا لگتا جیسے اندر شعلے اٹھ رہے ہوں جنھیں باتوں کے چھینٹوں سے بجھانے کی کوشش ہو۔ بس یہ خبط تھا کہ فلاں فلاں مجھسے شادی کرنا چاہتا ہے اور رقیب روسیاہ زہر دینے کی فکر میں ہے۔ سوائے ہم چند کے کسی کا پاس آنا گوارا نہ تھا محبت میں ناکامی کا انجام پورے بھیانک انداز سے تماشے دکھا رہا تھا۔ علاج معالجہ ہوا۔ چار چھ مہینے کے لیے بڑی بہن کے ساتھ نینی تال چلے گئے اور خدا خدا کر کے تندرست و توانا ہو کر واپس آئے اور پھر نارمل زندگی بسر کرنے کی کوشش میں ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے لگے۔ کچھ دن بمبئی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا۔ وہاں سے واپس ہوئے تو لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں نئے ادب' اور اس کے بعد پرچم' کی ادارت کرتے رہے۔ جب سب ساتھی ادھر ادھر بکھر گئے تو پھر دہلی واپس گئے اور ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی جگہ پر کام کرنا شروع کیا۔ ماں بہنوں نے دل کی چوٹ کا علاج کرنا چاہا۔ صفیہ آپا کی دوستوں میں سے ایک کو جگن بھیا سے کچھ ہمدردی اور کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے کچھ غیر مطمئن بھی تھیں صفیہ آپا کی تحریک پر انھوں نے جگن بھیا کو اپنانے پر آمادگی ظاہر کی شکل و صورت کے اعتبار سے نہ حسینوں میں شمار ہو سکتا تھا اور نہ ہی بدصورتوں میں۔ پڑھی لکھی تھیں۔ برسر روزگار تھیں لیکن طبیعتاً گھریلو قسم کی تھیں۔ جگن بھیا سے محض صفیہ آپا کے توسط سے بس ایک دو دفعہ کی ملاقات تھی۔ دل کے ملاپ کا تو کوئی سوال نہ تھا لیکن جگن بھیا نے سوچا کہ شاید سپردگی ہی میں نجات ہو اور زندگی کے منتشر تار یکجا ہو سکیں زخم رسنا بند کر دے۔ جذبات کا تو دلی میں گلا گھٹ ہی چکا تھا۔ جانے کس دل سے اپنے کو سمجھا کے سپرد کر پائے ہوں گے۔ بہرحال اس رشتے پر راضی ہو گئے اور بات یہاں تک پہنچی کہ ایک دفعہ...... کے سرپرست سے مل لیں اور معاملہ طے ہو جائے۔ اس زمانے میں جگن بھیا دلی لائبریری میں کام کرتے تھے

وہاں سے بلاسے گئے اور بردکھوے کے لیے سفر پر روانہ ہوسے۔ لاکھ سر پہ ٹیڑھی ترچھی ٹوپی رکھی اور استری شدہ شیروانی پہن کر جاذب نظر لگنے کی کوشش ہو لیکن ہزار ڈیڑھ ہزار کمانے والے کالج کے پرنسپل کے لیے ڈیڑھ سو روپیہ ہر مہینے پانے والے اسسٹنٹ لائبریرین میں کشش نہ پیدا ہوسکی خالی ہاتھ لوٹا دیے گئے۔ عورت کو آنچل سے پرچم بنانے کا پیام بہا بہت تھا لیکن اس پیام پر عمل کرنا —— معاملہ خطرناک تھا۔ ایک طرف ہزاروں کمانے والا سرکاری عہدیدار۔ دوسری طرف شکستہ خالی جیب والا شاعر۔ زر کی جیت ہوئی۔ فن ہی شکست کھا گیا۔ شاعر نے ایک دفعہ دل کی آواز پر قدم اٹھائے تھے اور منہ کے بل گر گیا تھا۔ اس مرتبہ اس نے عقل پر بھروسہ کیا اور تھم تھم کر کک احتیاط کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھایا پھر بھی ٹھوکر کھا گیا اور کھسیا کر رہ گیا۔ تدبیر کے پائے سنگین پر تقدیر نہ جھک سکی اور شاعر پر ۱۹۴۵ء میں دوسرا دیوانگی کا حملہ ہوا۔ اب وہ خود ہی اپنی عظمت کے راگ گاتا تھا۔ شاعروں کے نام کی فہرست تیار کرتا تھا اور غالب و اقبال کے نام کے بعد اپنا نام لکھ کر شجرہ ختم کر دیتا تھا۔ ڈاکٹروں کی کوشش اور جان توڑ تیمارداری اور دلجوئی سے کسی طرح قابو میں آ ہی گئے۔ لیکن زندگی کا ڈھرہ تو بدل نہ سکا۔ بیکاری اور تنہائی کا ساتھ رہا۔ شراب نوشی بڑھتی گئی زندگی میں تلخیاں بڑھتی گئیں اور وہ ان تلخیوں کو عرق سے ناب کرتے رہے۔ غرضکہ یہ سلسلہ جاری رہا اور اس جال میں جگن بھیا کی زندگی، وجود سب ہی کچھ الجھ کر رہ گیا۔ لوگوں نے کہا مجاز کا علاج شادی ہے پر یہ علاج ہوتا تو کیونکر۔ مجاز کی جیبیں خالی تھیں۔ جہاں بھی گھر والوں نے ہاتھ پھیلایا جواب ملا بڑے کے ساتھ تو نہیں البتہ چھوٹے کے ساتھ چاہو تو کر لو۔ وہی مجاز جو کبھی اس میدان میں آرزوؤں کا مرکز تھا کوڑا کرکٹ بن کر رہ گیا۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ ان مایوسیوں کو جگن بھیا سے چھپائے رکھ سکیں لیکن انھیں اندازہ ہو ہی جاتا اور سوائے اس کے کہ ان کی مسکراہٹ میں تھوڑی سی تلخی اور گھل جاتی کسی طرح بھی ظاہر نہ ہوتا کہ وہ زمانہ کی ناقدری کے شاکی ہیں۔ ماں بہنوں کی ہمت نے جواب دے دیا کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ایک طرف تو منہ توڑ جواب کا ڈر۔ دوسری طرف جگن بھیا کی رضامندی حاصل کرنے کا مسئلہ۔ کیونکہ تجربہ یہ ہو چکا تھا کہ جنسی بھوک خواہ کتنی شدید کیوں نہ رہی ہو۔ عورت کی

پرکھ اننے میں ختم نہ ہوئی تھی (صرف دیوانگی کے عالم میں ایسا ہوا کہ یہ بھوک پوری طرح سے ان پہ حاوی ہو گئی اور یہ پرکھ ختم ہوئی) ماں کے ایک قریبی عزیز نے اپنی لڑکی کے لیے منظوری دے دی تھی نیت کا حال خدا جانے۔ جانے اماں کی مایوسی اور پریشان حالی سے متاثر ہو کر یا جگن بھیا کی بربادحالی پر رحم کھا کر۔ یا پھر اکبر کو کچھ بوجھ کر اور ان کی قدرشناسی کے طور پر۔ بہر حال وہ راضی تھے۔ جگن بھیا سے پوچھا گیا کافی عرصہ تک ٹالا کیے اپنے دل کو ٹٹولتے رہے اور آخر کو ماں سے کہہ ہی دیا کہ ماں اس لڑکی میں میں کوئی کشش نہیں پاتا۔ اس کی قسمت پھوڑنے پر آپ کیوں تلی ہیں۔ یہ اپنی قسم کا ان کی زندگی میں دوسرا واقعہ تھا۔ ایک دفعہ علی گڈھ میں سنہ ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ایک متمول آزاد خیال گھرانے کی نہایت تیز طرار لڑکی نے صفیہ آپا کے ذریعہ ان سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس کا جواب جگن بھیا نے یہ دیا تھا "صفیہ مجھے کاغذی پھولوں سے دلچسپی نہیں" نفس مضمون دونوں جوابوں کا ایک ہے۔ لیکن جن حالتوں میں دیے گئے ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کا پہلا جواب اس وقت کا تھا جب وہ فلک شاعری پر ابھر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ترقی کا میدان دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ امیدوں کے رنگ آمیز پرچم لہرا رہے تھے۔ اس لیے اس جواب کو تکبر اور خودسری کی دلیل سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا دوسرا جواب اس وقت کا ہے جب وہ بالکل ٹوٹ چکے تھے در در سے ٹھکرائے جا چکے تھے جنسی تشنگی کا شکار تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی عورت سے زیادہ عورت کا تصور انھیں عزیز تھا اس جواب میں ایثار ہے۔ شعور ہے۔ کردار کی بلندی ہے بہر حال جگن بھیا کو ایک ساتھی نہ مل سکا جو ان کے دل کی آواز کو سمجھ سکتا۔ ان کو سہارا دے سکتا جس کی ڈھارس سے وہ زندگی کی تھکن دور کر سکتے۔ انھیں رفاقت نصیب تھی تو وہ شراب کی۔ وہی ان کا واحد سہارا تھی اندھیری رات کے مسافر کی منزل خود فراموشی کے دھندلکے میں اوجھل سی ہو گئی۔ انکے چہرے کی تابانی پر دھیرے دھیرے بے بسی کا پردہ گہرا ہوتا گیا۔ آنکھوں کی دمک کی جگہ اتھاہ گہرائی نے لے لی۔ جس میں امیدیں آرزوئیں دفن ہوں۔ یاس و محرومی جھانک رہی ہو۔ کس غضب کی گہرائی تھی ان آنکھوں میں اور کیا کچھ پوشیدہ تھا ان میں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کا دل بجھ سا گیا ہو۔ جیسے انہیں

ابھرنے کی خواہش باقی ہی نہ ہو۔ غرضکہ سہم سکڑ کر بقول عصمت آپا کے وہ بالکل ٹھٹھو رہ گئے۔ کچھ بھی
ایسا جو شرابی ہو وہ شرابی بھی ایسا جسے پیتے وقت اس کا بھی ہوش نہ رہتا ہو کہ کتنی پی جائے اور کیسی پی جائے۔ میں نے اکثر چاہا کہ
ان سے منت کروں، التجا کروں کہ وہ اپنے کو سنبھال لیں لیکن جب بھی میں نے ارادہ کیا میری ہمت جواب
دے گئی۔ آوارہ کا مصنف اتنا سخت دل نہیں ہو سکتا۔ ماں کے آنسوؤں سے نہ پگھل سکے جس وقت
ماں انھیں سمجھاتیں۔ زندگی کا اونچ نیچ سمجھاتیں۔ کوئی بگڑی ہوئی حالت کا احساس دلاتیں۔ اپنی
نسبت کا باپ کی عزت کا واسطہ دیتیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتاتے کہ ماں کے آنسوؤں کا
ہر قطرہ ان کے دل پر نشتر کی طرح لگتا۔ پھر بھی نہ جانے وہ کس الجھاوے میں تھے جس سے اپنے کو
نہ نکال پائے۔ غرضکہ وہی جگن بھیا جو ہماری امیدوں آرزوؤں کا مرکز تھے پریشانیوں اور الجھنوں
کا مرکز بن کر رہ گئے۔ کبھی ہم ان کی شراب نوشی اور خود فراموشی پر جھنجھلاتے۔ تلخ ہوتے۔ جی چاہتا
کہ انھیں اتنا جھنجھوڑیں کہ ان کے ہاتھ کے فریب بے خودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر جھنجھنا کر ٹوٹ
جائیں اور وہ چونک کر پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑیں۔ کبھی جی چاہتا کہ ان سے چمٹ کر اتنا روئیں
کہ ہمارے آنسو ان کے جمود کو بہالے جائیں اور وہ پھر یہ کہہ اٹھیں ؎

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ایسا لگتا ہے جیسے ان کا عدم وجود سب برابر ہو۔ جیسے وہ ہمارے درمیان ہوتے ہوئے
بھی ہماری پہنچ سے باہر ہوں جیسے وہ بہت دور خلاؤں میں گم ہو رہے ہوں۔ پتہ ہی نہ چلا کہ انکے
دل کی گہرائیوں میں کیا پوشیدہ ہے۔ چوٹیں کھاتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔ پینتالیس سال
کی عمر میں ایک دفعہ بھی تو ایسا نہ ہوا کہ انھوں نے ایک دفعہ بھی زندگی کی شکایت کی ہو یا کسی کا شکوہ
کیا ہو۔ زندگی میں ایسا زبردست اعتماد اور اپنی زندگی سے اتنی بے نیازی۔ تلخیاں سہتے عمر بیتی
اور مزاج میں ذرا تلخی نہ پیدا ہوئی۔ کبھی تو کسی بات پر جھنجھلا اٹھتے۔ بیزاری کا اظہار کرتے۔ سب کچھ
خاموشی سے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۲ء میں تیسرا اور آخری نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا اور

اس غصب کا شدید کہ خدا کی پناہ گھر میں ٹکنا ہی گوارا نہ کیا۔ دلی کے گلی کوچوں کی خوب خوب خاک چھانی جنسی محرومی کے تماشے دلی والوں نے خوب خوب دیکھے۔ جس انسان نے عالم ہوش میں کبھی بھی کوئی چھچھوری اور رکیک حرکت نہ کی تھی وہ ہر لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ گھر والے ہر لمحہ اس خبر کے منتظر تھے کہ مجاز موٹر سے کچل گیا۔ ٹھٹھرا ہوا سڑک پر پایا گیا۔ انجام یہی ہونا تھا لیکن کچھ دن ٹھہر کر۔ وہ اسی سترسالہ ماں جس نے بیٹے کے مستقبل کے نہ جانے کتنے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ جانماز پر بیٹھ بیٹھ کر دعائیں مانگتی تھی۔ یا الٰہی اسے اٹھالے یا مجھے۔ جو میں اس طرح کے تماشے نہ دیکھوں۔ دلی سے جوش صاحب کا خط آیا کہ مجاز کو آگرہ بھیج دیا جائے۔ مجاز اور آگرہ کا پاگل خانہ۔ دل پر کیسی چوٹ لگی لیکن مجاز پاگل تھا۔ اس حقیقت سے کیونکر انکار ہو سکتا تھا۔ پاگل کو آخر کہاں تک اور کیسے بھگتا جاتا۔ جوش صاحب کو میں نے خط لکھا کہ اپنے رسوخ استعمال کر کے رانچی میں جگہ دلوا دیں۔ جوش صاحب کرخفہ ہو گئے نہیں۔ بہرحال میں جواب کے انتظار ہی میں رہی۔ ڈاکٹر ڈیوس رانچی اسپتال کے انچارج سے براہ راست خط وکتابت کی جگن بھیا کی لائف ہسٹری لکھ کر بھیجی۔ شاید ان کی زندگی کے واقعات سے متاثر ہو کر اس نے بی کلاس وارڈ میں ایک بیڈ دے ہی دیا۔ ورنہ ایسے اسپتالوں میں بغیر سفارش کے جگہ کب ملتی ہے۔ مجاز کو بہ مشکل رانچی بھیجا گیا۔ بوڑھے باپ نے اپنی پونجی کی آخری کوڑی انھیں بچانے کے لیے لگادی۔ اور چھ مہینے بعد وہ صحیح کر آگئے ان کی واپسی کے ایک مہینے بعد صفیہ آپا کا انتقال ہوا اس صدمہ کا اثر ان پر بجلی کے شاک کا سا ہوا۔ جیسے یکدم چونک پڑے ہوں۔ ایک دفعہ پھر ان میں ذمہ داریوں کا احساس چمکا۔ جاد و ادیس کی پڑھائی و دیگر مشغلوں میں دلچسپی لینا ان کی دلجوئی کرنا زیادہ تر وقت گھر پر گزارنا۔ شراب سے قطعی پرہیز رات کو جی بھر کر سوتے۔ دن میں ہنستے کھیلتے۔ باتیں کرتے۔ گھنٹوں سب کے ساتھ تاش کھیلا کرتے۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ تصویریں بنا بنا کر سب میں بانٹتے۔ چھوٹے بچوں کو ایک دوسرے سے لڑواتے۔ ایسا لگتا جیسے جاد و ادیس عشو و فی کے بچپن میں پھر ان کا بچپن دہرا رہا ہو جگن بھیا پھر بیس پچیس سال پہلے والے جگن بھیا بن گئے ہوں لیکن بنیادیں تو بدلی نہ تھیں۔ زندگی کا یہ نیا ڈھانچا کیونکر کھڑا رہتا کاش اس وقت ان کا ہاتھ کسی

تھام لیا ہوتا۔ ان کے لیے کسی نے "ساز بیداری" اٹھا لیا ہوتا۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا۔ ان کی موت کو ان کی زندگی کا نقطۂ عروج بننا تھا۔ انھیں تو یہ دکھانا تھا کہ جیتے جی مرنا کسے کہتے ہیں۔ اور مر کر بھی کیسے جیا جا سکتا ہے۔ غرضکہ چھ مہینے تک جگن بھیا بالکل نارمل رہے۔ چاہنے والے ساتھی اور بچے دوست اپنے اپنے کام دھندوں میں ادھر ادھر لگے ہوئے تھے ان کی ظرافت طبع اور بذلہ سنجی سے لطف اٹھانے والے نام نہاد دوستوں اور ان کی شاعری کو کھلونا سمجھ کر دل بہلانے والے نادان ادب نوازوں نے انھیں پھر شراب خانہ کی طرف رجوع کرنا شروع کیا۔ وہاں قدم رکھنے کے بعد ان کے قدم تیزی سے اس طرف اٹھنے لگے۔ راتوں کو مدہوشی کے عالم میں دو تین بجے گھر واپس آتا۔ دن میں دس گیارہ بجے خمار کے عالم میں اٹھتا۔ منھ ہاتھ دھو کر برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ پر ناشتہ کرتا تھوڑی دیر اخبار کے ورق ادھر ادھر پلٹتا۔ یہ تھا ان کا پروگرام اس درمیان میں موقع پا کر ماں کوشش کرتیں کہ رات کی کیفیت کا انھیں احساس دلائیں اور آئندہ کے لیے احتیاط پر آمادہ کریں چپ چاپ سب کچھ سنا کرتے۔ ایک خاموشی ہر بات کا جواب تھی جب اندرونی کشمکش برداشت سے باہر ہو جاتی تو اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے اور پھر سب بچوں کو یکجا کر کے ان کے ساتھ کھیل میں اپنے کو بھولنے کی کوشش کرتے۔ گھر میں ماشاءاللہ بچوں کی تعداد بہت طویل تھی۔ سات عدد بچے تھے دو صفیہ آپا کے۔ دو میرے اور تین میرے بھانجے کے۔ ان سب میں بھانجے کا تین سالہ بچہ عرفی انھیں عزیز تھا۔ اماں کہتی ہیں کہ اس کا بچپن بالکل جگن بھیا جیسا ہے بہت شریر اور بے خبر اس سے خود کو استاد کہلاتے اور کہتے کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ اس کو اپنے پاس کھڑا کر لیتے تب کھانا کھاتے۔ وہ اپنی گندی گندی انگلیوں سے سالن کے پیالے کی بوٹی کی چھین جھپٹ کیا کرتا آخر کو آدھی آدھی پر معاملہ طے ہوتا۔ خود بھی بہت گندے طریقے پر کھانا کھاتے۔ چاول میں دال سالن ملا کر انگلیاں اس قدر تیزی سے چلاتے گویا کسی ساز پر چل رہی ہوں۔ یہاں تک کہ پلیٹ میں چھپ چھپا پیدا ہو جاتا تب منھ میں لقمہ لے جاتے۔ منھ ذرا کم کھلتا تھا اس لیے کھاتے وقت ہمیشہ ایک قسم کی شڑکنے کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ سب بچے ان کو چچا دادا کہتے تھے۔ عالم ہوش میں بھی وہ ایک طرح کی

خود فراموشی ان پلوں میں کھو کر حاصل کر لیتے تھے۔ شام ہوتی۔ کپڑے بدلتے۔ کپڑوں کی صفائی اور نفاست کا خیال ہر عالم میں رہا۔ تیسرے دن ضرور کپڑے تبدیل کرتے تھے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلتے۔ ایسا لگتا کہ جیسے سوچ رہے ہوں کہ جاؤں کہ نہ جاؤں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہفتہ ہفتہ گھر سے نہ نکلتے۔ لیکن آخر ایسے کب تک گذر ہوتی۔ آخر کو چل ہی دیتے۔ شاید اس ارادے کے ساتھ کہ اب اپنے کو کھو کر واپس نہ آؤں گا۔ لیکن باہر جا کر انکی قوت ارادہ بالکل جواب دے جاتی اور پھر اسی بدحواسی میں واپس آتے کبھی پیدل اور کبھی رکشا میں۔ کھانا۔ سگریٹ اور پان سمیت انکے کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ یہ مدتوں پرانا معمول تھا۔ اگر کچھ ہوش میں ہوتے تو کھا لیتے ورنہ پھر صبح کھاتے غرض کہ دن کو بیکاری اور رات کو شراب نوشی کا زہر گھن کی طرح ان کی زندگی کو لگتا رہا۔ اور ہم سب یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ آخر ایک دن سب نے سن لیا کہ مجاز مر گیا۔ پتھروں پر سسک سسک کر ٹھنڈ میں ٹھٹھر کر یہ مجاز کی موت تھی۔ فنکار کی موت۔ شاعر کی موت۔ کہانی پوری ہوئی۔ ڈرامہ ختم ہوا۔ پردہ گر گیا۔ پر ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیسے ہوا۔ یہ خلش یہ ٹھسک ہر حساس دل و دماغ میں باقی رہ گئی۔

مجاز

اسلوب احمد انصاری

نئی نسل کے اردو شاعروں میں مجاز کا نام خاصا جانا پہچانا ہے ان کی شاعری پر کوئی مقررہ لیبل چسپاں کرنا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ایک طرف تکنیک کے معاملے میں وہ پرانی روش سے سرمو انحراف نہیں کرتے، اور انھوں نے جدید وضع کے تجربوں سے ہمیں روشناس نہیں کرایا۔ اور دوسری جانب ان کی بیشتر نظمیں مواد اور روح کے اعتبار سے انقلابی نہیں محض غنائی ہیں۔ ان کی مقبولیت کا راز انہی ہلکی پھلکی، خوشگوار اور تندرست رومانی نظموں میں ہے۔ ان کے مزاج کے عناصر ترکیبی میں جام و مینا، تیغ و سناں حسن و نغمہ، سب کی آمیزش ہے لیکن ان کے مطبوعہ کلام کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ پتہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کی شاعری کے خط و خال کی تشکیل ایک رچے اور نکھرے ہوئے رومانی نقطۂ نظر اور افتادِ طبیعت سے ہوئی ہے۔ ان کا کلام سرتاپا اسی شیفتگی و سرمستی جذب و کیف اور وفورِ وارفتگی میں ڈوبا ہوا ہے جو ان کی شخصیت میں اس حد تک نمایاں ہے، اس میں ذرا شبہہ نہیں کہ انھوں نے نہ صرف ایسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جن پر طبع آزمائی کرنا ترقی پسندی کی علامت ہے۔ بلکہ خالص رومانی نظموں میں بھی ماحول سے ناآسودگی کے جذبہ نے خود ساختہ پابندیوں کی قدم قدم پر شکست و ریخت کی ہے ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا، کیونکہ کوئی ادیب یا شاعر محض خلا میں زندگی بسر نہیں کرسکتا، اور نہ تخیل کے نادیدہ پروں پر اڑ کر کسی مصنوعی بہشت میں زیادہ عرصہ تک سانس لے سکتا ہے۔ پھر بھی مجھے اپنی اس رائے کے اظہار میں پس و پیش نہیں کہ ہم عصری اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل کا شعور و احساس نہ مجاز کے شعری ادراک کا کوئی قابلِ ذکر جزو ہے اور

یہ پر شعور و احساس فکر اور نغمے میں تبدیل ہوا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ انھوں نے اپنے مشاہدات اور مطالعہ کو وسعت دینے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اپنی تشنگی کو اُس کاوشِ ذہنی سے مرصع و مزین ہونے کا موقع نہیں دیا، جو جذبات کو فکر میں تبدیل کرنے اور فکر کو خواب کی سی رومانیت اور جذبہ کی سی تازگی، طرفگی اور رعنائی بخشنے کے لیے ضروری ہے۔ پھر بھی مجاز کی مقبولیت ان کے اکثر ہم عصر شعراء کے مقابلہ میں قابلِ رشک ہے۔ ممکن ہے اس لیے ہو کہ ان کے تجربات محدود ہونے کے باوجود ذاتی اور اصلی ہیں۔ اور اگر ایک طرف ان کے بیان میں صفائی، نفاست اور پرکاری ہے تو دوسری طرف اُن میں اُبلتے ہوئے پہاڑی چشمہ کا جوش و خروش اور بادۂ تند و تیز کی حرارت اور سرخوشی ہے۔

حسن کا احساس اور جسمِ انسانی کے مشاہدہ اور اس کی کیفیات کا بیان مجاز کی نظموں میں شروع ہی سے ملتا ہے۔ ان کے مشاہدہ میں تفصیل، تناسب اور میناکاری برابر نمایاں رہی ہے اور گو حسیات کی اس شاعری میں کوئی گہرائی نہیں، تاہم اس میں ایک خوش گوار قسم کی لذتیت ہے۔ جسے شاعر نے سرپردوں میں چھپائے بغیر برجستگی اور ایک حد تک والہانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ رنگ و بو کی اس شاعری میں بیان نہ صرف مشاہدہ کی صحت اور الفاظ کے مناسب انتخاب سے پڑتی ہے۔ بلکہ پیکر نگاری (IMAGERY) کے اس فن سے بھی جس پر شاعر کو پوری قدرت حاصل ہے۔ جذبہ کو موزونیت اور دل کشی کے ساتھ متشکل کر دینا ہر اچھے شاعر کا گراں قدر جوہر ہے۔ نادر تشبیہوں کی تلاش، جو ذہن میں تازگی اور نظر میں وسعت پیدا کرنے میں ممد ہوتی ہیں۔ مجاز کے شاعرانہ عمل کا ایک خاص وصف ہے چند مثالوں سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی ؎

چمک تاروں کی چشمِ سرمگیں میں
جھلک چاندی کی جسمِ مرمریں پر

نشاطِ رنگ و بو سے چور آنکھیں
شرابِ ناب سے لبریز ساغر

وہ محرابیں سی سینوں پر نمایاں
فضائے نور میں کیوپڈ کے شہپر

نفس کی آمد و شد سے تلاطم
شبِ مہتاب میں جیسے سمندر

اللہ اللہ وہ پیشانیِ سیمیں کا جمال — رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
عارضِ گرم پہ وہ رنگِ شفق کی لہریں — وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات
نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار — وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

سحر و اعجاز لیے جنبشِ مژگانِ دراز — خندۂ شوخ جمالِ دُرِ خوش آب لیے
ضو فگن روئے حسیں پر شبِ مہتابِ شباب — چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لیے
نشۂ ناز جوانی میں شرابور ادا — جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب لیے
زلف شب رنگ لیے صندل و عود و عنبر — خمِ ابروئے حسیں دیر کی محراب لیے
لب گل رنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں — شوخیٔ برق لیے لرزشِ سیماب لیے

یہ روپہلی چھاؤں، یہ آکاش پر تاروں کا جال — جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال — اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز نظم کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات میں وہ ہمہ گیری، ارتکاز (CONCENTRATION) اور گہرائی نہیں پیدا کر سکتے، جو اچھے غزل گو شاعر کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجز دو تین غزلوں کے ان کی بیشتر غزلیں پڑھنے والے کے ادراک میں کوئی تموّج نہیں پیدا کرتیں۔ لیکن نظم کے لیے جس منطقی تسلسل پھیلاؤ اور جزئیات نگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور خیال جس طرح لمحہ بہ لمحہ اور منزل بہ منزل نظم کی بساط پر محیط ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ ان کی نظموں میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ابتدائی نظموں میں "رات اور ریل" جو اکثر خصوصیات کی بنا پر ایک معمولی بیانیہ نظم ہے۔ تخیل کی اس ان تھک اور مستقل پرواز کا پتہ دیتی ہے جو آگے چل کر "آوارہ" "خوابِ سحر" اور "ایک غمگین یاد" جیسی نظموں میں ظاہر ہوئی۔ ترقی پسند خیالات کی نمائندگی جو نظمیں کرتی ہیں، ان میں دو نظمیں "نوجوان خاتون سے" "اور پردہ اور عصمت" اچھی ہیں۔

پہلی نظم کے چند اشعار یہ ہیں ؎

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا — خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا

دلِ مجروح کو مجروح کرنے سے کیا حاصل — تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

لیکن مجاز کی بیشتر انقلابی نظمیں، اعلیٰ اور کامیاب شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتیں کیونکہ ان نظموں میں وہ شاعر کے منصب کا احترام کم کرتے ہیں۔ انقلاب کا ڈھنڈورا زیادہ پیٹتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جگہ جگہ اس بغاوت کی آگ کے شعلے ملتے ہیں جن سے ہر نوجوان اور حساس شاعر کا دل آتشکدہ بنا ہوا ہے۔ یہ اضطراری ردِ عمل بھی اپنی جگہ قابلِ احترام ہے لیکن بغاوت کے شعلے کو تعمیری انقلاب کے نغمہ میں تبدیل کرنے کے لیے جس ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجاز اس سے گذرنا نہیں چاہتے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ داری کے نظامِ کہنہ کے خلاف بیزاری اور نفرت تو ضرور محسوس کرتے ہیں، لیکن اپنے محسوسات کا تجزیہ نہیں کر سکتے اور اسی لیے کسی راستے کی طرف رہنمائی کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ان تمام خامیوں کا سرچشمہ تفکر کا وہ فقدان ہے، جو ہمیں اُن کے یہاں تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ "انقلاب" "اندھیری رات کا مسافر" "سرمایہ داری" "آہنگِ نو" ان سب نظموں میں وہی خامی کھٹکتی ہے، جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ مجاز کا انقلاب کا تصور سراسر جذباتی ہے جو صرف ایک بے معنی تخریب پر منتج ہوتا ہے۔ وہ نہ انقلاب کے اسباب و آثار اور اس کی قوتوں پر کوئی نظر رکھتے ہیں اور نہ ان کا شاعرانہ اندازِ فکر کسی سمت کی طرف کوئی اشارہ کرتا ہے۔ نظم "انقلاب" کے آخری حصہ میں انھوں نے لفظ "خون" کا بہیم استعمال کیا ہے "آوارہ" میں بھی جو اُن کی سب سے اچھی نظموں میں ہے اور جو اُن کی انفرادی روح کے کرب و غم اور متوسط طبقہ کی ذہنی، جذباتی اور معاشی غیر اطمینانی اور غیر آسودگی کی بہت صحیح ترجمانی کرتی ہے، یہ تخریبی میلان بہت نمایاں ہے جن آخری بندوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، وہ پوری نظم کی ہئیت سے ایک گہرا، اندرونی صناعانہ ارتباط ضرور رکھتے ہیں لیکن اگر ہم انھیں ان کے سیاق و سباق سے الگ کرکے ان کا رشتہ شاعر کے فکری نظام سے جوڑنے کی

کوشش کریں، تو ان کی اہمیت بہت ہی کم رہ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو انقلاب کا جو تصور جوش نے دیا تھا اسے مجاز نے بغیر کسی تنقیدی محاکمے کے قبول کر لیا ہے اور چونکہ وہ طبعاً غور و فکر کے عادی نہیں ہیں اس لیے نہ اس کے حسن و قبح پر ان کی نظر پڑتی ہے، نہ اس میں وہ کوئی ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں مجاز کے پورے کلام میں صرف دو مقامات ایسے نظر آتے ہیں جہاں انھوں نے اس جذباتی دنگل سے گریز کر کے چند ایسے اچھے اشعار کہے ہیں ؎

تقدیر کچھ ہو کاوشِ تدبیر بھی تو ہے	تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے	آ منتظر ہے عشرتِ فردا ادھر بھی آ

"خواب سحر" میں مجاز کا لہجہ قدرے متوازن اور خیال انگیز ہو گیا ہے۔ اور اسی لیے اس نظم کے آخری اشعار سے بھی اُسی اجتماعی شعور کا اظہار ہوتا ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے کی ہم اکثر نظموں میں بار بار کوشش کرتے ہیں لیکن جسے خطیب کے نطق کی کڑک بار بار ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے ؎

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی	آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام	آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں	زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے	جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

مجاز کا مایۂ افتخار ان کی رومانی نظمیں ہیں ان کی خوبی اور دلکشی اس میں ہے کہ وہ ہمیں جذبات کی تنگنائے سے نکال کر ایک صحت مند لطیف اور دلنواز ترنم میں گم کر دیتی ہیں۔ ان میں فراوانی، اضطراب، انفرادیت مرکزیت سے گریز، جذباتیت، تخئیل کی شادابی اور بیداری غرض وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جن سے رومانیت عبارت ہے۔ یہ نظمیں اصلی اور واقعی جذبات اور حالات سے تحریک اور نمو حاصل کرتی ہیں اور ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حسن و عشق کی واردات نے شاعر کے حساس اور بے چین دل کو ضرور متاثر کیا ہے لیکن مجاز کی بیشتر رومانی نظموں میں ایک خامی تو یہ ہے کہ شاعر کے تجربات بہت محدود ہیں۔ ان کی نظمیں "اعتراف" اور "تبان حرم" ان تجربات کی غمازی کرتی ہیں جو ان کی رومانی شاعری کا مرکزی تجربہ

پہلی نظم کے چند اشعار یہ ہیں ؎

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتیں تو اچھا تھا — خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتیں تو اچھا تھا
دلِ مجروح کو مجروح کرنے سے کیا حاصل — تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتیں تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتیں تو اچھا تھا

لیکن مجاز کی بیشتر انقلابی نظمیں، اعلیٰ اور کامیاب شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتیں کیونکہ ان نظموں میں وہ شاعر کے منصب کا احترام کم کرتے ہیں۔ انقلاب کا ڈھنڈورا زیادہ پیٹتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جگہ جگہ اس بغاوت کی آگ کے شعلے ملتے ہیں جن سے ہر نوجوان اور حساس شاعر کا دل آتشکدہ بنا ہوا ہے۔ یہ اضطراری ردعمل بھی اپنی جگہ قابلِ احترام ہے لیکن بغاوت کے شعلے کو تعمیری انقلاب کے نغمہ میں تبدیل کرنے کے لیے جس ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجاز اس سے گذرنا نہیں چاہتے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ داری کے نظامِ کہنہ کے خلاف بیزاری اور نفرت تو ضرور محسوس کرتے ہیں، لیکن اپنے محسوسات کا تجزیہ نہیں کر سکتے اور اسی لیے کسی راستے کی طرف رہنمائی کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ان تمام خامیوں کا سرچشمہ تفکر کا وہ فقدان ہے، جو ہمیں اُن کے یہاں تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ "انقلاب"، "اندھیری رات کا مسافر"، "سرمایہ داری"، "آہنگِ نو" ان سب نظموں میں وہی خامی کھٹکتی ہے، جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ مجاز کا انقلاب کا تصور سراسر جذباتی ہے جو صرف ایک بے معنی تخریب پر منتج ہوتا ہے۔ وہ نہ انقلاب کے اسباب و آثار اور اس کی قوتوں پر کوئی نظر رکھتے ہیں اور نہ ان کا شاعرانہ اندازِ فکر کسی سمت کی طرف کوئی اشارہ کرتا ہے۔ نظم "انقلاب" کے آخری حصّہ میں انھوں نے لفظ "خون" کا پیہم استعمال کیا ہے "آوارہ" میں بھی جو اُن کی سب سے اچھی نظموں میں ہے اور جو اُن کی انفرادی روح کے کرب و غم اور متوسط طبقہ کی ذہنی، جذباتی اور معاشی غیر اطمینانی اور غیر آسودگی کی بہت صحیح ترجمانی کرتی ہے، یہ تخریبی میلان بہت نمایاں ہے جن آخری بندوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، وہ پوری نظم کی ہئیت سے ایک گہرا، اندرونی، صناعانہ ارتباط ضرور رکھتے ہیں لیکن اگر ہم انھیں ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کا رشتہ شاعر کے فکری نظام سے جوڑنے کی

کوشش کریں، تو ان کی اہمیت بہت ہی کم رہ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو انقلاب کا جو تصور جوش نے دیا تھا اسے مجازؔ نے بغیر کسی تنقیدی محاکمے کے قبول کر لیا ہے اور چونکہ وہ طبعاً غور و فکر کے عادی نہیں ہیں اس لیے نہ اس کے حسن و قبح پر ان کی نظر پڑی ہے، نہ اس میں وہ کوئی ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں مجازؔ کے پورے کلام میں صرف دو مقامات ایسے نظر آتے ہیں، جہاں انھوں نے اس جذباتی ردِ عمل سے گریز کر کے چند ایسے اچھے اشعار کہے ہیں ؎

تقدیر کچھ ہو کاوشِ تدبیر بھی تو ہے — تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے — آ منتظر ہے، عشرتِ فردا ادھر بھی آ

"خوابِ سحر" میں مجازؔ کا لہجہ قدرے متوازن اور جیاں انگیز ہو گیا ہے۔ اور اسی لیے اس نظم کے آخری اشعار سے بھی اُسی اجتماعی شعور کا اظہار ہوتا ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے کی ہم اکثر نظموں میں بار بار کوشش کرتے ہیں لیکن جسے خطیب کے نطق کی کڑک بار بار ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے ؎

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی — آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام — آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں — زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے — جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

مجازؔ کا مایۂ افتخار ان کی رومانی نظمیں ہیں ان کی خوبی اور دلکشی اس میں ہے کہ وہ ہمیں جذبات کی تنگنائے سے نکال کر ایک صحت مند لطیف اور دلنواز ترنم میں گم کر دیتی ہیں۔ ان میں فراوانی، اضطراب، انفرادیت مرکزیت سے گریز، جذباتیت، تخئیل کی شادابی اور بہاؤ غرض وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جن سے رومانیت عبارت ہے۔ یہ نظمیں اصلی اور واقعی جذبات اور حالات سے تحریک اور نمو حاصل کرتی ہیں اور ان سے یہ پتہ چلتا ہے، کہ حسن و عشق کی واردات نے شاعر کے حساس اور بے چین دل کو ضرور متاثر کیا ہے لیکن مجازؔ کی بیشتر رومانی نظموں میں ایک خامی تو یہ ہے کہ شاعر کے تجربات بہت محدود ہیں۔ ان کی نظمیں "اعتراف" اور "شبابِ حرم" ان تجربات کی غمازی کرتی ہیں جو ان کی رومانی شاعری کا مرکز و محور ہیں

اور جن سے ان کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ مگر انفرادی مسرت و غم کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتے تاوقتیکہ ان کے بہت ہی مادی اور معنی خیز پہلوؤں کو اجاگر نہ کیا جائے اور ان میں عمومیت کا رنگ نہ بھرا جائے۔ ایسی نظمیں جو صرف محدود عشقیہ جذبات و معاملات کا سحر آفرین بیان ہوں، ایک خاص عمر اور ذہنی نشو و نما کے لوگوں ہی کے لیے اپنے اندر جذب و قبول کی طاقت رکھتی ہیں دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مجاز کی بیشتر نظمیں ایک منظم اور تربیت یافتہ تخئیل کی پرواز کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتیں مجاز کے جذبات میں سرمستی اور سرشاری کی کمی نہیں ہے ـــــ مگر ناپختہ جذبے کی بڑھی اور دوامی شاعری میں کوئی وقعت نہیں ہوتی تاآنکہ وہ فکر کے معمول (MEDIUM) سے گذر کر ایک طرح کا توازن، پختگی اور ادراک پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت نہ پیدا کرے۔ مجاز کے پورے مجموعے میں سے صرف چند نظمیں یعنی "ایک غمگین یار" "شہر نگار" "نادام" "عیادت" اور دو تین غزلیں ایسی ہیں جن میں ہمیں جذبہ کی صداقت کے ساتھ ہی اس کی تہذیب و تکمیل کا بھی کسی حد تک احساس ہوتا ہے ـــ

آج پھرتا بہ چمن در پئے گلہائے چمن ــــ گنگناتا ہوا زنبورِ بہار آہی گیا
گیسوؤں والوں میں ابرو کے کمانداروں میں ــــ ایک صید آہی گیا ایک شکار آہی گیا
خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحر ــــ اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آہی گیا

بیمار کے قریب بہ صد شان احتیاط ــــ دل داریٔ نسیم بہاراں لیے ہوئے
زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی ــــ اکِ کاروانِ نکہت شبستاں لیے ہوئے
آہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز ــــ ظلمت کدہ میں شمع فروزاں لیے ہوئے
ملتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی ــــ کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لیے ہوئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجئے ہم صورت جاناں بھول گئے
اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

ساقیِ گلفام باصد اہتمام آ ہی گیا
نغمہ بر لب، خم بہ سر، بادہ بجام آ ہی گیا
نیری دنیا جگمگا اٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پر مرا ماہِ تمام آ ہی گیا
پھر کسی کے سامنے چشمِ تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگِ احترام آ ہی گیا

اثر لکھنوی نے مجاز کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو شاعری میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے انقلابی بھیڑیئے اٹھا لے گئے۔ یہ رائے دو بہت ہی غلط مفروضوں پر مبنی ہے۔ مجاز کی شاعری ہلکی پھلکی غنائی شاعری ہے جس میں اس تفکر، اس فلسفۂ جمال، اس بصیرت کا، جو زندگی کے غموں کو انگیز کرنے اور گوارا بنانے سے پیدا ہوتی ہے، اور جو انگریزی رومانی شاعروں میں اس درجہ پائی جاتی ہے دور دور بھی نشان نہیں ملتا۔ رومانی شاعری سے قطعِ نظر، مجاز کی انقلابی شاعری بھی فکر و فہم کی جس کمی کا پتہ دیتی ہے، اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ دراصل اردو کے کسی رومانی شاعر کا کیٹس اور شیلے سے موازنہ کرنا فی الحقیقت اپنی علمیت کا مظاہرہ کرنا اور ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ ہمارے اردو شاعروں اور مغربی شاعروں میں مزاج و مذاق کا فرق بہت بین ہے پھر یہ بات بھی کچھ کم لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ ہماری زندگی بھی اتنی رنگا رنگ، پیچیدہ، متنوع، نئی نئی ذہنی اور تمدنی تحریکوں کی دولت سے مالا مال اور ارتقاء کے امکانات کے لیے چشم براہ نہیں رہی ہے جتنی اہلِ مغرب کی زندگی۔ ہمارے شاعروں میں غالب اور اقبال کو چھوڑ کر کسی کے کلام میں بھی متضاد عناصر کی وہ کارفرمائی شمولیت (INCLUSIVENESS) کا وہ جوہر اور پیچ در پیچ تہذیب کا وہ عکس نہیں ملتا جو انگریزی کے بیشتر ممتاز شعرا میں پایا جاتا ہے۔ جس سے میری مراد یہ ہے کہ ان شاعروں کے ذاتی مطالعہ، مشاہدات و تجربات اور ذہنی و جذباتی ردعمل کی ہم آہنگی کی بدولت ان کے کلام میں معنی و مفہوم کی جتنی تہیں ملتی ہیں

اور وہ ہمارے فکر و تخئیل کی سیرابی کے لیے جتنی وافر غذا فراہم کرتے ہیں۔ وہ ہمیں اردو شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ تاہم یہ ماننے میں کسی کو بھی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ مجاز ہمارے ایک قابلِ قدر شاعر ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی اٹھان سے ہمیں جتنی امیدیں وابستہ تھیں وہ سب کی سب پوری نہیں ہوئیں اور وہ اپنے تخئیل کی پرواز کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ مگر کچھ تو اس لیے کہ ان کے کلام میں رچی ہوئی غنائیت کے بہت حسین نمونے ملتے ہیں اور کچھ اس لیے کہ انھوں نے اپنے محدود تجربات کو غنائیت میں ڈبو کر ہمارے لیے دل کش نغموں میں پیش کیا ہے جن میں کہیں کہیں ترقی پسند خیالات کی جھلک بھی ملتی ہے وہ نوجوان شعرا کے حلقے میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔

مجازؔ کی شاعری میں عورت کا تصور

خلیل الرحمن اعظمی

طفلی کے خواب" آن کا جشن سالگرہ" بنذر علی گڑھ"شہر نگار" نوجوان خاتون سے" آوارہ" اور خواب سحر جیسی نظموں کا خالق اب اس دنیا میں نہیں لیکن اس کی یہ نظمیں ہمیشہ جوان رہیں گی۔ یہی ایک فقرہ مجازؔ کی شاعری پر جامع تبصرہ ہے۔ "برباد نگاران دلی آراء، اور رسوائے مے و مینا ہو کر بھی مجاز کے اندر کا انسان اپنی فطری معصومیت، بے پناہ خلوص، والہانہ سرشاری اور عنفوان شباب کی سرمستی و کجکلاہی کو آخر دم تک برقرار رکھ سکا اس کی مثال اس کے ہم عصروں میں شاید ہی مل سکے حیات جاوداں کی سعی ہر فن کار کا خواب طفلی ہے جس کی تعبیر کم خوش نصیبوں کے ہاتھ آتی ہے شباب جاوداں صرف مجاز جیسے شہیدان محبت کے حصے میں آتا ہے۔

مجازؔ موجودہ دور کا محبوب ترین شاعر تھا۔ اپنے ساتھیوں میں شاید وہی اکیلا شاعر تھا۔ جس کی شاعری سے متعلق دو رائیں نہیں سنی گئیں۔ اس کے کلام میں کچھ ایسی بے ساختگی، شادابی اور مہک ہے جسے قبول کر لینے میں کسی قسم کی جھجھک نہیں ہوتی۔ دوسروں کو ہم فکر و فن کی کسوٹی پر رکھتے ہیں، ان کا کھرا اور کھوٹا الگ کرتے ہیں، اس شاعری کی تہوں اور پیچیدگیوں کو کھولنے کی کوشش کرتے ہیں اور بار بار الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں لیکن مجازؔ کی آواز سنتے ہی نہ جانے کیوں گمان گزرتا ہے کہ یہ آواز کہیں اور سے نہیں آرہی ہے بلکہ اپنے ہی سینے کے کسی گوشے سے اٹھ رہی ہے۔ اپنی آواز اور اپنے ترنم کا نشہ تنقید کی گرفت میں ذرا مشکل سے آتا ہے۔

مجازؔ کے مجموعۂ کلام پر فیض احمد فیضؔ کا مختصر دیباچہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے

ان کی صحت مند رومانیت، شفاف غنائیت اور جلال وجمال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے بعض گوشوں کو ابھی اور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اپنی اس مختصر تحریر میں مجاز کے کلام کی صرف ایک خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے مجاز کے یہاں عورت کا تصور۔ اقبال کو ہندوستان کے شاعروں سے یہ شکایت تھی کہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ لیکن اس شکایت کی روشنی میں میں نے اُردو شاعری کے سرمایے پر غور کیا ہے تو میرا ردعمل کچھ مختلف رہا ہے۔ اُردو میں معدودے چند شعرا کے یہاں عورت کے خد وخال نمایاں ہوئے ہیں۔ وہ عورت جو شاہکار فطرت بھی ہے اور تخلیق کا سرچشمہ بھی اور جو خود اقبال کے خیال کے مطابق افلاطون جیسے مفکر کے مکالمات کے لیے اپنی خاک سے شرارے فراہم کر سکتی ہے۔ ہمارے یہاں بقول رشید احمد صدیقی چاہے کچھ اور نہ ہوا ہو شاعری اور عاشقی اس دھوم دھام سے ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ لیکن اس شاعری میں نہ جانے عجمی اثرات کے سبب یا اور کسی وجہ سے تصوف اور عشق دونوں محض ایک خلش کے مظہر بن کر رہ گئے ہیں جو بقول اصغر گونڈوی "رگ رگ میں دوڑ سی پھرتی ہے نشتر لیے ہوئے" اور حسن چاہے حقیقی ہو یا مجازی اکثر و بیشتر اپنی مجرد شکل میں آیا ہے۔

کہہ کے کچھ لالہ وگل رکھ لیا پردہ میں نے　　مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

یا "دیکھتا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا" پر ہی ہمارے شاعروں نے اکتفا کر لیا ہے جب کبھی اردو کے شاعر نے حسن مجرد کے دھندلکوں سے نکلنے کی کوشش کی ہے وہ ایک "کارٹونسٹ" کے منصب سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ ایسی صورت میں بدر منیر، گل بکاؤلی یا زہر عشق کی مہ جبیں ہی اپنے پورے جسم کے ساتھ اردو شاعری کے اس خلا کو پُر کرتی ہیں یا پھر شریف النفس اور دردمند حالی کی مناجات بیوہ اور چپ کی داد میں ہم ان کے کچھ اور روپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے سوا اور کس شاعر کو جیتی جاگتی عورت سے سابقہ رہا ہے مجھے نہیں معلوم۔ اس محرومی کے سبب تو اہل لکھنؤ کو خود اپنے وجود کے اندر ایک عورت کو فرض کر لینا پڑا اور اس کے جو نتائج ریختی کے شکل میں ظہور پذیر ہوئے وہ سب کو معلوم ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں مجازؔ کے کلام سے عورت کے خدوخال کی نشان دہی کروں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مجاز سے پیشتر اخترؔ شیرانی کے یہاں اس عورت کی جلوہ گری ملتی ہے۔ گو کہ اخترؔ شیرانی کی سلمیٰ ان کے تخئیل کی پروردہ اور خود ان کی زبان میں ایک "آسمانی خواب" ہے مگر اس خواب کو تراش کر ایک جسم عطا کرنا بھی اخترؔ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ جسم کبھی کبھی عذراؔ اور ریحانہؔ کے نام بھی اختیار کر لیتا ہے۔ مجازؔ کے یہاں جمالیاتی عناصر کی کارفرمائی اخترؔ ہی کے اثر سے پہلے آئی جس کا تذکرہ خود مجازؔ نے مجھ سے ایک بار کیا تھا۔ "نمائش میں" (۱۹۳۱ء) ان کی ایک ابتدائی نظم ہے جو انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ کی نمائش سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس نظم میں عورت کے جو مختلف روپ ہیں ان میں سے ایک پر اخترؔ کی سلمیٰ کا پرتو بھی ہے۔ یہ نظم مجازؔ نے رومان میں چھپنے کے لیے بھیجی تھی اور یہی نظم دونوں کے تعلقات اور دوستی کی بنیاد بن گئی۔ سلمیٰ کے ذکر کے علاوہ اس نظم پر اخترؔ شیرانی کے رومانی انداز نظر اور تصوریت کی چھاپ بھی نمایاں ہے۔

کوئی آئینہ دار حسنِ فارس — کسی میں حسن یونانی کے جوہر
کسی میں عکس معصوم کلیسا — کسی پر پرتوِ اصنام آذر
یہ شیریں ہے، وہ نوشابہ ہے شاید — نہیں یاں فرقِ فرہاد و سکندر
یہ اپنے حسن میں عذرائے وامق — وہ اپنے ناز میں سلمائے اخترؔ
یہ تابانی میں خورشید درخشاں — وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر
ہنسی اس کی طلوعِ صبحِ خنداں — نوا اس کی سرودِ کیف آور
یہ شعلہ آفریں وہ برق افگن — یہ آئینہ جبیں، وہ ماہ پیکر

پوری نظم اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ابھی شاعر کے یہاں یہ زندہ مناظر دور کے جلوے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہ "ماہ پیکر" بھی ابھی ان شفاف آئینوں کی طرح ہیں جہاں کسی کا عکس نہیں ٹھہر سکتا۔

وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں میں — وہ لہریں سی اٹھیں کچھ ساریوں پر
خرام ناز سے نغمے جگاتی — وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی — کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر
کبھی آنکھیں دکانوں پر جمی ہیں — کبھی خود اپنی ہی برنائیوں پر
ادھر ہم نے اک آہِ سرد کھینچی — ہنسی پھر آ گئی اپنے کیے پر

آخری مصرع خاص طور پر عنوان شباب کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ایک الھڑ نوجوان کی نفسیات کا ترجمان ہے، جو ابھی معصوم بچوں کی طرح رنگین تتلیوں کے پیچھے دوڑتا ہے اور جب ہاتھ نہیں آتیں تو ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ یہ اس مجاز کی تصویر ہے جو ابھی اس خلش اور ہمدمی سے دوچار نہیں ہوا تھا جس نے بعد میں چل کر اس کی زندگی کو ایک مسلسل شکست اور روح کو کچھ دینے والا عذاب بنا کر رکھ دیا۔

"ان کا جشن سالگرہ" (۱۹۳۵ء) میں پہلی بار ہمیں اس عورت کا نشان ملتا ہے جو نما کی "دوشیزگانِ نازپرور" کی طرح بے نیاز اور الھڑ ہونے کے بجائے دوشیزگی کی خلش خواب سے آشنا ہے۔ ابھی اس کے جذبات کو زبان نہیں مل سکی ہے لیکن حیا کے بوجھ جھکی ہوئی آنکھیں بول رہی ہیں۔ اس موقع پر شاعر کے لیے سرسری گزر جانا ممکن نہ تھا۔ ا پیکر کے آگے اسے جھکنا ہی پڑا اور اس کی وفا آگے بڑھ کر قدم چومنے کے لیے مجبور ہو گئی۔ یہ تو مجاز نے بڑی دلکش اور سحر آفریں بنائی ہے۔ سنگ مرمر کا یہ مجسمہ اپنے منہ میں زبان بھی رکھتا اور اس کی سانسوں کی مہک ہمارے جسم تک پہنچ جاتی ہے۔

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی
خاموشیٔ محبوب میں اک سیل معانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزہ جوانی

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزان جوانی میں اسے تول رہی ہے
لب ساکت و ساکت ہیں نظر بول رہی ہے

اے تو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تیری نور جہانی
انکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

جس کردار کے لیے یہ دعائیں مانگی گئی تھیں (اور ان دعاؤں کے پردے میں خود اپنے ارمانوں کی کلی کے کھلنے کی تمنا بھی تھی) اس سے نذر دل (۲۶؍۹ ۱۹ء) میں عہد و پیمان ہوتے ہیں۔

کون تم سے چھین سکتا ہے مجھے کیا ہو ہے
خود زلیخا سے بھی تو دامن بچا سکتا ہوں میں

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں

تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں

لیکن یہ پردے اتنے مضبوط تھے کہ آغاز محبت کی ایک ترنگ انھیں اٹھانے سے قاصر تھی،

یہ احساسِ مجبوریاں "(۱۹۳۶ء) میں شاعر پر بڑی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اس کی محبت یک طرفہ نہیں بلکہ خلوص کی یہ آگ دونوں طرف جل رہی ہے اور اس خلوص نے اسے محبت کا ایک پاکیزہ تصور دیا ہے جو مروجہ نظام اخلاق کی کسوٹی پر بھی پورا اتر سکتا ہے۔

زباں پر بےخودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے — اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا
ہوس کاری ہے جرمِ خودکشی میری شریعت میں — یہ حدِ آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا

لیکن معاشرت کے قوانین اپنے اندر اس خلوص کے لیے بھی گنجائش نہیں نکالتے اور اس فاصلے کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی — میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری، یہ لاچاری سی لاچاری — کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے — کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

یہی "حدیں" مجاز کے المیے کا آغاز کرتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ مجاز کی رومانی زندگی کو سب سے پہلے جس معاشرت سے دوچار ہونا پڑا وہ علی گڑھ کی معاشرت ہے۔ علی گڑھ کے پس منظر کے بغیر مجاز کی نظموں کے محرکات کو سمجھنا آسان نہیں۔ علی گڑھ ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی دانشگاہ ہونے کے علاوہ نئی تہذیب کا سب سے بڑا منبع تھا۔ مغرب سے آئی ہوئی نئی ہواؤں کا خیر مقدم سب سے پہلے اسی سرزمین پر ہوا۔ نئی تہذیب کے اثر سے تعلیم نسواں اور پردے کے پرانے تصورات میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ خان بہادر شیخ عبداللہ کی مساعی سے جب یہاں ویمنس کالج کی بنیاد پڑی اور ان کی لڑکیوں نے سب سے پہلے پردہ ترک کیا تو قدامت پسند طبقے میں ایک ہلچل سی مچ گئی جس کے نشانات اکبر الہ آبادی کے کلام میں ملتے ہیں۔

پردے کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم — اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے۔

خادمہ بھی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی   اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

اس زمانے میں اقبال نے بھی اکبر کی اس آواز پر لبیک کہا تھا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی   قوم نے ڈھونڈھ لی فلاح کی راہ

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین   پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اقبال کے یہاں اکبر کا یہ زاویۂ نظر اور انداز بیان کی مماثلت ہی تھی جس کی بنا پر ان کے اس نوع کے کلام کو خواجہ حسن نظامی نے ایک زمانے میں "اکبری اقبال" کے نام سے مرتب کرکے شائع کیا تھا۔ اقبال زندگی کے دوسرے حقائق میں آگے چل کر اکبر سے علیحدہ مسلک اختیار کرتے ہیں لیکن عورت کے بارے میں ان کا رویہ کم و بیش آخر تک وہی رہا۔ گو علی گڈھ نئی تعلیم اور نئی تہذیب کی برکتوں سے بہرہ ور ہوتے ہوئے بھی قدیم اخلاقی اقدار اور شرافت کے پرانے معیاروں سے پورے طور پر دامن نہیں چھڑا سکا تھا۔ مگر اس "نیم پردے" کے ماحول نے علی گڈھ کے نوجوانوں کی نفسیات پر خاطر خواہ اثر کیا۔ عورت کی آزادی اور اسے مردوں کے دوش بدوش لاکھڑا کرنے یا قومی تحریکوں میں اس کی شمولیت۔ یہ رجحان تحریک خلافت اور اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی سے دلچسپی کی وجہ سے بروئے کار آیا اور جب یہیں کے ایک فرزند سجاد حیدر[1] نے ترکی جاکر وہاں کی زبان سیکھی، یلدرم تخلص اختیار کیا اور ترکی ادب کے جواہر پاروں کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا تو اس رجحان کو اور تقویت ملی۔ ۱۹۳۳ء میں جب علی گڑھ کی دعوت پر خالدہ ادیب خانم تشریف لائیں اور یلدرم کی صدارت میں یونین کے جلسے میں ان کا خیر مقدم کیا گیا تو اس موقع پر مجاز نے اپنی نظم خالدہ پڑھی اور اس جاں باز خاتون کی تصویر کو اپنی خیالی وطن کے لیے ایک

---

[1] مجاز کے ذہنی نشو و نما میں بالخصوص عورتوں کی آزادی سے متعلق ان کے زاویۂ نگاہ پر ڈاکٹر انصاری مرحوم سے عقیدت کا اثر بھی پڑا ہے جن کی رہنمائی میں ترکوں کی امداد کے لیے ایک وفد گیا تھا۔ مجاز کی نظم مزار رہنما (۱۹۳۶ء) اس عقیدت کی نشان دہی کرتی ہے۔

مثالی نمونہ بنا لیا۔

خاندہ تو ہے بہشت ترکمانی کی بہار — تیری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار
تیرے رخ سے پرتوِ معصوم مریم آشکار — تیرے جلوؤں کی صباحت سے فرشتے شرمسار

اے مقدس حور، اے پروردۂ موجِ نسیم — روحِ عشرت گاہِ ساحل، جانِ طوفانِ عظیم
تو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم — پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم

چنانچہ اپنی محبت کو پروان نہ چڑھتے دیکھ کر مجاز نے نوجوان خاتون (۱۹۳۷ء) کو بھی کس بل اور شعور کی بھی روشنی پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے — تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل — بھری محفل میں آکر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے — اگر تو سازِ بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
اثر باقی نہیں مفلوج پیروں کی دعاؤں میں — جوانانِ بلاکش کی دعا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن — تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

آنچل کو پرچم بنانے کا مطالبہ ایک رومانی طریقۂ اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ نوجوان عورت اپنے نسائی وجود کو ختم کر کے اپنے آپ کو مردانہ صفات میں ضم کر دے بلکہ مجاز اس عورت میں اس شعور کی کارفرمائی دیکھنا چاہتا ہے جس کی بدولت وہ اس قابل ہو جائے کہ "نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد" کا طعنہ اسے نہ سننا پڑے۔ پردہ اور عصمت (۱۹۳۷ء) میں وہ خالدہ کے ساتھ سجوگنا، جون آف آرک اور طاہرہ قرۃ العین کا نام بھی لیتا ہے اور علی گڑھ کی اس عورت کو جو اس وقت مسلم معاشرت کی سب سے ترقی یافتہ عورت تھی ایک قدم اور آگے بڑھنے کے لیے کہتا ہے۔ اس زمانے کے علی گڑھ کے نوجوان کی روح اور اس کا دلکش رومانی کردار نذرِ علی گڑھ (۱۹۳۶ء) میں بڑے خوب صورت انداز میں آیا ہے۔

یہ وحشت جنوں دیوانوں کا، یہ بزم وفا پروانوں کی
یہ شہر طرب رومانوں کا، یہ خلد بریں ارمانوں کی
فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں
اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں
اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شبخوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں

یہ توانا اور شباب سے بھرپور مجاز جس عورت سے محبت کرتا ہے وہ بیباک اور سرکش ہوتے ہوئے بھی نسائی دل کشی اور مریمی شان رکھتی ہے، حیا اور پاکیزگی اس کے اصلی جوہر ہیں۔ یہ عورت ان "بے پردہ بیبیوں" سے مختلف ہے جنھیں دیکھ کر اکبر الہ آبادی غیرت قومی سے زمین میں گڑ گئے تھے۔ اس عورت کا سراپا اور اس کی مکمل شخصیت مجاز کی نظم "کس سے محبت ہے" (۱۹۳۹) میں ملتی ہے۔

جبیں پر سایہ گستر پر تو قندیل رہبانی
عذار نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہے عظمت تاج سلیمانی
ازل سے معتقد ہے محفل نور انیاں اس کی

لب لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبین نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے

حیا زینت ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر داماناں اس کی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی

وہ میری جرأتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر ناز کی بجلی گرا دینا
نگاہِ شوق کی بیباکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درس تمکیں دے گئیں نادانیاں اس کی

مجازؔ کی یہ عورت باعصمت، بے داغ اور پر جلال شخصیت کے باوجود محبت کے فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اس کے دل میں چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو اور اس کی سرشت میں آئین وفا کی نگہداشت ہے۔

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں میں بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اس نے گنگنایا ہے
سُنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اس کی

مرے چہرے پر جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر کو رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اس کی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

مجازؔ نے جس عورت کی محبت میں عنفوانِ شباب کے حوصلوں سے معمور والہانہ سرشاری کے گیت گائے تھے وہ عورت اپنی سرکشی اور صحت مند بغاوت کے باوجود سماجی جدوجہد میں مجازؔ کے ساتھ بہت دور نہ جاسکی۔ مجازؔ کی شکستِ پیہم کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے وہ سماج کے فرسودہ قوانین اور عصمت و عفت کے بے جان تصورات کے آگے تو سر نہ جھکا سکا۔ لیکن صنفِ لطیف کو اس کا جائزہ حق دلانے کی جدوجہد میں ہار گیا۔ اس کی وجہ اس کے حوصلے کی کمزوری نہیں بلکہ عورت کی یہ "نامکمل شخصیت" ہے پھر بھی اس نے اس "نامکمل عورت" کو بے وفائی کا الزام نہیں دیا۔ اس نے "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے" کہنے کے بجائے اس کمزوری کی ذمہ داری سماج کے فرسودہ نظام پر رکھی۔

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوقِ رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی
زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

چنانچہ نظامِ زنگ آلودہ سے لڑنے کے لیے اسے بزمِ ناز سے ہجرت کے لیے سوچنا پڑتا ہے۔

ابھی تو حسن کے پیروں پہ ہے جبرِ حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آئینِ فرسودہ کی پابندی

ابھی جاری ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دھوکا حقیقت ہے، حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی تو زندگی کو زندگی کر کے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

زندگی کو زندگی کر دکھانے کی یہ لگن مجاز کو نہ جانے کن کن خارزار وادیوں میں لے گئی۔ یہی سفر مجاز کی بہترین نظموں کا محرک ہے۔ اندھیری رات کا مسافر، مہمان، دلی سے واپسی، آوارہ خواب سحر اور عشرت تنہائی سے لیکر آہنگ نو اور بول اری او دھرتی بول تک ساری نظمیں اسی جدو جہد کی داستان ہیں۔ اس جدو جہد میں مجاز پر کرب، انتشار و آوارگی اور جنون کی منزلیں آئیں لیکن کسی مقام پر اس نے سپر نہیں ڈالی وہ اس راہ میں لڑتے لڑتے شہید ہوگیا لیکن آخر وقت تک یہی کہتا رہا کہ۔

بہ ایں سیل غم و سیل حوادث مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجاز اپنی ناتمام محبت کے اس کردار کو بہت دونوں تک نہ بھلا سکا۔ وہ عورت جو اسے بیچ منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر اپنی بارگاہ ناز میں واپس چلی گئی اس کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے اس کی محبت اور مہربانیوں ہی کو یاد رکھا۔ فراق کا ایک شعر ہے۔

تو یاد آئے ترے جور و ستم پھر بھی نہ یاد آئیں
تصور میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے

اس معصومی کے فقدان نے اُردو کے اکثر شاعروں کی عشقیہ شاعری کو محبوب کی بے وفائی کی فہرست بنا کر رکھ دیا ہے۔ مجاز کی شخصیت اس معصومی کا مکمل مظہر ہے وہ اپنی پہلی اور

آخری محبت کی اس متاعِ عزیز کو کھونا نہیں چاہتا۔ یہ غمگین یاد (۱۹۴۱ء) اس کو اپنی طویل جدوجہد میں ایک سایہ دار درخت کی طرح پناہ دیتی ہے۔

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کی چشمِ خنداں میں
خمستانِ فلک سے نور کی صہبا چھلکتی تھی

مرے بازو پہ جب وہ زلفِ شبگوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہتِ خلدِ بریں میں ڈوب جاتا تھا
مرے شانے پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی
مری دنیا میں سوز و ساز کا طوفان آتا تھا

وہ میرا شعر جب میری ہی لے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب مسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرہ ذرہ جگمگاتا تھا

اُمنڈ آتے تھے جب اشکِ محبت اس کی پلکوں تک
ٹپکتی تھی درودیوار سے شوخی تبسم کی
جب اس کے ہونٹ آجاتے تھے ازخود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھیں آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی

وہ جب ہنگامِ رخصت دیکھتی تھی مجھ کو مڑ مڑ کر
تو خود فطرت کے دل میں محشرِ جذبات ہوتا تھا
وہ محو خواب جب ہوتی تھی اپنے نرم بستر پر
تو اس کے سر پہ مریم کا مقدس ہاتھ ہوتا تھا

جشنِ سالگرہ سے لے کر ایک غمگین یاد تک جو مکمل عورت مجاز کی محبت اور پرستش کا محور رہی ہے اور جسے کھونے کے غم میں مجاز نے اپنی شخصیت کو مٹا ڈالا وہ ایک بار پھر نمودار ہوتی ہے لیکن اس وقت جب پانی سر سے گزر چکا تھا اور زندگی کے نشے سے چور رہنے والا مجاز محض ایک خاک کا ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔ مومن کا یہ شعر

وہ آئے ہیں پشیمان لاش پر اب　　تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ممکن ہے محض تخئیل کی پیداوار ہو لیکن مجاز کی نظم "اعتراف" (۱۹۴۵ء) اس کیفیت کا ایسا کرب انگیز اظہار ہے جس کی شدت اور بے پناہ تاثیر ہماری شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے اب اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریادِ جگر دوز مرا نالۂ زار

شدت کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو، تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو، میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں

"میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں" کہتے ہوئے مجازؔ کے دل پر کیا کچھ بیت گئی ہوگی اس کی تفسیر ممکن نہیں۔

مجازؔ کے المیہ کی اس ہیروئین کے علاوہ اس کے کلام میں بعض دوسری عورتوں کے کردار بھی آتے ہیں۔ نورا (۱۹۳۶ء) ننھی پجارن (۱۹۳۶ء) عیادت (۱۹۴۴ء) اور ماوام (۱۹۴۴ء) میں ہمیں عورت کی شخصیت اور اس کے کردار کے بعض دوسرے دلنواز و دلفریب پہلو ملتے ہیں جن سے مجازؔ کے شاعرانہ مزاج نے نکہت و نور، معصومیت، اور تب و تاب کے خزینے حاصل کئے اور اپنی شخصیت میں جاندار اور صحت مند عناصر کا اضافہ کیا نورا والی نظم میں اگرچہ شاعر کا کردار ایک الھڑ نوجوان کا ہی ہے لیکن اس عورت کی نقش گری میں پاکیزگی اور عصمت کا رنگ ہی سب سے گہرا ہے۔

وہ فردوسِ مریم کا اک غنچۂ تر   وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر

وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ — متاعِ جوانی پہ فطرت کا پردہ
مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر — یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر
سفید اور شفاف کپڑے پہن کر — مرے پاس آئی تھی اک حور بن کر
وہ اک آسمانی فرشتہ تھی گویا — کہ انداز تھا اُس میں جبریل کا سا
وہ اک مرمریں حور خلدِ بریں کی — وہ تعبیر آذر کے خوابِ حسیں کی

اور پھر اس کے کردار میں معصومیت کا یہ عنصر کہ

نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ — مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ

ننھی پجارن میں بھی یہی معصومیت مجاز کے لیے جاذبِ توجہ ہے کہ یہ "ننھی سی سیتا"

خود تو آئی ہے مندر میں — من اس کا ہے گڑیا گھر میں

عیادت کی ہیروئین بجائے معصومیت کے شباب کی شورشوں سے مملو ہے۔

اک اک ادا میں سیکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسشِ پنہاں لیے ہوئے

لیکن مجاز کی توجہ اس موقع پر بھی عورت کی جنسی دلآویزی کے بجائے اس کی جمالیاتی پاکیزگی اور لطافت کی طرف رہی ہے۔

رخسار پر لطیف سی اک موجِ سرخوشی — لب پر ہنسی کا زمزمہ طوفاں لیے ہوئے
پیشانیٔ جمیل پہ انوارِ تمکنت — تابندگیٔ صبحِ درخشاں لیے ہوئے

اسی طرح نادام میں یہ عورت اپنی تمام تر زلیخائی کے ساتھ مجاز کے سامنے آتی ہے لیکن اس کی یوسفیت اس کا دامن چاک نہیں ہونے دیتی۔ اگرچہ اس کا فرادائی کی مکمل نقش گری مجاز کے موقلم کا ایک اعجاز ہے۔

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لیے — لب پہ افسوں لیے آنکھوں میں مے ناب لیے
نشۂ نازِ جوانی میں شرابور ادا — جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب لیے

لب گلرنگ و حسین جسم گداز و سیمیں — شوخیٔ برق لیے لرزشِ سیماب لیے

آبِ صیاد خوش اندام سوادِ مشرق — زلفِ بنگال لیے ظلمتِ پنجاب لیے

نزہتِ دنیا کا اک پیکرِ شاداب و حسین — نکہتِ نور کا اُمڈا ہوا سیلاب لیے

مجاز کی ان نظموں کا اگر مجاز کے پیش رو جوش کی ان نظموں کے ساتھ مطالعہ کیا جائے جو عورت سے متعلق ہیں تو ایک بات کا اندازہ ہوگا جوش کا رویہ عورت کے ساتھ خالص جاگیردارانہ ہے یعنی بہو بیٹیوں پر تو وہ قدغن لگاتے ہیں۔ اور انھیں خاتونِ مشرق بننے کی تلقین کرتے ہیں لیکن بنجارانی جامن والیاں ان کی ہوس کا شکار بنتی ہیں اس کے برخلاف مجاز کا نقطۂ نظر جدید اور ایک صحت مند رومانی کا نقطۂ نظر ہے نیز عورت کے متعلق اس کا شعور ایک بیدار اور صالح شعور ہے مجاز کی شاعری میں جیتی جاگتی عورت کا پیکر ہے لیکن اس پیکر میں مجاز نے ہمیشہ معصومیت، حیا، مریمی تقدس، صحت مند بغاوت اور رفاقت و دلداری کے عناصر کی تلاش کی ہے۔ عورت مجاز کی شخصیت اور شاعری کا محور بھی ہے اور اس کی بہت بڑی محرومی اور تشنگی بھی لیکن اس کے ناتواں جسم میں نہ جانے کہاں سے اتنا کس بل آگیا تھا کہ وہ کبھی گھٹن یا جنسی تلذذ کا شکار نہیں ہوا۔ اس نے اپنے جسم کو میکدے کی آگ میں جلا ڈالا لیکن اپنے ذہن کو نفسیاتی پیچیدگیوں اور مریضانہ رجحانات سے محفوظ رکھا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے تمام رومانی شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔ جس کا اعتراف ادب کا ہر صاحبِ ذوق نقاد کرے گا۔

قمر رئیس

نیم شب

(غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد)
غالب

چاند نکلا تھا، مگر دیر ہوئی ڈوب گیا

"مضمحل راہگذاریں، یہ تھکے ہارے درخت
سر جھکائے ہوئے سمٹے ہوئے اکتائے ہوئے
اک دھواں ایک دھندلکا سا رواں ہے ہر سو
رات کی مانگ سے افشاں بھی اُڑی جاتی ہے
قمقمے راہ کے، سہمی ہوئی پہنائی میں
اک دہکتی ہوئی زنجیر نظر آتے ہیں
کہر آلود ہوائیں، یہ اُداسی کا فسوں
رات اک خواب گراں ہے کہ جگا بھی نہ سکوں

....

....

ارضِ رومان کی سنسان گذرگاہوں پر
شاعرِ شہرِ نگاراں کا خیال آتا ہے
وہی آوارہ وہی سرکش و رومان مزاج
رازِ رازوں کا، بلا نوش بلا نوشوں کا
'شہریاروں سے رقابت کا جنوں' تھا جس کو
گلعذاروں کی محبت کا جسے سودا تھا
وہ جو اپنے ہی تراشے ہوئے بت پا نہ سکا
لوٹ کر 'کوئے ملامت' سے کبھی آ نہ سکا

....

میں بھی اُس شہرِ نگاراں سے بہت دُور ہوں آج
شوخیٔ چشمِ غزالاں سے بہت دُور ہوں آج
یہ دھندلکے، یہ منارے، یہ مقدس در و بام
علم و تہذیب کے اس کہنہ صنم خانے میں
سیکھنا ہیں ابھی آدابِ پرستش مجھ کو
ابھی دیوانگیٔ شوق کے ہاتھوں میں بھی
بے نوا بے سر و سامان رہا ہوں اب تک
اور یہ دن بھی بہر حال گذر جائیں گے

....

....

میری درماندہ خیالی ، میری افسردہ دلی
سوچتا ہوں مرے ماحول کی پروردہ ہے
(یہ چمن یوں تو بہت روح فزا ہے لیکن
میں ابھی اس کی روایات سے مانوس نہیں)
ورنہ تنہائی کبھی اتنی گراں بار نہ تھی
ذہن میں تلخیٔ افکار تھی پیکار نہ تھی
اب یہاں دل کے دھڑکنے کی صدا کوئی نہیں
رازِ دل کوئی نہیں ، رمزِ وفا کوئی نہیں

چاند نکلا تھا ، مگر دیر ہوئی ڈوب گیا
آؤ اب لوٹ چلیں، دُور نکل آئے ہیں

مجاز اور عشق

قاضی عبدالستار

انسان کی کوئی نسل خالی الذہن اور سادہ دماغ نہیں پیدا ہوئی۔ لیکن ادبیات کی تاریخ میں ایسی عہد آفرین نسلوں کا فقدان نہیں ہے جنھوں نے اپنے ادبی ورثے کو نئی دنیاؤں کے تاج پہنائے ہوں۔ جب اردو ادب کی نئی تاریخ لکھی جائے گی تو مجاز کی نسل بھی ایسی ہی مقتدر اور خلاق نسلوں کی فہرست میں مرقوم ہوگی جس عہد میں اس نوجوان نسل نے اپنی میراث میں پائی ہوئی دنیا سے نکل کر نئے جہانوں کی تسخیر کا عزم کیا اور اپنے کاندھوں پر نئے ادبی پرچم سجائے وہ ایک بحرانی دور تھا۔ اقبال فکر و فن کے نئے میزان پر قوم و ادب کی سیرت تول رہے تھے۔ جوش "انقلاب" کی دلہن کی رونمائی کا شرف حاصل کر رہے تھے۔ اصغر ادب کی خانقاہ میں تصوف کی بوسیدہ مسند بچھائے بیٹھے تھے۔ فانی زندگی کے ویرانے میں موت کے زانوں پر سر رکھے اس سے راز و نیاز کر رہے تھے۔ حفیظ قرون اولیٰ کی اسلامی زندگی میں اپنے زخموں کا مرہم ڈھونڈ کر تھک چکے تھے۔ بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کی آتشیں تقریروں میں غلامی کی گرانبار زنجیر پگھلتی نظر آ رہی تھی۔ روس اور فرانس کے انقلابیوں نے جوان دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں مغربی ادب اور روسی فلسفے سے مسلح نئی نسل ایک طرف اقبال کو فاشزم کا شکار سمجھ رہی تھی اور دوسری طرف اردو شاعری کے "تاج محل" کو انحطاطی تمدن کی پروردہ درباری چیز سمجھ کر مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس نسل نے دیوان غالب کو شعری مجموعوں کی الماری سے نکال کر مقدس صحیفوں کی صف میں رکھ دیا تھا۔ اس انداز پرستش کا اگر مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف عہد غالب کی تلخ کلیت اور شیریں تشکک کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس نسل کی تقدیر میں لکھے ہوئے

پرآشوب زمانے کا شعور بھی ہوتا ہے جس نے ماضی سے محبت، حال سے آسودگی اور مستقبل سے یقین چھین لیا تھا۔

ایلیٹ اور آڈن کا آوارہ فکر، ڈارون اور فرائڈ کی مجہول حیوانیت اور جبلیت اور مغربی رومانیت، دن کی فکری کج روی کے ہاتھوں یہ "کارواں" ان دیکھی دنیاؤں میں بھٹکتا رہا اور آخرکار مارکس کی رہنمائی میں انسانی کردار کے ہاتھوں دنیا کی نئی تفسیر لکھنے پر رضامند ہوا۔ یہیں سے "ادب برائے زندگی" کے نظریے نے اپنی صحت اور بقا کے لیے فلسفیانہ ادراک کیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ یہ روایت اردو شاعری میں نئی ہے۔ کیونکہ اردو شاعری دربار سے زیادہ بازار اور خانقاہ سے منسلک رہی ہے۔ از زندگی، زندگی کے دکھ درد اور انسان، انسان کی شکستوں اور ناکامیوں سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ لیکن چونکہ اردو شاعری کی زبان اتنی ہمہ گیر اور وسیع ہے کہ ہم کسی ایک شعر سے عموماً دو متضاد معنی اخذ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ادب کے عام طالب علم کو داخلیت، اجتماعیت سیاست اور معاش کی قطعی تفریق میں دقت ہوتی ہے اس لیے ہم کچھ اپنی سہل پسندی اور کچھ انسان اور زندگی سے متعلق اہم افادی مضامین کی کمی کے باعث غلط نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یہ صحیح ہے کہ قوم کی سیاسی، سماجی اور معاشی تقدیر رقم کرنے والا حکمراں طبقہ عیش کے تخت پر بیٹھا رہا اس کے حضور میں شاعر گاتا رہا رقاصہ ناچتی رہی مصور تصویر بناتا رہا اور بیمار زندگی طلائی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اس کے قدموں میں لیٹی رہی لیکن اردو شاعری ایسے صدہا اشعار اپنے دامن میں سمیٹے کھڑی ہے جس سے انسانیت اور زندگی کے خون کی بو آتی ہے۔ ؎

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد
روح پتھر سے سر پٹکتی ہے — آبرو

لگتی ہے اب تو قلقل مینا سے دل کو ٹھیس
وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم — مرزا مظہر

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے — سودا

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا — میر

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں — میر

ہم بھی تمھیں بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ ہستی سے گر ملے — غالب

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں — غالب

لیکن اردو شاعری کا یہ مقدس لہجہ مصنوعی محبت کے نقار خانے میں تقریباً گم ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے حالی کو ان مروجہ بوسیدہ مضامین کی عفونت کا احساس ہوا تھا۔ اقبال نے اسی بنیاد پر وہ محل تعمیر کیا جس کے کنگروں پر ماہ و انجم کے آشیانے ہیں۔ مگر مجاز کی نسل نے اس نظریے (ادب برائے زندگی) کی جس شدت اور کامیابی سے ترویج و تبلیغ کی وہ ایک طرف اپنے عہد کی سب سے اہم اور پاک ادبی خدمت بھی ہے اور دوسری طرف ایک نئے جہان کی فتوحات کی حقدار بھی یہ بات قابل غور ہے کہ اس نئے ادبی کاروان میں کوئی "خضر" کا منصب ابھی تک نہیں پا سکا ہے

فیض احمد فیض نے مجاز کو انقلاب کا مطرب کہا ہے اثر لکھنوی کا ارشاد ہے "اردو ادب میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے بھیڑیے اٹھا لے گئے" قطع نظر اس کے کہ انقلاب کی پیغمبری کا منصب اب بھی خالی ہے اور اردو ادب کے کیٹس کو بھیڑیے اٹھا لے گئے تھے یا وہ بھیڑیوں ہی کے لیے پیدا ہوا تھا جب طلب

مسئلہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجاز اپنی نظموں اور غزلوں کا مختصر سا مجموعہ لے کر بزرگوں کی محفل سے گذرا تو انھوں نے سرو قد کھڑے ہو کر اس کے فن کا احترام کیا اور جب وہ نوجوانوں کی بزم میں آیا تو انھوں نے اسے اپنے کارواں کے سالاروں کی صف میں بٹھا لیا۔ ہر اچھے فنکار کی شخصیت میں کوئی چھپا ہوا انقلادی رومانہ ہو لیکن مجاز میں ضرور تھا۔ "آہنگ" کا انتساب کسی شاعرانہ جذبے کے جذباتی مصوری نہیں ہے بلکہ ساری ترقی پسند شاعری پر بے لاگ تنقید ہے۔ فیض اور جذبی دونوں انفرادی تجربات کے پروردہ جذبے کو عمومیت اور آفاقیت کی دشوار منزلوں سے گذار کر تفکر کے قریب لاتے ہیں اور مخدوم و سردار ساری زمین پر چل کر نئے نئے افادی موضوعات کی جستجو کرتے ہیں جن پر یہ آتشیں لہجے کی مبارک گھن گرج کا لباس پہناتے ہیں۔ مجاز نے ان دونوں کے درمیان اپنے مقام کا تعین کر کے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔ مجاز کی شاعری کا ذکر کرنے سے پہلے رومانیت کا تذکرہ ضروری ہے۔ اردو ادب کے کچھ اہم نقاد اُن نقادوں سے متفق نہیں ہیں جو اردو ادب پر رومانوی تحریک کے نمایاں اثرات محسوس کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ادب میں شعوری طور پر رومانیت ایک تحریک کی صورت میں نہیں آئی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عصر جدید کے بہت سے اہم شعرا نے اسی مقدس آتش خانے سے اپنے نغموں کے لیے سوز چرایا ہے۔ جوش کی انقلابی شاعری جو انقلاب کے فلسفیانہ شعور کے بجائے انقلاب کی داخلی آرزومندی کے معصوم خواب دکھلاتی ہے۔ اختر شیرانی کی وہ عشقیہ شاعری جو ایام جاہلیت کے منچلے عرب شاعر کی بیقرار روح کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ دونوں رجحان نہ صرف رومانیت کے گنگا جمنی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ رومانیت کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ رومانی کا حسین تخیل اور شدید احساس اپنی مجنون آرزو کی اسیری میں کبھی ہر روایت کی کے خواب دیکھتا ہے۔ اور کبھی اپنی انفرادیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی ایک مروجہ اخلاقی یا سیاسی نظام اقتدار کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اس کی بے پنہ تخیل اور فطری اداسی اُن قدسیوں کے شبستانوں میں کجکلاہی کے خواب دیکھتی ہے جن کے ذکر سے اُس کی مادی زبان جلتی ہے جب سنگین

ف GENERALIZATION

حقیقتوں کی ٹھوکر سے اس کے ذہنی نگار خانے شیشے کے کھلونے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں تو اس کے لہجے کی تلخی، تخیل کی پرواز اور جذبے کی شدت کی اور تیزی آجاتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ رومانی کے ایک ہاتھ میں خون آلودہ شمشیر کا قبضہ نظر آتا ہے اور دوسرے میں کسی قتالۂ عالم کا دستِ حنائی۔ شیلی نے زنگار کلاہ کے بحرِ شب میں ستارے بھی بوئے ہیں اور آئرلینڈ کی آزادی کے لیے تلواروں پر باڑھ بھی رکھی ہے۔ بائرن نے انگلستان کی نازنینوں کے لیے قصیدے بھی کہے ہیں اور یونانیوں کے لیے رجز بھی اور انگریزی ادب ان دونوں رومان نگاروں پر فخر کرتا ہے۔ اردو شاعری میں نہ صرف مجاز بلکہ تقریباً تمام نئے اہم اور مقبول شاعر رومانیت کی یہی "دھوپ چھاؤں" پہنے کھڑے ہیں۔ فیض جس نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے جہاں کہیں بھی کاجل کی لکیر اور غازے کے غبار سے اپنا دامن بچانا چاہتا ہے اس کے نغموں کی تاثیر مدھم ہو جاتی ہے۔ سردار ایسے پرجلال شاعر کے بلند آہنگ میں بھی اسی تیرِ نیمکش کی پر فکر بیقراری کا احساس ملتا ہے۔ جذبی نے موضوعاتی اور ہنگامی شاعری سے اپنے آپ کو بڑی دلیری اور کامیابی سے بچائے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں انقلاب پر منظوم تقریروں کے بجائے انقلاب کی روح کے عکس ملتے ہیں۔ ساری نسل میں شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر شاعر ملے جس نے بیک وقت غمزہ و شمشیر دونوں کی آرزو نہ کی ہو۔ یہی آرزو ان کی رومانیت کا درخشاں ثبوت ہے رومانیت کا وجود کسی بھی فنکار کی واجب ادبی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ رومانیت صرف ابہام، اشاریت مریضانہ داخلیت اور آوارہ جذباتیت ہی کا نام نہیں ہے۔ اس کی فطری تشنگی اور ابدی اضطراب ہر روایت کے طلسم توڑنے کی قسم کھاتا ہے۔ وہ تمام قدریں جو اس کے راستے میں کانٹے بوتی ہیں اگر اس کے غضب کا نہیں تو نفرت کا شکار ضرور ہوتی ہیں۔ وہ دنیا کی کسی لعنت سے خواہ وہ کتنی ہی زریں ہو سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی اس کے شدید احساس اور بیتاب تخیل کو نیند نہیں آتی وہ شبِ زیست کے ہر لمحہ میں ستارہ شمار رہتا ہے۔ مجاز نے بھی اسی بیقرار آرزومندی کے زخم کھائے ہیں ؎

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دلدادگانِ شعلۂ محمل میں ہم بھی ہوں

طفلی ہی یہ ارد و سندی اگر ارمانوں کی ایسی منزل پر سو جاتی تو اس شاداب صبح کی رحمتیں کہاں جاتیں جن کے ذروں میں ایک نسل کی بیدار آنکھوں کے موتی پوشیدہ ہیں۔ اپنے عہد کے مکمل کرب نے ہی پیدا کی نے مجاز سے یہ شعر بھی کہلوایا ہے۔

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آبدار
ہنگام جنگ زرعۂ باطل میں ہم کبھی ہوں

مجاز کی اسی دو گلی شخصیت کی بنا پر ڈاکٹر محمد حسن نے اُسے قرون وسطی کا نائٹ کہا ہے جو بزم میں خم لنڈھاتا ہے اور رزم میں کفن پوش رہتا ہے۔ اگر ان دو مذکورہ بالا اشعار کا تجزیہ کر کے ان میں ربط ڈھونڈھا جائے تو اس دور کی حسرتناکیاں آئینہ ہو جاتی ہیں۔ شاعر اپنی مضطرب عشقیہ فطرت کے ہاتھوں شعلہ محمل کے لدادہ ہونے کی جذباتی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن یہ سریری خواب تعبیر کی خارزاروں وادیوں میں آتش زیر پا ہونے سے پہلے ہی پرسوز فکر کے ہاتھوں جھلس جاتا ہے کیوں کہ اس کے خیالوں کی شہزادی زنجیر مساوات یا نہ طبقاتی تقسیم کے آہنی قلعے میں اسیر ہے دولت کا آسیب دیو کی پشت پر مجہول روایات اور بوسیدہ اقدار کا لشکر لیے دربانی پر کھڑا ہے۔ گرمئ خیال کے آبگینوں اور بے خواب آنکھوں کے جھوٹے موتیوں کے سوا اس کے دامن میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک سچے رومانوی کی طرح شاعر دوسرے درجے کے آئیڈیل سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا پھر وہ کرے کیا۔ زرعۂ باطل میں لڑتے لڑتے جان دے دینے کے علاوہ بھی کوئی چارہ ہے؟

لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

یہاں لشکر کا لفظ انفرادی غم کو اجتماعی لباس پہناتا ہے۔ شاعر یہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس مدقوق سماج اور بیمار نظام میں صرف اُسی کے دل کا خون نہیں ہوا ہے بلکہ ایک کثیر آبادی اپنے کاندھوں پر ارمانوں کا جنازہ اٹھائے زندگی کا فرض ادا کر رہی ہے۔ عشق زندگی کی بنیادی قدر نہ سہی لیکن ایک اہم قدر ضرور ہے۔ فاقوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنے والے تنہا نہیں ہیں ان کی ہمدمی میں ستم پیشہ محبت کے مارے ہوئے انسانوں کا قافلہ بھی ہے۔ اسے آپ ذہن کی کجروی اور فکر کی رہزنی کہہ سکتے ہیں مگر اس کے

وجود سے انکار مشکل ہے۔ تاریخ ایسی شخصیتیں اپنے اوراق میں چھپائے بیٹھی ہے جن کی عظمت کی پشت پر مہ جبینوں کا پنجۂ عشق رہا ہے۔ عشق کے بھرتے کردار کی شمشیروں پر بارہا جھکی رکھی ہے اس میخانے میں جھلکا ہوں نے فقیروں کے جھوٹے جام نوش کیے ہیں فیض کے یہ اشعار

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی ہے
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کا سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

یہ اسی عشق کی بازگشت ہے جو اردو کی کلاسکی شاعری کا اولیں دور شباب ہے اشعار کی مثال نہیں دوں گا کیوں کہ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

مگر میرزا جان کی اس وصیت کا ذکر ضرور کروں گا جو انھوں نے اپنے بیٹے میرزا جان جاناں کو کی تھی یہ وہ لوگ تھے جن کا احترام کرنا انحطاط پذیر مغل دربار اپنی سعادت سمجھتا تھا۔

"ہر کہ دلش عشق برشتہ نمی شود و خاشاک طبیعت او سوختہ و پاک نمی گردد زینہار طبیعت او صلاحیت تحفہ محبت الٰہی ندارد"

مجازؔ بھی اسی عشق کے شیشے میں کھینچ کر تلوار ہوا ہے۔ اسی دار کی بلندی سے آہستہ گام سحر کی سولی دیکھی ہے جب بھی کار زار ہستی میں اس کے بازو شل ہوئے ہیں اسی شجر ممنوعہ کی چھاؤں میں دم لے کر ہستی کی طنابیں کھینچی ہیں۔ مجاز کی شاعری میں عشق پر شرمندگی نہیں ملتی حالانکہ ان کے اکثر ہمعصروں نے اپنی

محبوباؤں سے جنگ کی آگ میں کودنے کی اجازت مانگی ہے اور ان کی کاکلوں کے رخصتی پیار لیکر تمشیر و سنان کے زیور پہنے ہیں۔ پشیمانی کا یہ فقدان اور عشق کے تذکروں کی گرمی

ع عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
نشۂ نرگس خوباں مجھ سے
غازۂ عارض و رخسار ہوں میں
لے کے نکلا ہوں گہر ہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں
اہل دنیا کے لیے ننگ سہی
رونق انجمن یار ہوں میں

اس کی محبت کو عبادت بناتی ہے۔ وہ ایک کارنامے کی طرح اپنی داستان سناتا ہے اور فخر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کی نظمیں پڑھکر اس کے عشق پر ترس نہیں آتا بلکہ رشک ہوتا ہے۔ دل پر وہ ٹھیس نہیں لگتی جو آنسوؤں کی پیشوائی کرتی ہے بلکہ وہ چوٹ پڑتی ہے جس سے سرمستی کے ولولے بیدار ہوتے ہیں۔ اسی عشق کی کارفرمائی سے غم ایام کے دفتر کھلتے ہیں اور رزمگاہ حیات میں لشکر سجتے ہیں

ع افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
مرتب اک نیا دستور ہو گا
بنا اک اور سیہ کی پڑ رہی ہے
سکون دیر تقدیس کلیسا

گداز امت خیر البشر بھی

ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دھوکا حقیقت سے حقیقت آشنا ہے
ابھی تو زندگی کو زندگی کر کے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

چہروں پہ نمایاں افلاس کے نشاں
ہر ہر ادا سے بھوک کی ہے ادا بیاں عیاں
پیسہ اگر ملے تو قیمت بھی نہ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں

یہ اشعار بغیر کسی ترتیب اور تلاش کے لکھ دیے گئے ہیں لیکن ان کی آگ جس آتش خانے سے لائی گئی ہے وہ عشق ہی ہے۔ اسی کوچے کی ٹھوکروں سے مجاز کی معصومیت کو سخت گیر زمانے کے تشدد کا عرفان کرایا ہے اسی بزم کے کہنہ جام میں اس نے زندگی کو بے نقاب اور دنیا کو برہنہ دیکھا ہے یہ میرا نہیں مجاز کا دعویٰ ہے

؎ مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی
زمانہ کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانین کہن آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

شہاب جعفری

گنہگار فرشتے

(مجازؔ کی یاد میں)

سنبھال کر مرے ہم نوش ، ارے شراب ہے یہ !
اک ایک قطرہ ہے اپنے ہی خونِ دل کی کشید
اک ایک قطرۂ مے ، زندگی کا زہر بھی ہے
اسی کو آج بھی پینا ہے کل بھی پینا ہے
نہ جانے کب تک ابھی اور یونہی جینا ہے

اِسی کے واسطے بدنام ہیں زمانے میں
عجب جگہ ہے سلامت رہے یہ میخانہ
کہاں کہاں سے یہاں آکے جمع ہیں ہم لوگ
یہ میکدہ ہے یہاں دل کی آگ روشن ہے
ذرا سکون سے بیٹھے ہیں غم کے مارے ہوئے

جِلا وطن ہیں ، غریب الدیار ہیں ہم سب
کسی قصور پہ بن باس عمر بھر کا ہے

نہ ماں کی گود میسر نہ باپ کا سینہ
نہ دوستوں کی مروّت نہ اجنبی کا خلوص
نہ ہم کو پیار کا حق ہے نہ روزگار کا حق
غمِ شباب سے محروم عشق سے محروم
کسی نے چھین لیا ہے نگاہِ یار کا حق

ہمارے نام کی سب نعمتیں ہیں دنیا میں
حیا سرشت تھے دنیا سے کچھ نہ مانگ سکے
کسی کے سامنے دستِ سوال اُٹھ نہ سکا
نہ کام جوئی تھی فطرت نہ بھیک تھی عادت
کسی کے آگے سرِ پُر غرور جھک نہ سکا
ادائے حسنِ طلب بھی نہ ہم کو آتی تھی
کسی سے حسنِ طلب کی ادا نہ سیکھ سکے
ہمیں بھی حسن کی اک اک ادا لبھاتی تھی
مگر ہم اہلِ ہوس کی وفا نہ سیکھ سکے

کوئی متاع کہاں تھی متاعِ دل کے سوا
وفا کے نام پہ سب کچھ لٹا کے بیٹھے ہیں
جہاں میں کون ہمارا ہے کس کو پیار کریں
یہاں خلوص ملا ہے تو آ کے بیٹھے ہیں
اٹھاؤ ساغرِ مے دوستو کہ دَور چلے

نظر ملا کے محبت کا جام ٹکراؤ
غمِ حیات غمِ روزگار کیا شے ہے
یہاں کسی کو اجازت نہیں ہے آنے کی
کسی کو حق نہیں ہم بیخودوں کی پرسش کا
ہماری چارہ گری کرنے والی دنیا کون
یہ کس نے آ کے درِ میکدہ پہ دستک دی
ارے کہو ہمیں فرصت نہیں ہے ملنے کی
یہ بزمِ مے ہے یہاں ناصحوں کا کام نہیں
یہ دن کے لوگ ہیں شب میں کہاں نکل آئے
پیو پیو کہ ابھی ساری رات پینا ہے
یہ عمر تھوڑی نہیں صبح تک تو جینا ہے

•

اندھیری رات کا سورج یہ ساغرِ مے ہے
فروغِ نشہ میں کتنی حسین ہے دُنیا
کہ جیسے مائلِ پرواز ہونے والی ہو
ہمیں اُڑائے لئے جائے گی، کہیں سے کہیں
کہ جیسے راہ میں حائل، نہ آسماں نہ زمیں

فضا میں پھر وہی جگنو چمک کے ڈوب گیا
تو دل میں پھر وہی طفلی کی آرزو جاگی
کہ جس کی گود میں جائیں وہ ہم کو پیار کرے

جو چاہیں مانگ لیں، جو مانگیں جب گھڑی، مل جائے
پھر اس کی گود سے اٹھیں تو بھاگ جائیں کہیں
جدھر کو چاہیں نکل جائیں منہ اٹھائے ہوئے
کہ ماں کے دودھ کے نشے میں بیخود و سرشار
بڑھے چلیں کبھی گرتے کبھی سنبھلتے ہوئے
زمیں پہ ٹھیک سے اپنے قدم پڑیں نہ پڑیں

چلیں ستاروں کی دنیا میں چل کے سیر کریں
ہوا میں خوب اڑیں بادلوں سے شرط لگائیں
نہ جی بھرے تو ہنڈولے میں چاند کے جھولیں
اس آسمان سے اُس آسمان کو چھولیں
فرشتوں سے ملیں جنت کی سیر کو نکلیں
گلے میں بانہیں دیے ٹولیاں بنائے ہوئے
روش روش پہ چلیں قہقہے لگا کے ہنسیں

اور اپنے گھر کی طرح اپنے گھر سے دور کہیں
زمیں پہ ایک گھروندا بنائیں پیارا سا
حسین چاند خیالوں کی اک حسین دُلہن
اب اس سے بیاہ رچائیں اب اس کو بیاہ کے لائیں
ستارے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں بچپن میں
انھیں بلائیں براتی کبھی کا وعدہ نبھائیں

ہوائیں ریشمی سُروں میں بجائیں شہنائی
برات اُٹھے چراغاں ہو کہکشاں کی گلی
یہ کائنات مری ماں بنے، بلائیں لے
یہ زُہرہ بن کے بہن سر پہ ڈال دے آنچل

نزولِ رحمتِ پروردگار کی شب ہو
فضا کو نیند سی آئے، فرشتے سایہ کریں

غمِ شباب میں طفلی کی آرزو ہے جواں
اندھیری رات کا سورج، کہاں ہے ساغر مے؟
عروج نشہ ہے ہم نوش اک اور ساغر دے
یہ جام آج چھلک جائے اس قدر بھر دے
میں تشنہ کام ہوں خالی ہے میرا پیمانہ

مجاز کی شاعری

رفیع اللہ عنایتی

مجاز ایک نغمے سے بھولے بھالے دل کا شاعر ہے۔ جذبات، احساسات اور وجدان اس کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ عقل کے حلقۂ زنجیر میں وہ اپنے کو اسیر کرنے پر آمادہ نہیں ہے اسے حسن سے محبت ہے۔ وہ شیلی کی طرح بیتاب، کیٹس کی طرح حسن پرست اور بائرن کی طرح جوشیلا ہے۔ وہ مسلم روایات کا باغی ہے۔ سماجی جکڑبند سے خود کو اور عوام کو آزاد کرانا چاہتا ہے غرض وہ ایک بھرپور رومانی شاعر ہے۔ اسلوب احمد انصاری اپنے ایک قابل قدر مقالہ "علی گڑھ اور رومانی نثر" کے مقالہ میں رومانیت کے عناصر ترکیبی کو اس طرح بیان کرتے ہیں "بہر کیف ماضی سے عقیدت، حسن کی تلاش وفور جذبات، مرکزیت سے گریز، جذبہ، احساس اور وجدان پر بھروسہ۔ تخئیل کی خودکفالتی، مہم کی امنگ، زندگی کے ہیولیٰ کو منقلب کرنے کا جذبہ، زبان میں صحت، صفائی اور وضاحت سے بڑھ کر ترنم، اشاریت اور مطالب کی تہوں کی وسعتوں پر زور رومانیت کے عناصر ترکیبی قرار دیئے جا سکتے ہیں"۔ (فن کار صفحہ ۲۳) رومانیت کے ان عناصر ترکیبی میں سے جن کو اسلوب صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے مجاز کے یہاں صرف حسن کی تلاش، وفور جذبات، مرکزیت سے گریز، جذبہ، احساس اور وجدان پر بھروسہ، زندگی کے ہیولیٰ کو منقلب کرنے کا جذبہ اور زبان میں صحت کی صورت میں ملتے ہیں۔

مجاز کے یہاں تاریخی شعور نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں غالب، اقبال، حسرت، فراق اور فیض کی طرح انتخابیت نہیں ہے۔ اس کو کبھی بھی یہ احساس نہیں ستاتا کہ اس کے فن پارے بھی

ادب کی "جمالیاتی عالمگیریت" کے سلسلہ کی ایک کڑی ہوں۔ اور ایک حیثیت سے وہ جتنے نئے ہوں اس سے زیادہ پرانے ہوں۔ اور اس کی شاعری میں ماضی سانس لے رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذکورہ بالا شعراء کی صف میں نہیں آتا۔ لیکن اچھے شاعروں میں ضرور اس کا شمار ہوتا ہے۔ میں فراق گورکھپوری کی اس رائے کو بڑی اہمیت دیتا ہوں " ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ روس میں بھی اب بہت سے لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ ترقی پسند ادب کے بہت سے ادیب قدیم ادب سے بہت ناکافی استفادہ کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ تہذیب و ادب انقلابوں کے باوجود اپنے سلسلوں اور سرچشموں سے اگر بے نیاز ہو گئے تو سخت گھاٹے میں رہیں گے۔ دنیا کی سب سے پرانی دستیاب رگ وید سے لے کر ٹینی سن، سونگ برن، ٹالسٹائی، ٹیگور، اقبال، غالب اور انیس تک ادب میں دوسروں کو متاثر کرنے کے جو طریقے اور فنی معجزے ہمیں ملتے ہیں۔ اگر انھیں ہم نے حاصل نہیں کیا تو محض ترقی پسند مقاصد ہم سے بڑے ادب کی تخلیق نہیں کرا سکتے .... ہمیں وجدانیت کے رموز کو سیکھنا ہے اور غیر مارکسی ادب سے ہم وجدانیت کے رموز اور جمالیات کے نکات سیکھ سکتے ہیں اور انھیں اپنے ادب میں سمو کر مارکسی ادب میں چار چاند لگا سکتے ہیں۔ قدیم ادب کی اسپرٹ کو ہمیں اپنے اندر سمونا ہے۔ یہ محض قدیم ادب کے مطالعہ سے ممکن نہیں بلکہ اس اسپرٹ سے ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم قدیم ادب کے حال و قال کا بھید نہ پا سکے تو ہمارا ادب ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ایک اکھڑے پتنگ کی حیثیت رکھے گا۔" (شاہراہ۔ فروری ۱۹۵۶ء۔ باقی صفحہ ۶)

مجاز جس عہد کی پیداوار ہے وہ ایک انتشار کا دور تھا۔ پرانے ادارے اپنی عمر پوری کر چکے تھے۔ انقلابی آواز سامراجی نظام اور پرانی قدروں کے خلاف پوری شدت کے ساتھ بلند ہو چکی تھی مذہب اور سرمایہ داری کی پول بھی اچھے طریقہ سے کھل چکی تھی۔ وہ گھڑی میلادِ آدم کی گھڑی تھی دلیس کے مزدور، کسان اور دوسری انقلابی طاقتیں کافی بیدار ہو چکی تھیں۔ ایک طرف تو پرانا نظام دم توڑ چکا تھا اور دوسری طرف نئی اقدار کو جنم دینے کی خواہش زوروں پر تھی۔ یہ حالات تھے جب مجاز کی شاعری کے بال و پر نکلے اور اس نے پوری آزادی کے ساتھ فضا میں اڑنا شروع کیا۔

علاوہ ازیں اس کی شاعری پر ملکی حالات کے علاوہ دوسرے ممالک کی ہواؤں کا بھی اثر ہے "محنت و سرمایہ" کی عالمگیر جنگ بھی ایک طرح سے اس پر اثرانداز ہوتی ہے۔ ساری دنیا کے کالونیل ممالک میں قومی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ وہ سامراجی نظام کی جکڑ بند سے اپنے کو آزاد کرانے میں لگے ہوئے تھے۔ سرمایہ داری کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اس حیثیت سے یہ سارے بیرونی اثرات یا "خارجی ماحول" اس کی شاعری کے اندرونی یعنی "معنوی دنیا" کی تربیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کی "معنوی شخصیت" کا سراغ لگانا خارجی ماحول کی روشنی میں بڑا آسان ہو جاتا ہے مجازؔ کی شاعری "گلدستۂ معنی کا طلسم" تو ہے نہیں کہ اس کو سمجھنے میں دقت ہو۔ اس کی شاعری سیدھی سادی جذبہ، احساس اور وجدان کی شاعری ہے۔ وہ ہر آن اپنے دل کا خون کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ بھولا بھالا عاشق ہے ہر آن اپنی محبوبہ پر اپنے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ لیکن وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس کی محبوبہ کو کوئی دوسرا دیکھ سکے۔ خود اپنے ہی دل میں اس کی جلوہ فرمائیاں دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

وہ دوسرے رومانی شعراء کی طرح حسن کا شیدائی ہے۔ اسی کو وہ اپنی کائنات سمجھتا ہے وہ اس دنیا کی عورت سے محبت کرتا ہے۔ عورت اس کے نزدیک مجسمہ شعر و نغمہ ہے۔ لذت اندوزی کا ذریعہ ہے جو اس کو سکون اس کے ذریعہ سے ملتا ہے۔ عورت ہی اس کا دین و ایمان ہے۔ عورت ہی اس کی دنیا ہے۔ وہ کبھی اس کو چاند ستاروں کی نیرنگیوں سے آراستہ کرتا اور کبھی سنگیت کو اس کے جسم کے تاروں میں بھرنا چاہتا ہے۔ یہ اشعار ان ساری چیزوں کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں ؎

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی ۔۔۔ میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری ۔۔۔ کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر گا نہیں سکتا
زباں پر بیخودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے ۔۔۔ اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

روداد غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں ... یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

وہ آ بھی جاتے، وہ ہو بھی جاتے ... چشمِ تمنا پھر بھی ترستی

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

بتاؤں کیا تجھے اے ہمنشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اس کی
وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے ماہ طلعت ہے
مرا ایمان ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اس کی

وہ اپنے قلم کی رعنائی سے ریل ٹکٹ کو ایک بانکی حسینہ بنا دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے حسن کو لذت اور اس کے جذبہ کو سرمایۂ مسرت سے مالا مال کر دیتی ہے۔

نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

ٹھوکریں کھا کر، لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی

مجاز کے یہاں دوسرے رومانی شعرا کی طرح راسخ رسوم اور کہنہ اداروں سے بیزاری کا جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ مذہب کا پابند رہنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ مذہب نے اس کی نظر میں ہمیشہ سیدھے سادے عوام کا گلا گھونٹا ہے۔ حکمراں طبقہ نے اس کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔ مذہبی ادارے اس کے جذبہ کی راہ میں سنگ گراں ہیں۔ وہ پرانے ہو چکے ہیں۔ وہ انسانیت کو ٹکڑیوں میں بانٹتے ہیں۔ اور اس کو عوام کی آزادی، ان میں مساوات اور خوش حالی کو دیکھنے کی تڑپ ہے سے

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

قدامت حد میں کھینچتی ہی رہے گی قدامت کی بنیاد ڈھائے چلا جا

جن چیزوں کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے وہ مجاز کی شخصیت کا جزو بن چکی تھیں اور انھیں کی چاندنی ہم کو ان کے اشعار میں بھی نظر آتی ہے جن اشعار کو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔قاضی عبدالغفار صاحب مجازؔ کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف کی خوب اشارہ کرتے ہیں ”مجازؔ ایک شاعر اور ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے مخصوص کردار کی وجہ سے بھی ایک دلچسپ شخصیت رکھتے تھے۔ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ اس حالت میں بھی جبکہ ان کی عمر کا بڑا حصہ انتہائی افلاس اور تنگ دستی کا مقابلہ کرتے گزرا انھوں نے اپنی شان استغنا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہ گذشتہ سال ہی کا واقعہ ہے کہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ حکومت ہند ان کے لیے کوئی امدادی وظیفہ مقرر کر دے اور اس کوشش میں کامیابی کی پوری امید تھی۔ درخواست کا فارم دوستوں کے پاس پڑا رہا اور اس بندۂ خدا نے اتنی پروا بھی نہ کی کہ اس پر دستخط کر دیتا۔ وہ ہمیشہ دولت اور ثروت کی نمود و نمائش سے بے پروا رہے اور اپنی اسی وضعداری کو سنبھالے ہوئے دنیا سے گذر گئے“۔ (خطبۂ صدارت، کل ہند سالانہ مشاعرہ۔ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین، علی گڑھ، منعقدہ ۱۴ دسمبر ۱۹۵۵ء)

مجازؔ سرمایہ داری نظام کی حقیقت کو بھی کما حقہٗ جانتا ہے۔ اس کو خبر ہے کہ ہمیشہ اس نے مزدوروں اور کسانوں کا خون چوسا ہے ان کے گلے میں طوق و سلاسل ڈالے ہیں۔ ان کو اپنا بے دام کا غلام بنایا ہے۔ اپنا پیٹ بھرا ہے اپنے کو آسودہ کیا ہے۔ وہ ایک رومانی شاعر کی طرح اس حکمِ بند کو غیر ضروری اور مہلک گردانتا ہے۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کو خوش، مسرور اور آسودہ دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف اس کی آواز میں بلا کی گھن گرج ہے۔ ایک صاعقہ بردوش انقلابیت ہے۔ ایک کڑک ہے۔ ایک تڑپ ہے کرب اور بےچینی ہے۔ سرمایہ داری کے متعلق کیا خوب کہتا ہے ؎

یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے

یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

مجازؔ کے یہاں اعلیٰ سنجیدگی جو بڑے بڑے شاعروں کا طرۂ امتیاز رہی ہے نہیں ملتی اس کے یہاں "مقدس سنجیدگی"، شائستگی، لہجہ کی نرمی، خیال کی پاکیزگی اور شاعری و شرافت کا جیتا جاگتا توازن نہیں ملتا۔

اس کا جسم، جذبہ اور ذہن تینوں ایسے ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر ثابت و سالم اور صحت مند نہیں ہیں ان میں آپس کی کھینچ تان ملتی ہے وہ اپنی اپنی جگہ پر قابض اور متصرف نہیں ہیں۔ وہ ہم کو ہر آن بچوں کے مانند بھولا اور بے تکلف نظر آتا ہے۔ اور جا بجا کھل کھیلتا ہوا ملتا ہے۔ اس کے یہاں دل و دماغ کا وہ توازن جو غالبؔ اور فیضؔ کے یہاں ملتا ہے مفقود ہے۔ یہی کچھ چیزیں ہیں جنھوں نے اس کو ایک CLASSICAL شاعر ہونے سے باز رکھا۔

علاوہ ازیں مجازؔ وہ گہری بصیرت بھی نہیں رکھتا جو "قطرہ" میں "دریا" اور "جز" میں "کل" کو خود دیکھنے اور دوسروں کو دکھانے پر مجبور کرتی ہے اس کے یہاں معمولی درجہ کا "مشاہدہ" اور معمولی درجہ کا "مجاہدہ" ملتا ہے اور وہ فیضؔ کے اس معیار پر پورا نہیں اترتا "یوں کہئے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے، گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤں میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر ہے" (دستِ صبا۔ ابتدائیہ۔ صفحہ ۸)

ہماری یہ رائے دوسروں کو تھوڑی گراں ضرور گزرے گی لیکن ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ مجازؔ کے یہاں اس درجہ کی پیکر تراشی خلاقی، صورت گری، موزونیت خد و خال کی دلاویزی بھی نہیں ملتی جو بڑے بڑے شعراء کے یہاں ملتی ہے۔ وہ فکر و نظر کے بدلتے ہوئے محوروں کو آئینہ بھی ٹھیک طرح پر نہیں دکھا سکتا۔ لیکن اس کے کلام کی تازگی اور توانائی سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا اور قاضی عبدالغفار صاحب کی زبان میں "اس کی شاعری کے جواہر ریزوں" کی عظمت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

راہی معصوم رضا

دیوانہ مرگیا

آج بے چین ہے کیوں گنج کی شاموں کا طلسم
ہر طرف جیسے اندھیرا سا ہے یہ کیا قصہ ہے
کیوں پریشان نظر آتی ہے کافی کی مہک
ایک دیوانہ نہیں آیا تو سناٹا سا ہے

پیالیاں آج کھنکنے سے بھی کتراتی ہیں
آس تحلیل ہوئی جاتی ہے مایوسی میں
قہقہے اوڑھ کے بیٹھے ہیں اداسی کی ردا
نغمے ڈوبے ہی چلے جاتے ہیں خاموشی میں

دل کے سرگم کا ہر اک بول ہے اک قطرۂ اشک
چپ ہیں بربط کے نئے اور پرانے سبھی تار
ہم بھی آواز دیں اس نغمۂ آوارہ کو
زندگی تجھ میں بھی جرأت ہو تو چل اس کو پکار

سن رہا ہوں کہ مجاز آج نہیں آئے ہیں
کاش یہ ایک لطیفہ کے سوا کچھ بھی نہ ہو
لکھنؤ تو ہی بتا کیسا تھا بیمار ترا
دوستو آج ہنسو اور ہنسو اور ہنسو

آخر اس رند بلانوش نے توبہ کر لی
جوشؔ صاحب کی نصیحت نے بڑا کام کیا
آج پھر ٹوٹ گیا شامِ اودھ کا جادو
اک مسافر نے سرِ راہ پھر آرام کیا

اے "گدازِ دلِ محروم" خبر ہے کہ نہیں
راہ ویران ہے تیرا وہ مسافر نہ رہا
بول پیبا کیِ عشقِ دلِ شاعر کچھ بول
جس کے ہر لفظ میں جادو تھا وہ ساحر نہ رہا

اتنے ہونٹوں کی ہنسی ساتھ گئی ہے اس کے
موت بھی سوچ رہی ہوگی کہ یہ کون آیا
میرے یا اس کے کسی دوست کے دامن سے الگ
کیا پتہ کتنوں کے دامن میں لہو ٹپکا ہے

کوئی زنجیر نہ بہلا سکی دیوانے کو
سینۂ موسمِ گل تیرے لئے اور اک داغ
"شہر کی رات" ! وہ "آوارہ" کہاں ہے آخر
"جگمگاتی ہوئی سڑکو" ! کوئی ہلکا سا سراغ

یا تو وہ رند چھپا ہے کسی "میخانے" میں
یا وہ ہوگا "کسی شہناز کے کاشانے" میں
اور اگر یہ بھی نہیں ہے تو سن لے وحشتِ دل
چل اسے ڈھونڈھنے چل اب کسی "ویرانے" میں

کون تھا وہ کہ میری آنکھ ہے نم اس کے لئے
نہ مرا دوست، نہ دشمن، نہ عزیز اور نہ رقیب
اس کو روئیں تو علی گڑھ کی فضائیں روئیں
اس کو رونا ہے تو وہ روئیں جو تھے اسکے قریب

جس کی ہر بات پہ چونک اٹھتی تھیں دیواریں تری
وہ رقیبِ حرم و دیر، وہ دیوانہ گیا
جس کے ہر نقشِ قدم میں کئی افسانے تھے
اے علی گڑھ کی گذرگاہ وہ افسانہ گیا

کعبۂ شعر و سخن! کیا ہے اب ان کمروں کا حال
جن میں "اسرار" سے فنکار بنا تھا کوئی
جن میں یہ لہجۂ نو پہلے پہل گونجا تھا
جن میں اک پھولوں کی تلوار بنا تھا کوئی

کس طرح سوچتے ہوں گے وہ در و بام آخر
جن در و بام نے آغازِ جنوں دیکھا تھا
جس تک آتے رہے اور آتے رہیں گے پیاسے
ہم نے اس جام میں پندار کا خوں دیکھا تھا

لوگ ہنستے رہے پیتے رہے چھلکاتے رہے
اب اُسے قبر کی گہرائی میں پھینک آئے ہیں
سوچتا ہوں کہ اسے قتل کیا ہے کس نے
نام کس کس کے بتاؤں کہ جو یاد آئے ہیں

میں بھی کیا، آپ بھی کیا، آپ بھی کیا، آپ بھی کیا
سب نے اس ساز کی رگ رگ سے لہو چوسا ہے
رفتہ رفتہ وہ بکھرتا رہا ہر سانس کے ساتھ
اب بچا کیا ہے نہ مطرب ہے نہ مضراب نہ لَے

ایک پیمانہ تھا جو ٹوٹ گیا ٹوٹ گیا
"اور بازار سے لے آئیں گے" پروا کیا ہے
کوئی مضمون لکھے اور کوئی نظم لکھے
"دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے"

ہو سکے تجھ سے تو اک بار پھر اے نجدِ مجاز
اٹھ کسی اور کے اب جیب و گریباں کو سنوار
جاگ اے شہر نگار! آج ترا قیس نہیں
اے علی گڑھ کسی دیوانے کو پھر بڑھ کے پکار

دل کے زخموں کو لطیفوں میں چھپانے والے
ختم ہوتا ہے یہ اندازِ وفا تیرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا تیرے بعد"

میرا کیا اور مرے اشکوں کی قیمت ہی کیا
"بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا تیرے بعد"
کون بتلائے کہ حیران ہیں کتنے گیسو
"کتنے ناخن ہوئے محتاجِ حنا تیرے بعد"

ذہن نے موت کی ہر بات کو جھٹلایا ہے
"یہ ستمگر ترے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا"
اے خود اپنے ہی مذاقِ طرب آگیں کے شکار
"تو نے چاہا تھا کہ مر جائے سو وہ بھی نہ ہوا"

اُردو ادب کا شیلی — اسرار الحق مجاز

کاظم علی خاں

۱۸۲۲ء میں مرنے والے انگریزی ادب کے رومانی شاعر (SHELLEY) شیلی کی ۱۹۵۵ء میں دوبارہ وفات ہوئی ۱۹۵۴ء نے ہم سے اردو ادب کے بہت سے ادیب جدا کئے اور ۱۹۵۵ء نے جاتے جاتے اردو ادب کے SHELLEY شیلی یعنی مجاز کو ہم سے جدا کر دیا۔ وہ مجاز جو شیلی کی طرح "غنائی شاعر" تھا جو شیلی کی طرح سماج کے فرسودہ نظام سے تنگ آچکا تھا۔ جو شیلی ہی کی طرح پرانے رسوم کے قصر ڈھانا چاہتا تھا جو شیلی کی طرح مذہب کے جھوٹے دعویداروں کے چہروں پر سے نقاب ہٹاتے ہوئے ذرا بھی نہ ڈرتا تھا۔ جو شیلی کی ہی طرح عالم بنی نوع انسان سے محبت کرتا تھا۔ جو شیلی ہی کی طرح بیمار ہو کر بھی بیمار سماج کا مسیحا تھا وہی مجاز! جو اردو ادب کا رومانی شاعر تھا اب ہم میں نہیں رہا۔ وہ مجاز جس نے منٹو کی موت پر چند ماہ پہلے کہا تھا "اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے" جس نے اپنے متعلق کہا تھا "میری باتوں میں مسیحائی ہے — لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں" جسے لوگ آوارہ و مجنوں کہتے تھے۔ جو ایک دیوانہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جس پر کفر کے فتوے عائد کر دیئے گئے تھے آج ہم سے دور تمام الزامات سے بے نیاز موت کی آغوش میں چین کی نیند سو رہا ہے۔ زندگی کے گیت گانے والے "نوع انسان کے پرستار" کو اب موت کے فرشتہ نے ہمیشہ کے لئے خاموش کر کے نوع انسان سے جدا کر دیا ہے اور ہم اسی کے الفاظ میں اسے اس طرح یاد کرنے پر مجبور ہیں۔ شعر۔

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

آئیے دیکھیں کہ جس کا غم نہ صرف آپ اور ہم بلکہ سارا اردو ادب کر رہا ہے اس نے اردو ادب کے لئے کیا کیا؟ آخر وہ کون سی خوبیاں ہیں جو ہمیں اس "آوارہ"، "دیوانے" اور "شرابی" کی موت پر آنسو بہانے پر مجبور کر رہی ہیں۔ آئیے غور کریں کہ اس بارہ بنکی کے شاعر نے لکھنؤ میں رہ کر علی گڈھ اور دہلی کے لئے کیا کیا جس کی بنا پر ہم اور آپ ملک سب ہی متاثر ہیں اور "علی گڈھ میگزین" نے اس سال اس کو اس قدر اہمیت دی ہے۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان کا جائزہ لے کر اس کے کلام کے ہر پہلو پر الگ الگ روشنی ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کا کلام جو اس کی زندگی کا سرمایہ ہے کس حد تک کھرا اور کس حد تک کھوٹا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ کس درجہ کا شاعر تھا۔

سب سے پہلے تو آپ کی توجہ اس کے کلام کے اس پہلو کی طرف مبذول کرانا ہے جس پر "آہنگ" کے دیباچہ میں فیض احمد فیض نے روشنی ڈالی ہے۔ فیض نے مجازؔ کے کلام کے خارجی پہلو پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مجازؔ "بنیادی طور پر طبعاً "غنائی شاعر" تھا وہ ہمیشہ گاتا رہا ہے اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن اس کے آہنگ میں فرق نہ آیا۔" اور واقعی مجازؔ کے کلام کی یہ صفت اس کے دیوان پر ایک سرسری نظر ڈالنے والے کو بھی نہایت آسانی سے ملجائے گی۔ اسی "غنایت" کی بنا پر مجازؔ اردو ادب کا شیلیؔ کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اس کے شعروں میں روانی ہوتی ہے جو سننے میں بھلی اور پڑھنے میں اچھی معلوم ہوتی ہے یہی "روانی" یا "غنایت" کبھی "آج کی رات میں"، نظر آتی ہے تو کبھی "رات اور ریل" ریل کی طرح رواں دواں معلوم ہوتی ہے۔ نظم "آج کی رات" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں نغمہ کی سی "غنایت" بدرجہ اتم موجود ہے۔

۱۔ دیکھنا جذب محبت کا اثر آج کی رات	میرے شانوں پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات
۲۔ نغمہ و مے کا یہ طوفان طرب کیا کہنے	گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات
۳۔ وہ تبسم ہی تبسم کا جمال پیہم	وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات
۴۔ نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں نظریں	حسن ہی حسن ہے تا حد نظر آج کی رات

یا نظم "رات اور ریل" کی مسلسل روانی اور غنائی کیفیت سے لطف اندوز ہوئیے ۔

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی — نیم شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی
تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بہ دم — رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر، لچکتی گنگناتی جھومتی — سرخوشی میں گھنگروؤں کے تال پر گاتی ہوئی

بقول فیض "غنائیت ایک کیمیاوی عمل ہے جس سے معمولی روزمرہ کے الفاظ عجیب پراسرار و پر معنی صورت اختیار کر لیتے ہیں ——— یہی غنائیت مجاز کو اپنے دور کے دوسرے شعراء سے ممیز کرتی ہے" اس غنائیت کی وجہ سے" مجاز کے شعروں میں تھکن نہیں مستی ہے ۔ اداسی نہیں سرخوشی ہے ——— مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے ۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ وہ صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں اس کے حسن کو نہیں پہچانتے ——— ان میں انقلاب کی قاہری ہے دلبری نہیں ——— مجاز انقلاب کا ڈھنڈھورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔

مجاز کے کلام کے اس اہم خارجی پہلو کو سمجھنے کے بعد اب ہمیں اس کی شاعری کے داخلی پہلو کی طرف مڑنا چاہیئے ۔ مجاز کے دیوان "آہنگ" کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شروع شروع میں مجاز نے بھی دوسرے عام شعراء کی طرح بغیر کسی خاص مقصد کے نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں ۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں اس کی ایک اہم نظم "ایک دوست کی خوش مذاقی پر" نے ہمیں اس بات کے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مجاز ان عام شاعروں سے الگ ہو کر ایک خاص راستے پر آگیا ہے جو اسے انگریزی ادب کے رومانی شاعر SHELLEY شیلی (WORDSWORTH) ورڈسورتھ اور (KEATS) کیٹس کی طرف لئے جا رہا ہے ۔ اس کی اس نظم میں ان رومانی شاعروں کی سی فطرتی شاعری (NATUR POETRY) کی جھلک نظر آتی ہے ۔ اسی راہ پر وہ آگے بڑھ کر بعد میں ان سب سے الگ ہو جاتا ہے اور SHELLEY شیلی کے قریب آجاتا ہے ۔ نظم "ایک دوست کی

خوش مذاقی پر" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

۱۔ ہو نہیں سکتا تری اس خوش مذاقی کا جواب — شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
۲۔ رکھ بھی دے اب اس کتاب خشک کو بالائے طاق — اڑ رہا ہے رنگ و بو کی بزم میں تیرا مذاق
۳۔ دیکھ کر یہ شام کے نظارہ ہائے دل نشیں — کیا ترے دل میں ذرا بھی گدگدی ہوتی نہیں
۴۔ حسن فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں — میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

اسی مضمون پر شاعر فطرت ورڈسورتھ نے بھی چند اشعار لکھے ہیں وہ بھی فطرت کی رنگینی کے مقابلے میں کتاب کو پھینک دینے کی تلقین کرتا ہے۔

(1) BOOKS 'TIS A DULL AND ENDLESS STRIFE
COME, HEAR THE WOOD – LAND LINNET
HOW SWEET IS HIS MUSIC ON MY LIFE
THERE'S MORE OF WSDOM IN IT,

(2) ONE IMPULSE FROM A VERNAL WUOD
MAY TEACH YOU MORE OF MAN
OF MORAL EVIL AND OF GOOD
THAN ALL THE SAGES CAN.

۱۹۳۳ء کی نظم "رات اور ریل" کے آخری حصہ میں مجاز کا زاویہ نگاہ ورڈسورتھ سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ورڈسورتھ کو فطرت کے نظاروں میں سکون ملتا ہے لیکن مجاز ان میں انقلاب کی سرگرمیاں پاتا ہے اور یہیں سے وہ ورڈسورتھ سے الگ ہو کر شیلی کے قریب آجاتا ہے۔ اب اس کی نظر میں ایک خاص مقصد نظر آتا ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے بعد میں واضح طور پر نظمیں لکھیں اور اپنی انھیں نظموں کی بنا پر وہ مشہور ہوا۔ ریل رات کے سناٹے میں رواں ہے۔

۱۔ جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار | اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
۲۔ آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی | شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
۳۔ زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر | ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
۴۔ ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے | ایک طوفانی گرج کے ساتھ دراتی ہوئی
۵۔ ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار | عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
۶۔ وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے | وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی
۷۔ الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بےخوف و خطر | شاعر آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

اس نظم کے بعد مجازؔ نے ۱۹۳۳ء ہی میں ایک دوسری نظم "انقلاب" لکھکر صاف صاف اعلان کر دیا کہ اس کی شاعری محض شاعری کے لئے نہیں کہ جس سے لطف اندوز تو ہوا جا سکتا ہے لیکن کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ محبت اور رومان کے گیت گانے والا شاعر اس نظم میں عہد کرتا ہے کہ جب تک اس کا مقصد پورا نہ ہوگا وہ نظموں اور طربیہ شاعری کی طرف نہ رخ کرے گا۔ اب اس میں ایک ذہنی تبدیلی ہو چلی تھی۔ یہیں سے مجازؔ نے فریاد کا پہلو بدلنا سیکھا اور آگے بڑھکر اس رجحان میں اس سے بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی مجازؔ نے حکومت سرمایہ دار۔ مولوی اور یہاں تک کہ خدا بلکہ ہر صاحب امتیاز پر اپنے نقطۂ نگاہ سے سخت سے سخت تنقید کی ہے۔ یہیں سے اس کو اپنی غلامی کا احساس ہوا اور اس نے ملک کو آزاد کرانے کا عہد کیا انگریزوں کے خلاف آواز اٹھا کر ایسی حکومت کا مطالبہ کیا جو رعایا کی پوری نمائندگی کرے اور ہر شے کی ذمہ دار ہو جائے ملک کی ساری دولت حکومت کی ہو اور حکومت رعایا کی۔ ملک کے تمام اخراجات کی ذمہ دار حکومت ہو جائے۔ تاکہ کسی شخص کو زندگی بسر کرنے میں تکلیف نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں مجازؔ نے روس کے "کارل مارکس" کے نظریہ کو پیش نظر رکھ کر اشتراکیت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ قانون کی رو سے بچتے ہوئے وہ اپنا خیال عوام میں پھیلانے لگا۔

۱۹۲۹ء میں جواہر لال نہرو نے لاہور کانگریس کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں
اشتراکیت کی پسندیدگی کا اظہار کیا اور ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کانگریس کے اجلاس میں اسے عام
کرنے کی باقاعدہ کوشش کی۔ اشتراکیت کا اثر نہ صرف روس اور ہندوستان پر پڑا بلکہ
ساری دنیا اس سے متاثر ہوئی۔ جرمنی میں ہٹلر کے جبر و استبداد اور فسطائیت نے
تمام ملکوں کے اہل علم کو پریشان کردیا جمہوری نظام پر آنچ آتے دیکھ کر ۱۹۳۶ء میں
دنیا کے تمام نامور علم داں اور علم دوست پیرس میں جمع ہوئے۔ اور فسطائی نظام حکومت
کی مخالفت کرکے ادب سے زندگی و سکون کے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد
کو عمل میں لانے کے لئے ایک انجمن ترقی پسند مصنفین بنائی گئی جس کی شاخیں دنیا کے
ہر حصہ میں قائم ہوگئیں۔ سب کا مقصد یہ تھا کہ ادب کو صرف جذبات نگاری اور
فن کاری کے لئے نہ وقف کیا جائے بلکہ زندگی کے قریب تر کردیا جائے۔ اور بقول ڈاکٹر
اعجاز حسین ادب کے ذریعہ "مزدور، کاشتکار، مفلس، مظلوم کی سرگذشت بیان کرکے
دنیا کو ان کا ہمدرد بنایا جائے اور ان کی اہمیت جتا کر ان کو ابھارا جائے تاکہ وہ اپنی حالت
درست کرسکیں۔ اسی کے برخلاف سرمایہ داری، توہمات، ظلم، جبر و استبداد،
فاشیت، نازیت وغیرہ کے برخلاف نظم و نثر میں مضامین لکھے جائیں ...... ہمارے
موجودہ نظم و نثر لکھنے والے اکثر اسی انجمن سے تعلق رکھتے ہیں،، مجاز نے بھی اپنی شاعری
کا انداز اسی انجمن کے رویہ کے مطابق رکھا۔ اب وہ محض ایک "غنائی شاعر" نہ رہا اس کی
گفتار میں جوش و ہمت کی جھلک اور اس کی رفتار میں سپاہیانہ انداز تھا اس کا مذہب
خدمت خلق اور ایمان آزادی ہوگیا۔ اس کے دل میں ایک نیا درد پیدا ہوگیا "جو مزہ
لینے کے لئے نہیں رگ عمل میں خون دوڑانے کی خاطر تھا"، اس کے لب و لہجہ میں قنوطیت
کے بجائے رجائیت نظر آنے لگی۔ اس نے اس طبقہ کی طرف رخ کردیا جسے اقبال نے کسان
اور مزدور کا لقب دیا تھا۔ اس کی شاعری نے اس طبقہ کی طرف ہر ایک کی نظر التفات موڑدی

مجازؔ کی شاعری میں ایک خاص اعتماد نظر آنے لگا۔ اس کا مقصد ہندوستانیوں کو احساس کہتری اور بزدلی کے جذبہ سے نجات دلا کر جدوجہد کے میدان میں لانا بن گیا۔ اس نے ۱۹۳۳ء میں نظم "انقلاب" لکھکر اپنے ذہنی ارتقا کی اس نئی منزل میں قدم رکھا جو اسے خالص ترقی پسند" اشتراکی اور انقلابی شاعر بنا دیتی ہے۔ اس کے لئے مطرب کے پر اثر نغمے قومی کاموں میں رخنہ ڈالتے تھے اس کو موسیقی کی سحر کاری اور اثر سے انکار نہیں تھا لیکن چونکہ یہ سحر کاری اس کے مقصد کی راہ میں رکاوٹ تھی لہٰذا اس سے وہ اس وقت تک الگ رہنا چاہتا تھا جب تک کہ مقصد نہ حاصل کرلے۔ نظم "انقلاب" کے چند جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں

۱۔ چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے — کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

۲۔ تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر — بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمن ادراک پر

۳۔ یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دل بیتاب میں — بہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں

۴۔ چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو — آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خون آرزو

۵۔ میں نے مانا وجد میں دنیا کو لا سکتا ہے تو — میں نے یہ مانا غم ہستی مٹا سکتا ہے تو

۶۔ مجھکو تیرے سحر موسیقی سے کب انکار ہے — مجھکو تیرے لحن داؤدی سے کب انکار ہے

۷۔ بزم ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ — ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ

۸۔ پھینکدے اے دوست اب بھی پھینکدے اپنا رباب — اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب

۹۔ آرہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے — آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

۱۰۔ بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے — اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے

۱۱۔ ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام — رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام

۱۲۔ اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق — آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگ شفق

۱۳۔ اور اسی رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

اس نظم کے علاوہ بھی وہ مطرب اور طربیہ شاعری سے بیزار نظر آتا ہے۔ ذیل میں اس کی مختلف نظموں اور غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں مجاز نے اپنے ذہن کی اس نئی تبدیلی کی طرف کہیں مبہم اور کہیں واضح طور پر اشارے کئے ہیں

۱۹۳۳ء کی ایک نظم "دلی سے واپسی" کے آخری شعر میں مجاز نے اس کیفیت کو صاف طور پر بیان کیا ہے۔ ۵۰

فطرت دل دشمن نغمہ ہوئی جاتی ہے اب ۔۔۔ زندگی اک برق اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب

اسی سال کی ایک غزل کا شعر بھی ملاحظہ فرمائیے۔

آہ تو بے اثر تھی برسوں سے ۔۔۔ نغمہ بھی بے اثر ہے کیا کہئے

۱۹۳۷ء کی ایک نظم "نوجوان سے" کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ ۔۔۔ تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر

۱۹۴۰ء کی ایک نظم "گریز" کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

قسم نطق کی شعلہ افشانیوں کی ۔۔۔ کہ شاعر تو ہوں اب غزل خواں نہیں میں

اور غرض طربیہ شاعری سے الگ رہنے کا ۱۹۳۳ء میں کیا ہوا عہد اس وقت تک مجاز نے نہ توڑا جب تک اسے ملک کی آزادی کی قوی امید نہ ہوگئی۔ اور ۱۹۴۵ء میں آخر مجاز کو جب ملک کے آزاد ہو جانے کا یقین ہو گیا تو وہی مجاز ایک مرتبہ پھر گنگنانے لگا۔ اس نے پھر طربیہ نغمات گانا شروع کر دیئے۔ ۱۹۴۵ء کی ایک نظم "آج" کا ایک شعر ملاحظہ ہو

پھر مرے لب پر قصیدے ہیں لب رخسار کے ۔۔۔ پھر کسی چہرے پہ تابانی سی تابانی ہے آج

لیکن مجاز نے انقلابی شاعری اس وقت تک جاری رکھی جب تک کہ ملک میں انقلاب نہ آگیا۔ کہیں وہ اپنی محبوبہ سے یہ کہتا نظر آتا ہے۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن ۔۔۔ تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

کہیں وہ نوجوانوں سے خطاب کرتا نظر آتا ہے۔

جلال آتش و برق و سحاب پیدا کر — اجل بھی کانپ اٹھے تو وہ شباب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار پیدا کر — جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

کہیں وہ سرمایہ داری کے خلاف نعرہ بلند کرتا ہے۔

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے — بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ وہ آندھی ہے جس کی زد میں مفلس کا نشیمن ہے — یہ وہ بجلی ہے جسکی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ انسانی بلا خود خون انسانی کی گاہک ہے — وبا سے بڑھ کے مہلک موت سے بڑھ کر بھیانک ہے
کہیں یہ خوں سے فرد مال زر تحریر کرتی ہے — کہیں یہ ہڈیاں چن کر محل تعمیر کرتی ہے
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے — محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے — یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

کہیں وہ شیلی کی طرح سماج کی بندشوں کا شکوہ کرتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اپنی ۱۹۳۹ء کی ایک نظم "شکوۂ مختصر" میں وہ کس طرح زمانے کی بندشوں اور فرسودہ نظام کے نقصانات کا شکوہ کرتا ہے۔

مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے — نہ لینے دی جنھوں نے فطرت شاعر کو انگڑائی
مجھے شکوہ نہیں افتادگان عیش و عشرت سے — وہ جن کو میرے حال زار پر اکثر ہنسی آئی

زمانے کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانین کہن آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

اسی چیز کا شکوہ شیلی نے بھی کس خوبی سے کیا ہے۔ مجاز کی طرح وہ بھی اپنی مشہور نظم (ODE TO THE WEST WIND) میں مضطرب نظر آتا ہے۔

OH! LIFT ME AS A WAVE, A LEAF, A CLOUD
I FALL UPON THE THORNS OF LIFE! I BLEED!
A HEAVY WEIGHT OF HOURS CHAINED AND BOWED

ONE TO LIKE THEE | LAMELESS, AND SWIFT AND PROUD

ایک دوسری جگہ شیلی نے پھر کہا ہے۔

(1) ALAS! I HAVE NOR HOPE NOR HEALTH
NOR PEACE WITHIN NOR CALM AROUND
NOR THAT CONTENT SURPASSING WEALTH
THE SAGE IN MEDITATION FOUND

(2) NOR FAME, NOR POWER, NOR LOVE NOR LEISURE
OTHERS I SEE WHOM THES SURROUND
SMILING THEY LIVE AND CALL LIFE PLEASURE
TO ME THAT CUP HAS BEEN DEALT IN ANOTHER MEASURE

بالکل شیلی کی طرح مجاز بھی سماج کے خلاف اس وقت آواز اٹھاتا ہے جب اس کی مجبوریاں حد سے گذر جاتی ہیں۔ جب سماج کی بندشیں اس کو اس کی محبوبہ تک سے نہیں ملنے دیتیں تو وہ انتہائی کرب کے عالم میں بالکل اسی طرح فریاد کرتا ہے جیسے شیلی نے اوپر کے دو بند STANZAS میں کی ہے۔ اس کی ۱۹۳۰ء کی نظم "مجبوریاں" کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔ مجاز بھی شیلی کی طرح سماج کا ستایا ہوا تھا۔

۱۔ میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا
سکوں ہرگز مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا

۲۔ کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا

۳۔ وہ مجھکو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اسکو پوجتا ہوں اور اسکو پا نہیں سکتا

۴۔ یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اسکے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا

۵۔ کہاں تک قصۂ آلامِ فرقت مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا

۶۔ حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

مجازؔ کے بھی سینہ میں شیلی کی طرح محبت سے بھرپور دھڑکتا ہوا دل تھا۔ اس نے بھی شیلی کی طرح محبوبہ سے وصل کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے نہایت عمدہ اور پر اثر دلائل پیش کئے ہیں۔ شیلی اس سلسلے میں اپنی نظم LOVE'S PHILOSOPHY میں کہتا ہے۔

A FOUNTAIN MINGLE WITH THE RIVER
AND RIVERS WITH THE OCEAN,
THE WINDS OF HEAVEN MIX FOR EVER
WITH A SWEET EMOTION;
NOTHING IN THE WORLD IS SINGLE
ALL THINGS BY A LAW DIVINE
IN ONE ANOTHER'S BEING MINGLE
WHY NOT I WITH THINE?

مجاز بھی بالکل اسی انداز میں اپنی محبوبہ سے وصل کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے طرح طرح کے دلائل پیش کرتا ہے۔

اس کی نظم "نذرِ دل" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں — کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں
۲۔ میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی — تم کو بزمِ ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں
۳۔ تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لئے — گیت گا سکتا ہوں میں آنسو بہا سکتا ہوں میں
۴۔ جذب ہے دل میں مرے دونوں جہاں کا سوز و ساز — بربطِ فطرت کا ہر نغمہ سنا سکتا ہوں میں
۵۔ تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر — مجھکو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

۶۔ آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

آخر میں مضمون کو ختم کرتے ہوئے ہم پھر کہیں گے کہ مجاز اردو ادب کا شیلی تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ سماج کی جھوٹی بندشوں اور فرسودہ نظام کا قصر ڈھا دے کہیں اس نے سرمایہ داری کے منہ پر طمانچہ مارا ہے کہیں وہ خانہ بدوشوں کی زندگی اور ان کے ساتھ سماج کے ناروا سلوک کو برا بھلا کہتا نظر آتا ہے۔ انسانیت کے رشتے اس کو خانہ بدوشوں سے پیارا ہے وہ کہتا ہے۔

یہ کیوں سشریک حلقۂ نوع بشر نہیں
انسان ہی تو ہیں یہ کوئی جانور نہیں

یہ "نوع انسانی کا پرستار" واقعی انسانوں سے محبت رکھتا تھا۔ اسی انسانوں کی محبت نے اسے مذہب کے غلط اثر اور مذہب کے جھوٹے ٹھیکیداروں کا مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنی مشہور نظم "خواب سحر" میں اس نے مذہب کے غلط اثر کی مذمت کی ہے اس نے مذہب کے ٹھیکیداروں کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ انسان پر مذہب کو ترجیح دی جائے۔ اس کی نظر میں انسان مذہب سے زیادہ اہم ہے۔ وہ مذہب کو انسان کے لئے سمجھتا تھا نہ کہ انسان کو مذہب کے لئے۔ اس کا مذہب انسانیت تھا اور ایمان خدمت خلق۔ "خواب سحر" کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر — رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
۲۔ اک نہ اک مذہب کی سعیٔ خام بھی ہوتی رہی — اہل دل پر بارش الہام بھی ہوتی رہی
۳۔ حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی — ابر رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی
۴۔ مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے — مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے
۵۔ آدمی منت کش ارباب عرفاں ہی رہا — درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا
۶۔ اک نہ اک در پر جبین شوق گھستی ہی رہی — آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
۷۔ رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی — دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی

۸ - یہ مسلسل آفتیں یہ یورشیں یہ قتلِ عام — آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام
۹ - ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں — زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
۱۰ - کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے — جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

اتنا کچھ لکھنے کے بعد اب مجھے پوری امید ہے کہ آپ کو مجازؔ کی صحیح حیثیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا - آخر میں چلتے چلتے آیئے مجازؔ ہی کی زبان سے اس کا تعارف کرایا جائے - جس میں اس نے اپنی ہر صفت کو نہایت ہی مختصر طور پر بڑے پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے -

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں — جنسِ الفت کا طلب گار ہوں میں
چھیڑتی ہے جسے مضرابِ علم — سازِ فطرت کا وہی تار ہوں میں
عیب جو حافظؔ و خیامؔ میں تھا — ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں
زندگی کیا گناہِ آدم ہے — زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں
کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے — اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں
میری باتوں میں مسیحائی ہے — لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں — نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

کنور اخلاق محمد خاں

غزل

(نذرِ مجاز)

ایک اک بوند کی خاطر ہوئے رسوا ہم لوگ
ہائے کتنے ہیں خرابِ مے و مینا ہم لوگ

اور کچھ مل نہ سکا ہم کو اُداسی کے سوا
آرزو تھی کہ بسائیں تری دُنیا ہم لوگ

یہ الگ بات ہے ساقی نے قسم کھائی ہو
توڑ دیتے ہیں اشاروں ہی پہ توبہ ہم لوگ

تشنگی آج گوارا ہے کہیں غیر سے کیا
کوئی اپنا ہو تو کرتے ہیں تقاضا ہم لوگ

بے وفا لاکھ کہیں تجھ کو مگر یہ سچ ہے
آئیں گے پھر ترے کوچے میں دوبارا ہم لوگ

اے کنور آج نہیں بزمِ نگاراں میں مجاز
پھر بھی کیا کم ہے علی گڑھ میں ہیں زندہ ہم لوگ

مجازؔ کی شخصیت اور فن
(نقادوں کی نظر میں)

قمر رئیس

ترقی پسند شعرا کی صف میں فیضؔ اور مجازؔ ہی وہ عظیم فنکار ہیں جن کی شاعری کو تمام حلقوں نے خواہ وہ کسی فکر و خیال کے ہوں پہنایا سراہا اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی۔ بعض بلند پایہ ادیبوں اور ناقدوں نے اپنے مقالوں انتخابوں اور تاریخ ادب میں مجازؔ کی شاعری کو فراخدلی سے جگہ دی اور اس کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ گزشتہ سالوں میں جب اس نے طویل خاموشی اختیار کی تو ہمارے ناقدوں کے قلم بھی کچھ اونگھ سے گئے اور اب جبکہ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہے، وہی قلم اپنی ساری جولانیوں کے ساتھ بیدار ہو گئے ہیں۔ اب آپ "یادگار نمبروں" میں مجازؔ کی شخصیت اور اس کے فن کے بارے میں بہت کچھ پڑھیں گے اور پڑھتے رہیں گے۔

یہاں میں نے بعض ایسے اہم اور گرانقدر مضامین کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں مجازؔ کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے ہیں اور جن میں مجاز کی شخصیت اور اس کے فکر و فن کے اساسی پہلو روشن ہو گئے ہیں۔ ہر مضمون کے اہم اور مختلف حصوں کو اس طرح مربوط کرنے کی کوشش کی ہے کہ لکھنے والے ہی کے الفاظ میں مضمون کا خلاصہ ہو جائے لیکن کہیں کہیں ربط و تسلسل قائم رکھنے کے لیے مجھے ایک آدھ الفاظ یا جملوں کا اضافہ بھی کرنا پڑا ہے جس کے لیے صاحب مضمون سے معذرت خواہ ہوں۔

عصمت چغتائی

جب چراغ میں تیل نہیں رہتا تو وہ خاموش ہو جاتا ہے اور جب شاعر یا ادیب گنگ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کا پیارا ہو جاتا ہے ...... تو بی الحال مجازؔ بھی چل بسے ..... غم دل، ویرانۂ دل کی وحشتیں کھسیا گئیں بچپن کے خواب سائے بن کر دھندلے ہوئے اور پھر مٹ گئے۔ اور اس پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی۔

خاک اور دھول کی دنیا میں ایک پھول نے اپنا مغرور سر بلند کیا اور چمن مہک اُٹھا۔ دیوتاؤں نے آسمان سے جھک کر اُسے دیکھا اور اُسے چُن کر اپنے عظیم الشان باغ میں سجا دیا۔ ادھر سے آئی میٹھی میٹھی آنکھوں والی پریوں کی شہزادی!

"اے پھول تم کتنے حسین ہو" اس نے کہا اور پھول پنکھڑیاں پھیلا کر غبارہ بن گیا۔

"تو مجھے اپنے بالوں میں لگا لو نا" پھول نے کہا۔

"نہیں میرے حسین پھول تم اسی طرح مہکے جاؤ اور میں تمہیں دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی رہوں گی، تبھی شہزادی نے اپنی میٹھی آنکھوں میں آنسو چھلکائے۔

"دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں" پھول نے بازو پھیلا دیئے۔

"شاعر اپنا دل اور آنکھیں سمیٹ لو۔ میرے قدم تو اطلس و کمخواب کے عادی ہیں اور میرے جوڑے میں لگانے کے لیے سونے کا پھول موجود ہے"!

پھول کی ساری التجائیں بیکار گئیں۔

شہزادی کے جوڑے میں سونے کا پھول سورج جیسی آب و تاب سے جگمگاتا رہا جس کی تمازت سے اس بیچارے خاکی پھول کی ساری پنکھڑیاں ایک ایک کر کے مرجھا گئیں اور پھر ٹھونٹھ رہ گیا۔

جب دیوتا نے پھول کی اس بدمذاقی کو دیکھا تو بُرا مان گئے وہ اُسے لائے تھے کھلنے اور مہکنے کے لیے اکتا کر وہ اسے واپس اجڑی ہوئی دھرتی کی گود میں ڈال گئے

مجازؔ کی زندگی کی طرح ان کی صورت شکل بھی کچھ الجھی الجھی سی ہے۔ تاثرات کی چہرے پر دھند سی ہے

کہ نقش و نگار کچھ سے کچھ بنکر رہ گئے ہیں۔ آنکھیں تو ہیں مگر یہ اندازہ لگانا از حد مشکل ہے کہ ان کی تہ میں کیا ڈوبا ہوا ہے۔ ایک مبہم سی یاس و نا امیدی، مگر ساتھ ساتھ کچھ بنانے کا ارمان، کچھ ڈھانے کا حوصلہ، کچھ الجھنیں اور پریشانیاں جو آج کل کے ہر نوجوان کا آبائی حق بن کر چمٹ گئی ہیں۔

اور ایک ناک جو ستواں کی حدود سے کب کی گذر چکی ہے جس کی ہڈی شاید بڑھ رہی ہے اور چہرہ چھوٹا پڑتا جا رہا ہے اور نہایت ڈرپوک قسم کا سہما ہوا دہانہ جو اپنے مالک کے سریع الحس اور جذباتی ہونے کا علمبردار ہے۔ ناک نقشہ کے حساب سے ہاتھ پیر بھی ہیں پر بال جی بھر کے ملے ہیں جن کے ایک کنارے پر کسی زمانہ میں کھدر کی ایک ٹوپی اس طرح معلق رہا کرتی تھی کہ ہر وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب گری اور اب گری۔ اور شاید عزیب کہیں گر ہی پڑی سدور ہمالیہ سے نکلنے والے سرکش دھارے کی لپیٹ میں آکر بہہ گئی اور اس کی جگہ بالوں والی جاپانی پوشی سے ملتی جلتی کیپ سے لے لی۔ لیکن وہ بھی کہیں لال پیلی آندھیاں اُڑا لے گئیں۔ اور آج کل جب میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں مجاز کے سر پر کوئی شے نہیں سوار ہے جھوٹ سچ کا عذاب راوی کی گردن پر مگر سنتے ہیں کہ اُڑان کے زمانہ میں کہیں ایسے بے موقع پھسل پڑے تھے کہ توبہ بھلی یعنی کہیں بالکل شجر ممنوعہ قسم کی محبوبہ پہ پھسل پڑے جو اپنی آبائی مجبوریوں کے باعث عشق کے میدان میں تو اُتر آئی مگر جرنس کے معاملہ میں رہ گئی۔ اور بھئی ہے بھی پکی بات کہ عشق تو اندھا ہوتا ہے پر قاضی اندھے نہیں ہوتے۔ خیر تو نہ جانے کیا بیتی چہرے کی بجھی بجھی چنگاری بتاتی ہے کہ کچھ مزے کی نہیں بیتی۔

مجاز کے یہاں عشق و سیاست باہم سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بھلا زندگی میں جب اتنی "مجبوریاں" ہوں تو کوئی کیا کرے۔ ایسی صورت میں

کوئی نغمہ تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے

پر ایسا ہوتا تو رونا ہی کاہے کا تھا بھلے ہی دن نہ تھے؟ ساز چھوڑنے پہ کون تیار رہے۔ سو ہی مرنے کی ایک ٹانگ کہ

لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری عادت نہیں

پھر یہی مجبوریاں اور لاچاریاں ضدیں بن گئیں۔ چار دن کی ریڈیو کی نوکری ختم ہو گئی منہ پر طمانچہ سا لگا

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلد علیگڑھ کی ہزاروں محفلیں

مگر چلتے چلتے باز نہیں آتے۔

پھر تری بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
ایسے ویسے نہیں بڑی دھوم دھام سے
سر سے پا تک ایک خونیں آگ بن کر آؤں گا

مجاز کا عشق کچھ اس بُری طرح اس دنیا اور اس کے نظام سے چپکا ہوا ہے۔ کہ وہ اُسے جُدا ہی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی گھر چاند سی دلہن کے پرزور مکھڑے کی دمک سے روشن نہیں ہو سکتا جب تک ملک پر سے یہ بھیانک بیوگی نہ ہٹائی جائے گی۔ ایک ہی سانس میں وہ محبوب کے رخسار کی تلیا بیل کے نغمے بھی گاتا ہے اور اُن گھنگور گھٹاؤں کا نوحہ بھی کرتا ہے جو اس کے رُخ روشن پر چھائی ہوئی ہیں۔

ایک چیز جو مجاز کے یہاں پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے شاعر میں اتنی واضح اور اُبھری ہوئی نہیں ہے محبوب اور عورت کا تصور بے حد انوکھا اور اصول شاعری سے ہٹا ہوا ہے۔ پرانی شاعری میں محبوب حسن و جمال کی پوٹ ہوتا تھا۔ اس کے سارے انداز نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا معشوق ہی کا ذکر ہے یا کسی جابر و قہار شہنشاہ کا ذکر ہے جسے عشقیہ غزل میں سمو دیا گیا ہے۔ غرض ان کے یہاں سوائے خوبصورت زبان اور تشبیہات کے انسانی حسن کہیں نظر نہیں آتا۔ مجاز وہ شاعر ہے جس کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔

" میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دُنیا کی عورت ہے۔" اس دُنیا کی عورت جسے آپ روز چلتا پھرتا دیکھتے ہیں۔ یہی نہیں مجاز نے عورت کو پہلی بار عورت نہیں کہا بلکہ اُسے نکتہ داں بھی بنا دیا حسن کے ساتھ ساتھ

مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُس کی

باوجود کہنہ خیال لوگوں کی چیخ و پکار کے مجاز کے تخیل کی عورت نے دنیا میں قدم رکھ دیا ہے اور بڑھائے چل رہی ہے اور مجاز کی التجا کہ

سنا ہیں کھینچ لی ہیں سر پھرے، نئی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

خالی نہیں گئی۔ عورت کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

میں نے مجاز کو بہت قریب سے نہیں دیکھا اور دیکھا بھی صرف تین بار لیکن تینوں بار زندگی کے تین مختلف موڑ پہ۔ پہلی بار ۱۹۳۶ء میں یہ مجاز کے عروج کا پُرشور زمانہ تھا جب نئی پود نے "آہنگ" کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور سینہ سے لگایا تھا۔ جب مجاز کے نام پر گرلز کالجوں میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں اور اُس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔ نہ جانے کس ارمان کے بدلے میں؟ اس ملاقات میں بہت کم کچھ ادھوری سے باتیں ہوئیں۔ مجھے اور صفیہ کو پہنچانے مجاز اور محمود صاحب لال ٹین لے کر آئے۔ جب پھاٹک کے قریب پہونچے تو مذاق فرمانے لگے۔ "بھئی۔ کسی روز ہمیں بھی مدعو کیجئے!" ہم نے کہا بڑے شوق سے مگر سر پر تو اباند کر آئیے گا۔ چوکیدار کی لاٹھی میں لوہے کی شام لگی ہوئی ہے۔

بولے۔ یہ پہرہ آپ لوگوں پر کب تک رہے گا؟"

" جب تک آپ لوگ چاہیں ـــ میرا مطلب ہے آپ کے قبیلے کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ہمارے چال چلن کا پہرے دار سمجھتے ہیں "

" تو ان سے لڑیئے " مجاز نے کہا

" ابھی نہیں۔ بوقت فرصت انشاءاللہ" ہم نے کہا اور پھاٹک کے اندر غڑاپ ہو گئے۔

اور پھر چار پانچ سال گزر گئے۔ کبھی کبھی اڑتی اڑاتی خبریں ملتی رہیں۔ پھر ۱۹۴۲ء میں اچانک ریڈیو اسٹیشن پر ملے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجاز کا ستارہ شاعری ڈوب چکا تھا۔ کچھ کچھ متقدمین کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو کہو اثاثہ اتنا جمع ہو چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ پاؤں جمے رہے ورنہ اگر پشت پر

"آہنگ" نہ ہوتی تو کبھی کے ختم تھے۔ اس ملاقات کے بعد عرصہ تک کوئی خبر نہ ملی اور نہ ہی کچھ پوچھ ڈھونڈی گئی۔ کہ کچھ ماہ ہوئے سُنا کہ منچلے انھیں بمبئی سمیت لائے ہیں۔ یہ بھی بُرا نہ ہوا۔ شاید اب بھی بین جوڑ کر کام چلایا جا سکے۔ اور اب تیسری دفعہ جب ملی تو دیکھا کہ کچھ صورت ہی دوسری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں طوفان اور ریلے گذر گئے ہیں جو چہرے کے سارے احساسات اور جذبات اڑا کر لے گئے جیسے نہ یہ شخص کچھ سنتا ہے اور نہ سوچتا ہے اور نہ ہی آئندہ اس قسم کی حماقت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ کسی شدید بیماری کے حملے نے بالکل سُن کر ڈالا ہے چہرے کو غور سے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس شخص کو خبر ہی نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا۔ آنکھوں میں ایک غائرانہ تغافل جیسے کسی کو پہچانتے ہی نہیں۔۔۔ ۔۔۔ کھانے والوں کے ساتھ کھالینا چلتے دیکھ کر چل پڑنا۔ بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے پیچھے سرک جانا۔ عدم اور وجود کچھ ایک ہی جیسا۔ جسم تو موجود ہے مگر آگے کا سراغ نہیں ملتا کہ دیگر لوازمات کہاں بھٹک رہے ہیں۔

آج کے مجاز میں اور دس برس پہلے کے مجاز میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ وہ ایک جوشیلا باغی لڑکا تھا اور اب بھٹکتا ہوا جھیلا ہوا مرد ہے۔ وہ ایک دوڑتا اُچھلتا آبشار تھا اور یہ ایک باندھا ہوا دریا دیکھنا ہے یہ بند کب ٹوٹتا ہے۔

لیکن بند ٹوٹنے سے پہلے اس سرکش دریا کے سوتے ہی خشک ہو گئے۔ اور دسمبر ۱۹۵۵ء میں عصمت کی آخری ملاقات بھی مجاز سے اس وقت ہوئی جب اس کی زندگی کے آخری بلکہ وداعی موڑ کے صرف دو دن باقی تھے۔ ق۔ ر)

فیض احمد فیض

مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے۔ اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں باغی کے دل کی آگ نہیں نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ ایک مختصر سے دور کے علاوہ مجاز ہمیشہ سے گاتا رہا ہے

اسکے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن اس کے آہنگ میں فرق نہ آیا۔ کبھی اس نے آغاز بلاغت کے بھرپور بے فکرانہ خواب نما محبت کے گیت گائے۔

چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں تیرے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

کبھی اس خواب کی شکست پر آنسو بہائے

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

کبھی اس خالص تخریبی اور بھرپور پیچ و تاب کا اظہار کیا جو موجودہ حال کے متعلق ہر نوجوان کا اضطراری اور پہلا جذباتی ردعمل ہوتا ہے

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

کبھی اس تعمیری انقلاب کے اسباب و اظہار کا تجزیہ کیا جسکے نقوش صرف غور و فکر کے بعد دکھائی دیتے ہیں۔

اک نہ اک در پر جبین شوق گھستی ہی رہی — آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی — دین کے پردہ میں جنگ زرگری جاری رہی
ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں — زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے — جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

یہ کافی متنوع مرکب ہے۔ لیکن اس میں کہیں بھی مجاز کا ترنم بے آہنگ اس کی دھن پھیکی یا اس کے

سر ہے سر نہیں ہوتے مجاز کے کلام میں پرانے شعراء کی سہولت اظہار ہے لیکن ان کی جذباتی سطحیت یا محدود دنیائی نہیں۔ نئے شعراء کی نزاکت احساس ہے ان کی لفظی کھینچا تانی اور توڑ مروڑ نہیں بغنایت ایک کیمیاوی عمل ہے جس سے معمولی روزمرہ الفاظ عجیب پراسرار پر معنی صورت اختیار کر لیتے ہیں بعینہ جیسے عنفوان شباب میں سادہ پانی سے رنگیں، کھائی دیتا ہے۔ مجاز کو اس کیمیاوی عمل پر قدرت ہے۔

ہمدم یہی ہے رہگذر یار خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے

یہی غنائیت مجاز کو اپنے دور کے دوسرے انقلابی اور غنائی شاعروں سے ممیز کرتی ہے۔ عام غنائی شعرا محض عنفوان شباب کے دو چار محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان تجربات کی تحریک ان کی شدت اور قوت ختم ہوجاتی ہے۔ مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع، زیادہ گہرے، زیادہ مستقل مسائل سے متعلق ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں ابھی تک ارتقاکی گنجائش اور پنپنے کا امکان ہے عام نوجوان شعراء کی غنائیت، زندگی سے بیزار اور موت سے وابستہ ہے مجاز گرم زندگی کے نغمہ سے چور، اور موت کے سرد جمود سے سراسر بیزار ہے۔

مجھے پینے دے کہ تیرے جام لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے کچھ اور ہے کچھ اور ہے ساقی

یہی وجہ ہے کہ مجاز کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے۔ اداسی نہیں سرجوشی ہے مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں للکارتے ہیں سینہ کوٹتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے عام انکے ذہن میں انقلاب کا تصور طوفان برق و رعد سے مرکب ہے۔ نغمہ ہزار اور رنگینی بہار سے عبارت نہیں یا وہ صرف انقلاب کی ہولناکیوں کو دیکھتے ہیں اس کے حسن کو نہیں پہچانتے۔ یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے۔ یہ برق و رعد مجاز پر بھی گذر چکا ہے۔ لیکن اب مجاز کی غنائیت اسے اپنا چکی ہے میں سمجھتا ہوں کہ مجاز کی "خواب سحر" اور "نوجوان خاتون سے خطاب" اس دور کی سب سے مکمل اور سب سے کامیاب ترقی پسند نظموں میں سے ہیں مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے اس کے

نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوشی تاثر آفرینی۔

کلیم الدین احمد

"آہنگ" میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان غزلوں میں وہی بے ربطی اور پراگندگی ہے جو صنف غزل کا مخصوص نقص ہے۔ مجازی غزلوں میں نو خیز ناپائیدار اور خام تجربات ہیں جو کچھ بھی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ جن میں کوئی انفرادی شان نہیں۔

مجاز کے کلام میں رومانیت کا غلبہ ہے۔ رومانیت کی خوبیاں کم اور نقائص زیادہ ہیں اسی رومانیت کا نتیجہ "رات اور ریل" جیسی نظمیں ہیں "نورا" میں جذبات کچے ہیں۔ سطحی رومانیت نے ایک معمولی نرس کو حور عین بنا دیا نظم کے دوسرے حصہ کے لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ محض ایک معمولی شرارت کا ذکر ہے کسی عمیق اور قیمتی تجربہ کا بیان نہیں۔ ذہنیت و جذبات کا معیار یہ ہے۔

ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لب لعل افشاں سے اک شے چرا لی

اس قسم کے معمولی رکیک سطحی خام جذبے موضوع شاعری نہیں ہوتے "رات اور ریل" میں بھی مجاز کسی خاص تجربہ کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ عالم خیال میں ریل کے ہمسفر ہیں۔ ریل کے سفر کو بیان کرتے ہیں مگر تخیل کو طاقت گویائی عطا نہیں کرتے۔ طبیعت کی رومانیت کی وجہ سے وہ ریل کا صحیح نقشہ نہیں اتار سکتے جو تشبیہیں وہ استعمال کرتے ہیں جو نقوش وہ پیش کرتے ہیں وہ بے موقع و بے محل ہیں۔ "دلہن" "شاہی برات" "شادیانوں کی صدا" ان سے اور ریل سے کوئی واسطہ نہیں نظم میں نقوش اور استعاروں کی فراوانی ہے۔ لیکن یہ نقوش بے موقع ہی نہیں ان کے مفہوم کو بھی مجاز صاف طور پر ذہن نشین نہیں کرتے۔ نظم "انقلاب" میں کہتے ہیں

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

عزم لائق تحسین ہے۔ لیکن اس کا تشفی بخش نتیجہ نظر نہیں آتا۔ کام کرنے کے بدلے وہ انقلاب کا

خوبی منظر پیش کرتے ہیں۔ ایسا منظر جس سے ادراک کی کمی اور وحشیانہ طبیعت کا پتہ چلتا ہے اسی طرح نظم "سرمایہ داری" فنی اعتبار سے محض قافیہ پیمائی کی ایک مثال ہے مجاز کی انقلابی نظموں میں دو نظمیں قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ "انقلاب" اور "سرمایہ داری" سے کچھ مبتذل ہیں۔ ان نظموں میں مجاز خطیبانہ انداز سے کنارہ کشی کرتے ہیں لیکن بند کے انتخاب نے قافیہ پیمائی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مکمل نظم میں ارتقائے خیال بھی نہیں۔

مجاز کی ذہنیت ایک طالب علم کی سی ہے جس نے ابھی بی اے نہیں کیا ہے ادراک معمولی اور سطحی ہے۔ جذبات کے اعتبار سے مجاز ابھی اس میدان میں ہیں جس میں ہر نوجوان طفلی کی منزلیں طے کر کے پہلی مرتبہ قدم رکھتا ہے۔ ہاں الفاظ پر البتہ قدرت ہے اور طرز ادا میں روانی و شگفتگی ہے۔ مجاز کو الفاظ سے خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ متنوع الفاظ جمع کر کے یہ اپنی نظموں کو آراستہ کرتے ہیں۔ اسی طرح استعاروں اور نقوش حسین و رعب دار استعاروں اور نقوش کا ہجوم ہے۔ لیکن الفاظ و نقوش کی فراوانی کے سبب سے تجربہ کی شکل صاف ظاہر نہیں ہوتی عموماً تو کسی تجربہ کا وجود ہی نہیں ہوتا سلالفاظ و نقوش کی فراوانی غالباً مجاز کی نظموں کی مقبولیت کا سبب ہے۔ ان سے ایک قسم کا ظاہری ادبی رنگ پیدا ہو جاتا ہے اسی سراب کو سب حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن سراب سے آسودگی و طمانیت ممکن نہیں۔

ڈاکٹر محمد حسین

ایک مشہور سنگ تراش سے کسی نے پوچھا کہ تم پتھر کی ان جامد اور بھدی سلوں سے اس قدر خوبصورت مجسمے کیوں کر تراش لیتے ہو۔ اس نے جواب میں کہا تھا "میں تو صرف اس قدر کرتا ہوں کہ پتھر سے اس کا زائد اور غیر ضروری جز و تراش کر علیحدہ کر دیتا ہوں اور یہ نقش واضح ہو جاتے ہیں" آہنگ" ایسے ہی نقوش کا مجموعہ ہے۔ یہ خواب سنگین جو کبھی شباب خوگر آلام کی صورت میں جھلکتا ہے اور کبھی بزم دلبراں ہزار رنگ تصویروں کی آب و تاب بنتا ہے، ہزار ہا محرومیوں اور کامرانیوں کے غیر ضروری اجزا علیحدہ کر کے ترتیب دیا گیا ہے۔ محرومیاں اور کامرانیاں مجاز کی ذاتی آرزومندی ہی کا عکس نہیں ہیں بلکہ عصر کی آسودگی طلب تشنہ کام وجود کی جذباتی سرگذشت ہیں۔

مجاز عہدِ جدید کا بت شکن شاعر ہے۔ اس کی شاعری غزل گوئی سے اور غزل گوئی بھی فانی بدایونی کے زیرِ اثر شروع ہوتی ہے لیکن ان غزلوں میں خود گم ہو جانے کی وہ کیفیت نہیں ہے قنوط اور یاس کی وہ گہری تاریکی نہیں ہے جو فانی کے کلام میں یا کسی روایتی غزل گو کے کلام میں ملتی ہے۔ ان ابتدائی غزلوں کے اشعار میں کہیں شوخی بھی جھلک اٹھتی ہے۔ کبھی ایک والہانہ مہک اور ایک خارجیت پسند تازگی جو برابر بتاتی ہے کہ یہ غزل گو کا خلوت خانہ نہیں کسی کی جلوہ گہِ ناز ہے جہاں ہر لمحہ شمعِ محفل داغ بھی دیتی ہے اور پھول بھی برساتی ہے۔

فاتحانہ سربلندی کے جذبے ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ اور کہکشاں کو روندڈالنے کی اُمنگ مجاز کی شاعری کا بنیادی نغمہ ہے۔ زندگی کی اس قدر بے پایاں اُمنگ سے اردو ادب ناآشنا ہے۔ مجاز کے کلام میں کلبیت اور زندگی سے بیزاری نہیں ملے گی۔ اس کا جذبہ وارفتہ "لٹ کے برباد جہاں ہو کے سبھی کچھ کھو گئے" بھی زیاں کا احساس کرنے پر راضی نہیں۔ وہ زندگی کے دردوغم سے واقف ہے۔ تلخی کام و دہن کی آزمائشوں سے بارہا گذر چکا ہے اور نہ جانے کتنی بار شکستِ دل کا تماشائی بن چکا ہے۔ پھر بھی اس نے جینے کا حوصلہ نہیں چھوڑا ہے۔ "آج بھی" گویا اسی تابِ مقاومت کا رجز ہے۔

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں

شاعرِ محفلِ وفا مطربِ بزمِ دلبراں

مجاز کی شاعری عقل کی نہیں عشق کی شاعری ہے حکمت کی نہیں جنون کی بازگشت ہے۔ اور اس جنون کے مظاہر رنگا رنگ ہیں یہ جنون اپنے کو پالینے کا جنون ہے۔ اپنی آرزو مندی کی تکمیل کر لینے کا جنون ہے۔ آہستہ آہستہ یہ آرزومندی خارجی حالات سے ٹکرا کر نئی صلابت سے آشنا ہوتی ہے۔ اس کا دائرہ حسن و عشق سے شروع ہوتا ہے اور انقلابی شاعری اور اس کے بعد کائنات کے ایک نئے نظام کے خواب کی صورت میں انجام پذیر ہوتا ہے۔ "آج کی رات" اس نشاطیہ اور معصوم آرزو مندی کی بڑی پاکیزہ تصویر ہے

مجاز کے کلام میں حسن و عشق کا بھی ایک نیا تصور ملتا ہے۔ اس میں نہ عیاشی اور تلذذ ہے اور نہ

روایتی شاعری کی تجرید محض۔ یہ آہنگ مجاز نے بڑی کامیابی سے قائم رکھا ہے ۔۔۔ مجاز کی محبوبہ نہ ارباب نشاط میں سے ہے نہ سفاک قاتلوں کی صف میں وہ ایک ایسی عورت کے پیکر میں نظر آتی ہے جو نہ لطف محض ہوتی ہے اور نہ قہر مسلسل۔ اسی طرح مجاز کا عشق بھی سماوی نہیں ارضی اور حقیقی ہے۔ مگر جسمانی اور تعیش پسند نہیں۔ وہ عشق کی کامرانیوں میں بھی "احترام لب و رخسار" سے بیگانہ نہیں ہوتا ہے وہ عشق کی لامحدود تشنہ کامیوں سے آشنا ہے۔ اس کے زخم کھاتا ہے اس کے پھول چنتا ہے اور داغ سینے سے لگاتا ہے۔

"آوارہ" سے اجتماعیت اور انقلاب کی طرف مجاز کا فکری سفر شروع ہوتا ہے۔ یہاں گویا داخلی آرزومندی نئی وسعتوں سے آشنا ہوتی ہے۔ اور "شباب خوگر دار و رسن" نئے راستے تلاش کرتا ہے۔ ایک رومانوی شاعر پہلی بار واضح طور پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی دشواریاں انفرادی نہیں سماجی ہیں اور یہ آرزوئیں یہ آسودگی کی تمنا بھی عالمگیر ہے اور اس کے حصول کے راستے بھی کم و بیش یکساں ہیں دھیرے دھیرے یہ منزل واضح ہوتی جاتی ہے یہ شعور اور بھی اجاگر ہونے لگتا ہے۔ سماجی انقلاب ہماری سیاسی زندگی اور جذباتی آسودگی کے لیے لازمی ہے۔ اور شاعر کو مطرب و مے سے آگے بڑھ کر "شمشیر بکف" سر میدان آنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی: "ہمارا جھنڈا" "مزدوروں کا گیت" "خواب سحر" "عشرت تنہائی" "مہمان" اور واضح ترین شکل میں "آہنگ نو" کی صورت میں آیا۔ مجاز کی انقلابی شاعری نے اردو شاعری کا لب و لہجہ تبدیل کرنے میں حصہ لیا ہے۔ اس نے ہمارے نوجوان شاعروں کو سیاسی اور دوسرے خارجی موضوعات پر فکر کرنے پر آمادہ کیا۔

مجاز کے کلام میں غم جاناں اور غم دوراں کے حدود متمیز اور الگ الگ نہیں ہیں۔ اسی لیے انقلاب کا تصور بھی سو فی صدی خارجی و سیاسی نہیں۔ وہ آہنگ نو میں بھی نگاراں جہاں کے تذکرے کی گنجائش نکال لیتے ہیں۔ اور "جلاوطن کی واپسی" میں شمشیر کے ساتھ ساز و جام کو فراموش نہیں کرتے اور اس سے یہ بات ایک بار پھر واضح ہو جاتی ہے کہ مجاز کا شعور اجتماعیت میں گم ہونے کے بجائے اسے ایک وسیع تر داخلی جذبہ کے ذریعہ احاطہ کرتا ہے۔ "اعتراف" اور "فکر" سے مجاز کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں وہ تابناکی اور جوش نہ سہی مگر ایک گہرا اور دیرپا تفکر ملتا ہے۔ اس تفکر میں نتیجہ

تک پہونچ جانے کا اطمینان نہیں ہے مگر نئے زمین اور نئے آسمان میں اپنا مقام تلاش کرنے کا ایک متعین جذبہ ہے۔

وقت کے آغوش میں سوئے ہوئے نہ جانے کتنے نغمے ہنوز سنگ تراش کے تیشہ کے منتظر ہیں۔

ممتاز حسین

اس میں شبہ نہیں کہ مجاز کا انداز نظر رومانوی ہے اور وہ بار بار بزم خوباں سے ناکامیوں کے باعث بھاگ کر انقلاب کی طرف آ رہا ہے لیکن اس تمام ردعمل کے پیچھے اس کی رومانیت میں دکھی انسانیت کا درد بھی موجود ہے جس کا اظہار وہ بزم خوباں سے الگ ہو کر بھی کرتا ہے۔ اس نے غم روزگار کو صرف غم عشق ہی سے نہیں پہچانا ہے بلکہ تمدن کے ارتقا اور طبقاتی قدروں کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ "سرمایہ دار" "مزدور" اور "لال جھنڈا"، انھیں جذبات کی ترجمان ہیں۔

عصمت نے اپنے محدود دائرہ فکر کے باعث ان نظموں کی طرف بھولے سے بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔ انھوں نے صرف "آوارہ" اور "اندھیری رات کا مسافر" کے طوفانی پس منظر میں اس کی المناک زندگی کا تجزیہ کیا ہے جنھوں نے مجاز کو مزدوروں میں گاتے سنا ہے آج نہیں بلکہ آج سے بہت دنوں پہلے جب کہ اس کے اعصاب تندرست تھے وہ میری رائے سے متفق ہوں گے۔ مجاز ایک شکستہ ساز ہے۔ لیکن اس کے ساز کے بہت سے ایسے تار بکھرے پڑے ہیں کہ جنھیں اکٹھا کیے بغیر ہم اس کی مکمل شخصیت کو نہیں پہچان سکتے ہیں۔ اور یہ کام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم مجاز سے اس کی ذہانت کی سپر نہ چھین لیں۔ وہ اپنی اس سپر کو مدہوشی اور بیخودی میں بھی ساتھ رکھتا ہے۔

یوسف خورشیدی

ماتمِ مجاز

یہ کیا ہوا کہ ہے خوں بار یوں فضائے وطن یہ بھر رہی ہے دمِ سرد کیوں ہوائے وطن
گھٹے نہ ساز کے سینے میں کیوں صدائے وطن کہ ہو رہا ہے کہیں خونِ مدعائے وطن
فغاں یہ اے دلِ بیتاب کیسی آتی ہے
صدائے گریۂ احباب کیسی آتی ہے

خبر یہ ہے کہ ثنا خوانِ کاکل و رخسار تبسمِ لبِ رنگیں کا وہ قصیدہ نگار
وہ ترجمانِ محبت دلوں کا آئینہ دار فروغِ لالہ و گل جس کی شاعری پہ نثار
وہ آج جھاڑ کے دامن اٹھا ہے منزل سے
بجھا کے شمعِ محبت چلا ہے محفل سے

ذرا ٹھہر کے یہ ماتم کی دُھن بھی سُن لے مجازؔ یہ دوستوں کی فغاں ہے کہ وقت کی آواز
ہماری بزم سے جاتا ہے یوں پٹک کر ساز بھری بہار میں گائے گا کون نغمۂ راز
حدیثِ عشق میں پہلی سی دلکشی کیسی
چراغ اُٹھ گیا محفل سے روشنی کیسی

یہ جانتا تھا کہ ہر شئے یہاں کی ہے سفری جمالِ لیلئ شب ہو کہ خندۂ سحری!
مگر یہ ہوش نہ تھا ہم کو وائے بےخبری کہ میکدے میں صراحی جو لاکے تو نے دھری
وہ خالی ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ جائے گی
ہماری پیاس پہ یوں موت مسکرائے گی

"مطربِ بزمِ دلبراں"

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم لکھنو کے جوبلی کالج میں پڑھتے اور شعر و ادب کی دنیا میں ہنگامے برپا کرتے تھے اسی زمانے میں ایک سال ہم نے بڑے پیمانے پر ایک عظیم الشان مشاعرہ ترتیب دیا تھا۔ مہینوں پہلے سے اس مشاعرے کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ شاعروں میں بھی اسکی دھوم تھی اور سامعین میں بھی اس کے چرچے تھے۔ ہندوستان کے تمام اہم شعرا کو اس میں دعوت دی گئی تھی اور ان کی تعداد اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ نوجوان اور غیر معروف شعرا کو اس میں شریک کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ بڑی بحث و تمحیص کے بعد ہم لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مشاعرہ صرف اساتذہ تک ہی محدود رہے گا۔ جب اس کا اعلان ہوا تو مقامی شاعروں میں خاصی کھلبلی مچی بعضے ناراض ہوئے اور سارے شہر میں ہمارے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا۔ لیکن بعضوں نے سعی و سفارش سے اس بات کی کوشش بھی کی کہ کسی طرح انھیں اس مشاعرے میں شریک ہونے کا موقع مل جائے۔ شاعروں کو عموماً اور نوجوانوں کو خصوصاً اس کا شوق تو ہوتا ہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی سفارشیں ہمارے پاس آنے لگیں۔ چنانچہ بعض نوجوان شعرا کو مجبوراً اس میں شریک کرنا ہی پڑا۔

جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو میرے ایک ساتھی نے کہا "بندشیں نواب ہٹ ہی گئی ہیں۔ ایک نوجوان شاعر کو میں بھی لاؤں گا۔"

میں نے پوچھا "کون ہے وہ شاعر؟"

میرے ساتھی نے جواب دیا "اسرارالحق مجازؔ!"

میں نے کہا "میں نے تو تمھارے اس شاعر کا نام نہیں سنا"

وہ کہنے لگا "ہاں یہ نام ابھی غیر معروف ضرور ہے۔ لیکن یہ نوجوان شاعر خوب کہتا ہے کلام سنو گے تو پھڑک اٹھو گے، مجھے کئی بار اس کو سننے کا اتفاق ہوا ہے ۔ ویسے وہ علیگڈھ یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ لیکن آج کل لکھنؤ ہی میں موجود ہے"

اور اس طرح وہ دیر تک جی بھر کے اس کا تعارف کراتا اور تعریفیں کرتا رہا۔

شاعرے کے دن یہ صاحب آئے منحنی، دُبلے پتلے، کمزور سے آدمی ۔ گندمی رنگ چھریرا بدن۔ لمبی سی ناک، چھوٹا سا دہانہ مخموری آنکھیں لیکن ان میں ذہانت کی چمک، بڑے بڑے سیاہ چمکیلے بال، سر پر اونچی دیوار کی سفید گاندھی ٹوپی، علی گڈھ کاٹ کا پائجامہ، جسم پر ڈھیلی ڈھالی شیروانی، دیکھنے میں کم سخن اور خاموش، باتیں کم کرتے اور کرتے تو شرما شرما کر، الفاظ آدھے زبان سے نکلتے اور آدھے منہ ہی میں رہ جاتے۔ لیکن ہر بات میں بلا کی ذہانت، ہر فقرے میں شوخی اور شرارت ــــ جس سے ملتے اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے۔

وقت سے ذرا پہلے آ گئے تھے۔ اس لیے تھوڑی دیر بڑی ہی دلچسپ گفتگو رہی ــــ اس تھوڑے سے وقت میں نہ جانے کتنے لطیفے ہو گئے ــــ لوگوں نے گھیرا ڈال لیا ــــ جو آتا وہ اس دلچسپ محفل میں شریک ہو جاتا ــــ اور اپنے آپ کو اس کی دلچسپیوں میں گم کر دیتا۔

مجازؔ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی!

یوں اس سے قبل انھیں دیکھنے کا اتفاق تو بارہا ہوا تھا۔ خصوصاً گرمیوں کے زمانے میں جب کالج اور اسکولوں میں چھٹیاں ہو جاتی تھیں ــــ کبھی دیکھا امین آباد میں سائیکل پر تیزی کے ساتھ چلے جا رہے ہیں ــــ کبھی دیکھ یکہ میں بیٹھے ہیں اور حسن گنج اور ڈالی گنج کی سیر کر رہے ہیں ــــ کبھی حضرت گنج میں پیدل گھوم رہے ہیں ــــ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مجازؔ ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے نستعلیق انداز سے نمایاں نظر آتے تھے۔ اور اسی لیے ہم انھیں نہ جانتے ہوئے بھی

جانتے تھے — ان کی شیروانی اور اونچی دیوار کی ٹیڑھی ٹوپی انھیں نمایاں کر دیتی تھی — اور میں انھیں دیکھ کر یہ ضرور سوچتا تھا کہ آخر یہ شخص کون ہو سکتا ہے — ؟

اس روز جب ان سے ملاقات ہوئی تو اس سوال کا جواب بھی مل گیا!

مشاعرے میں مجاز نے اپنا کلام سنایا۔ ان سے کئی غزلیں اور نظمیں سنانے کی فرمائش کی گئی۔ کلام میں ایک نیا انداز تھا اور اس نئے انداز کے ساتھ پختگی بھی تھی — پڑھنے کے انداز میں بھی ایک نیا پن تھا — اس زمانے میں جگر صاحب کے ترنم کی دھوم تھی — اکثر نوجوان ترنم سے پڑھنے میں انھیں کی نقل کرنے لگے تھے لیکن مجاز کا اپنا ایک انداز تھا — سیدھا سادہ لیکن حد درجہ موثر اور دلآویز!

خوب' واہ واہ' ہوئی بڑے بڑے اساتذہ نے داد دی۔ اور اس طرح پہلی بار مجاز ہم سے اور ہم مجاز سے متعارف ہوئے۔ اور پھر اس کے بعد ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں — وہ علی گڑھ سے لکھنؤ برابر آتے رہتے تھے — جب بھی آتے کسی نہ کسی صورت سے ملاقات ہو ہی جاتی — ان ملاقاتوں میں دلچسپ باتیں ہوتیں' فقرے کسے جاتے، لطیفے سنائے جاتے اور سنائے ہی نہیں جاتے تخلیق بھی کئے جاتے۔ کیونکہ معمولی سی بات کو لطیفہ بنا دینا مجاز کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی بات بھی لطیفے سے خالی نہیں ہوتی تھی — لطیفوں کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی دور ہوتا۔ مجاز جو کچھ کہتے وہ اپنے مخصوص انداز میں ضرور ہم لوگوں کو سنا دیتے اور اس طرح بعض اوقات گھنٹوں ان دلچسپ صحبتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

اس وقت تک لکھنؤ میں مجاز کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بہت کم لوگ واقف تھے لیکن علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم تھی — یونیورسٹی کے لڑکوں سے زیادہ وہ لڑکیوں کے محبوب شاعر تھے۔ ان کا کلام چھپ چھپ کر رات کی تنہائیوں میں پڑھا جاتا تھا — ان کے اشعار انھیں کی دُھن، انھیں کی لے، انھیں کے مترنم انداز میں گنگنائے جاتے تھے — اور یہ جذب و شوق اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ ہر لڑکی کے محبوب شاعر تھے اور شادی کے لئے ان کے نام کے قرعے نکالے جاتے تھے — ان کی کتاب "آہنگ" شاید اسی وجہ سے قبل از وقت چھپ گئی اور چھپنے کے بعد

اس کی مقبولیت کا وہ عالم ہوا کہ بیان سے باہر ہے ـــ بقول عصمت "پتلی سی کتاب ایک روپیہ قیمت، عیدی بقرعیدی، نمائش کے پیسوں سے چھ چھ سات سات کا پیاں خرید ڈالیں تحفے ہیں تو آہنگ، نقد، ادھار، عاریتاً غرض سارے بورڈنگ میں آہنگ چل پڑی - جدھر دیکھئے چار لڑکیاں چمن کے کونے میں سر جوڑے کبھی 'اندھیری رات کے مسافر' کے ساتھ دشت پیمائی کر رہی ہیں تو کبھی 'بربط شکستہ' کے تار سلجھائے جارہے ہیں - دو 'نذر دل' لئے بیٹھی ہیں تو چار 'خانہ بدوش' کے ساتھ اور چند 'رات اور ریل' کے ساتھ فرّاٹے بھر رہی ہیں تو کوئی بھولی بھٹکی غمگین کسی یاد میں غرق منہ اوندھائے پڑی ہے کسی طرف 'انقلاب' لایا جارہا ہے تو کہیں 'عذار' پر پھٹکاریں پڑ رہی ہیں۔ غرض دل و دماغ پر کچھ اس انداز سے آہنگ چھائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دیا بورڈنگ پر ٹوٹ پڑی ہے" ـــ

غرض ان دنوں وہ صحیح معنوں میں شاعر محفل وفا اور مطرب بزم دلبراں تھے ـــ انھیں خود بھی اس کا احساس تھا بلکہ یہ احساس ان کے لئے قریب قریب ایک ذہنی اُلجھن کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ بہرحال اس زمانے میں وہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھتے اور اس خیال پر پھولے نہیں سماتے تھے

مجاز بے حد شرمیلے آدمی تھے - میں نے کسی سے انھیں آنکھ ملا کر بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ نیچی ہی رہتی تھیں لیکن اس شرمیلے پن کے باوجود 'بزم دلبراں' سے انھیں گہری دلچسپی تھی - "نگاران لکھنؤ" اور "عشوہ کاران علی گڑھ" کا ذکر ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن یہ ذکر بھی وہ کبھی کھُل کر نہ کر سکے - یہ باتیں بھی بلیغ اشاروں، معنی خیز فقروں اور ذہانت سے بھرپور لطیفوں میں ہوتی تھیں۔ البتہ زندگی کے اس میدان میں بھی ان سے کچھ نہ ہو سکا - ان کی یہ دلچسپی حقیقی سے کہیں زیادہ رومانی اور عملی سے کہیں زیادہ تخئیلی تھی۔ صنفِ لطیف پر یوں تو وہ جان چھڑکتے تھے لیکن اگر عورت سامنے آجائے تو ان پر گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی تھی - اور وہ سب کچھ بھولنے سے لگتے تھے - ایسے مواقع پر خود ان کا وجود تک خطرے میں پڑ جاتا تھا ـــ لیکن اس کے باوجود انھیں مطرب بزم دلبراں' بننے کی آرزو تھی - اور شاید یہی آرزو تھی جو انھیں علی گڑھ میں میرس روڈ کے چکر لگانے، لکھنؤ میں حضرت گنج اور امین آباد کا طواف کرنے اور دلّی میں کناٹ پلیس اور چاندنی چوک کی سڑکیں ناپنے کے لئے

مجبور کرتی تھی۔ چنانچہ گھومنا اور سیر کرنا ان کے مزاج کا جزو بن گیا تھا۔ کبھی دیکھا تیزی سے سائیکل پر چلے جا رہے ہیں۔ کبھی دیکھا جھومتے جھامتے اکیلے ہی رواں دواں ہیں۔ کسی مقصد سے باہر نکلنا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔

جب بھی پوچھا۔ "کہو بھئی کدھر کا ارادہ ہے"۔؟

جواب ملا۔ "یونہی AT RANDOM نکلے ہیں"

اور واقعی وہ ہمیشہ بس یونہی AT RANDOM نکلتے تھے۔ مقصد کوئی نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ سیر کی جائے۔ نظارہ کیا جائے۔۔۔ بزمِ دلبراں نہ ہو تو وہ حسن رہگذر ہی سے محظوظ ہو لیتے تھے۔ یہی ان کی دنیا تھی۔ اس سے آگے بڑھنا انھیں نہیں آتا تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں کارہائے نمایاں نہیں کئے۔۔ دور سے دلچسپی لینا اور محظوظ ہونا ان کا شعار تھا۔ اس صورت حال نے ان کی زندگی میں محرومی کے احساس کو بہت نمایاں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ سر سے پاؤں تک وہ اسی محرومی کی ایک تصویر تھے لیکن اس محرومی نے ان کے یہاں آتشِ شوق کو تیز سے تیز تر کر دیا تھا۔ وہ گرجتے بہت تھے لیکن گرجنے والے بادلوں کی طرح انھیں برسنا نہیں آتا تھا۔ "نگارانِ لکھنؤ" اور "عشوہ کارانِ علیگڈھ" ان کی اس کمزوری سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان سے خاصی چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی تھی اور اس چھیڑ چھاڑ میں خاصے تغزل کا احساس ہوتا تھا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا!

ایک دن مجاز یونیورسٹی میں آئے اور ہم لوگوں کو دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "غضب ہو گیا"۔

میں نے کہا۔ "خیر تو ہے۔ کیا کوئی تازہ گل کھلایا جناب نے!"

کہنے لگے۔ "بس نہ پوچھو ۔۔۔ موجِ خون سر سے گزر گئی"۔

میں نے کہا۔ "آخر ہوا کیا؟"

بولے۔ "کل مطرب بزمِ دلبراں واقعی بزمِ دلبراں میں پھنس گیا"۔

میں نے کہا۔ "مبارک ہو! یہ تو خوشی کی بات ہے۔ منہ مانگی مراد بر آئی۔ لیکن اس میں

پھنس جانے کی کیا بات ہے؟"

کہنے لگے: "واقعی پھنس گئے تھے یار! بڑی مشکل سے چھوٹے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "چلو خیریت گذری۔ لیکن آخر معاملہ کیا تھا؟"

کہنے لگے: "معاملہ کیا تھا۔ کل آئی، ٹی کالج (لکھنؤ یونیورسٹی کا گرلز کالج) میں ایک جلسہ تھا۔ اس جلسے میں مجھے کچھ لڑکیاں پکڑ لے گئیں اور وہاں لے جاکر میری وہ گت بنائی کہ بس کچھ کہنے کو نہیں۔ طے یہ پایا کہ صرف ہم سے کلام سنا جائے گا۔ — خیر کلام تو ہم نے سنایا لیکن اس پر وہ فقرے بازیاں ہوئی ہیں انھوں نے اپنے تو چھکے چھڑا دئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ پھر ہم اپنا کلام اپنے ہی انداز میں لڑکیوں کی زبانی سننے لگے — اور یہ کلام کا سنانا کیا تھا — اچھا خاصا کیریکچر بنانا مقصود تھا۔ مردوں میں ہم اکیلے تھے۔ بس نہ پوچھو کہ کیا گذری۔"

اور اس طرح دیر تک وہ اس داستانِ رنگین کو فردوس گوش بنا کر سناتے رہے۔ ہم سب نے اس سے خوب لطف لیا اور ہفتوں یہ واقعہ یونیورسٹی میں موضوع گفتگو بنا رہا۔

یہ تو خیر ایک واقعہ تھا۔ مجازؔ کی زندگی میں اس طرح کے ان گنت واقعات ہیں جن سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مطربِ دلبراں تھے اور ایک زمانے میں تو لڑکیاں ان پر جان چھڑکتی تھیں اور اس کا اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ وہ بے چارے حیران و پریشان رہ جاتے تھے۔ لیکن اس میں ان کے لئے دلچسپی کا بڑا سامان تھا۔ ——— اور یہ دلچسپی انھیں بعض اوقات اپنے حدود سے باہر بھی لے جاتی تھی۔

مجازؔ ایسے کچھ خوبصورت آدمی نہیں تھے لیکن ان کی شخصیت میں بلا کی دلکشی تھی اور اس لئے وہ سب کے محبوب تھے۔ ان کی معصومیت لوگوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی۔ بھولا پن سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ اور اس معصومیت اور بھولے پن کے ساتھ ساتھ ان کی لطیفہ سنجی اور فقرہ تراشی تھی جو ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔

یہ بات ایسی کچھ عجیب نہیں ہے کہ مجازؔ نے ساری زندگی کچھ بھی نہیں کیا۔ نہ سنجیدگی سے

پڑھا لکھا ــــ نہ باقاعدگی سے کوئی ملازمت کی اور نہ کسی اور کام کی طرف صحیح طور پر متوجہ ہوئے ــ مجازؔ کی طبیعت میں ایک لاابالی پن تھا ــــ ایک ایسا لاابالی پن جو رومانی مزاج کی مٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجازؔ کے لیے سنجیدگی سے کچھ کرنا تو درکنا کسی ایک جگہ زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی ناممکن تھا ــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی متلون مزاجی انھیں کشاں کشاں لیے پھرتی رہی اور کہیں بھی انھیں چین نہ ملا ــــ ان کے جسم میں ایک بے چین اور بے قرار روح تھی جو انھیں کسی کل چین نہ لینے دیتی تھی ــــ اس لیے مجازؔ نے زندگی میں سوائے شاعری کے کچھ نہ کیا اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب وہ شاعری بھی نہ کر سکے اور اس طرح مرنے سے بہت پہلے مر گئے۔

علیگڑھ چھوڑنے کے بعد انھیں ریڈیو میں ایک ملازمت مل گئی تھی اور کچھ عرصے دلّی میں رہے بھی تھے لیکن ملازمت کرنے کے بجائے وہ تفریح کرتے تھے ــــ کام میں ان کا جی نہیں لگتا تھا ــــ کسی کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کسی کے ماتحت رہنے سے انھیں چڑ تھی اس لیے وہ زیادہ عرصے ریڈیو میں نہ چل سکے اور بالآخر انھیں اس سے کنارہ کشی ہی اختیار کرنا پڑی ــــ اور اس کے بعد ان کا بیشتر وقت بیکاری ہی میں گزرا ــــ کچھ عرصے کے لیے دلّی کی ہارڈنگ لائبریری میں انھیں جگہ ضرور مل گئی تھی لیکن لائبریری کی ملازمت بھی ان کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ کچھ عرصے کے بعد اس ملازمت کو بھی وہ خیرباد کہنے کے لیے مجبور ہو گئے ــــ اور پھر دلّی اور لکھنؤ کی سڑکوں پر آوارہ گھومنے کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ اسی عالم میں انھیں مسرت حاصل ہوتی تھی ــــ اور ان کو اس عالم میں دیکھ کر ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اسی کام کے لیے بنے ہیں۔ وہ ایک آزاد منش تھے اور انھیں صرف اسی ماحول میں موانست کا احساس ہوتا تھا جہاں کسی قسم کی پابندی نہ ہو ــــ اس لیے ملازمت کے زمانے میں شکوہ و شکایت ہمیشہ ان کا شعار بن جاتا تھا۔ جو بھی ملتا اس سے کہتے، آج کل ہم پابہ زنجیر ہیں، قیدی ہیں، یہ بھی کیا زندگی ہے ــــ دیکھو انسان کو اس زندگی میں کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ایک دن مجھ سے بھی زمانے کی بڑی شکایت کی اور کہا ــــ "دیکھو انسانوں کو کیسے کیسے

جبر سہنے پڑتے ہیں"

میں نے کہا "یہ تو زندگی کا قانون ہے"

وہ بولے۔ "اسی لیے تو ہم اس قانون کو توڑتے ہیں"

میں نے کہا۔ "یہ کوئی اچھی بات نہیں"

کہنے لگے۔ "ہم ترقی پسند ہیں"

اس فقرے پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں مجاز سے بحث کیا کرتا۔ وہ سنجیدہ بات کو کسی غیر سنجیدہ بات بلکہ لطیفے پر ختم کر دیتے تھے اور ایسے مواقع پر مجھے ہمیشہ ان پر پیار آجاتا تھا۔

مجاز کی زندگی میں بڑے انتشار کی کیفیت تھی۔ باوجود اپنے سبک اور سڈول ناک نقشے اور نستعلیق انداز کے ان کے چہرے سے پریشانی ٹپکتی تھی ایک کرب کا سا عالم نظر آتا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ شخص کسی بڑی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اس کرب کی تاریکی میں کبھی کبھی تیز روشنی کی کرن ضرور پھوٹتی تھی لیکن اس سے تاریکی کا احساس کچھ اور بھی شدید ہوجاتا تھا۔ مجاز کی باتیں مزہ دیتی تھیں۔ ان پر بے اختیار ہنسی آجاتی تھی لیکن یہ باتیں ان کی شخصیت کے کرب کو کم نہیں کرتی تھیں بلکہ اس میں کچھ فراوانی ہی ہوجاتی تھی اور اُن کے جاننے والے اُن کی باتوں پر ہنسنے والے ان سے محظوظ ہونے والے ہمیشہ یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ شخص جو دوسروں کے لئے اتنی مسرتوں کا سامان فراہم کرتا ہے خود ان مسرتوں سے محروم ہے۔ اسکی زندگی میں تو غم ہی غم ہے کرب ہی کرب ہے۔ اور وہ اسی غم اور کرب کا مجسمہ ہے۔

یہ کرب کی سی کیفیت جس کا رنگ مجاز کی زندگی میں اس قدر نمایاں تھا بغیر کسی سبب کے نہیں تھی۔ اس کے پیچھے کئی داستانیں تھیں۔ مجاز یوں تو گل نغمہ اور پردہ ساز نظر آتے تھے لیکن درحقیقت زندگی کے حالات نے انھیں خود اپنی شکست کی آواز بنا دیا تھا۔ مجاز کی زندگی ایک ناکام زندگی تھی۔ انھوں نے جو کچھ بھی چاہا وہ نہ ہو سکا۔ آرزوؤں اور تمناؤں کے جو رنگ محل ہوتے تعمیر کرنے چاہے وہ زمین پر آرہے اور اس رنگ محل میں امیدوں کے جو چراغ روشن کئے وہ اس طرح بجھے کہ پھر کبھی نہ جل سکے۔ اس صورت حال نے خود مجاز کو ایک شمع بے بنایا

اور وہ ساری زندگی محفل آرائی کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھنے کے باوجود درخور محفل نہ ہو سکے۔

مجاز کو شمع کشتہ بنا کر بجھانے میں تمام تر ان کی زندگی کی ناکامیوں کو دخل تھا۔ یہ ناکامیاں ہمیشہ ان کے دم کے ساتھ رہیں۔ اور پھر ناکامیوں کا یہ احساس ان کے یہاں اس حد تک بڑھا کہ وہ ہر کام سے گھبرانے لگے ۔۔۔ انھوں نے محبت کی لیکن وہ محبت کے قابل سمجھے جانے کے باوجود اس کے قابل نہ سمجھے گئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ چاہا وہ نہ ہو سکا ۔۔۔ ان کی محبت ایک ہنگامہ بن گئی ۔۔۔ اور اس ہنگامے نے خود ان کی زندگی کو ایک ہنگامہ بنا دیا جس سے وہ مرتے دم تک دوچار رہے ۔۔ اور زیرِ خاک بھی اس ہنگامے کو ساتھ لے گئے ۔۔ یہ زندگی کی پہلی ٹھوکر تھی اس کے بعد تو بس وہ ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ انھیں اپنے آپ کو سنبھالنا بھی دشوار ہو گیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ آخر وقت تک اپنے آپ کو نہ سنبھال سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری زندگی انھوں نے یک انتشار کے عالم میں کاٹی اور اسی انتشار نے انھیں ساری زندگی رنج و غم کا ایک مجسمہ بنائے رکھا۔۔ اور اس رنج و غم کی آگ میں وہ ساری زندگی جل جل کر تڑپتے اور تلملاتے رہے۔

اس صورتِ حال کا یہ اثر تھا کہ وہ زندگی کے شیدائی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ہمیشہ یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی ان کی طرف بھاگ رہی ہے، ان کا پیچھا کر رہی ہے اور وہ اس سے بچنے اور اس سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یا تو وہ کچھ نہ کرتے اور وقت ضایع کرنے میں پناہ ڈھونڈتے تھے یا پھر شراب کو اپنا مونس و دمساز بنا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا چاہتے تھے ۔۔۔ انھیں خود بھی اس بات کا احساس رہتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر رہے ہیں صرف وقت ضایع کرنے کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔۔۔ لیکن اگر کوئی دوسرا اس موضوع پر ان سے گفتگو کرے اور اس حقیقت کا احساس دلائے تو وہ ہمیشہ اسے مذاق میں ٹالنے کی کوشش کرتے۔

میں نے کئی بار ان سے اس موضوع پر گفتگو کی لیکن ہمیشہ یوں محسوس ہوا جیسے اس مسئلہ کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے، اور وہ اس سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک دن میں نے بہت سنجیدگی سے کہا ۔" انسان کو کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہئے، ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ۔"

کہنے لگے ۔" زندگی تو یوں بھی اجیرن ہے ۔ کرنے نہ کرنے سے کیا ہوگا ۔"

میں نے کہا ۔" نہیں یہ بات نہیں زندگی کو بسر کرنے کے قابل بھی بنایا جا سکتا ہے ۔"

مجاز نے کہا ۔" اس کی ایک ہی صورت ہے ۔ وہ یہ کہ زندگی کو بھلا دیا جائے ۔"

میں نے کہا ۔" یہ غیر ترقی پسندانہ بات ہے ۔"

جب گفتگو اس منزل پر پہنچی تو مجاز نے کہا ۔" چھوڑو یار! ان باتوں میں کیا رکھا ہے آؤ کہیں چلتے ہیں ۔ ترقی پسندوں کو گھومنا پھرنا چاہیئے ۔ سیر کرنا سب سے بڑی ترقی پسندی ہے ۔"

اس قسم کی سنجیدہ گفتگو کا ان کے ساتھ ہمیشہ یہی انجام ہوتا تھا ـــــ اصل بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں مسلسل اور پیہم ناکامیوں نے اس درجہ غم پیدا کر دیا تھا کہ ان کے لئے زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی ـــ اور وہ اس غم کو غلط کرتے پھرتے تھے ۔ ان کا گھومنا پھرنا، دوستوں سے ملنا، فقرے تراشنا اور لطیفے بنانا ان سب کی محرک یہی صورت حال تھی ۔ انھیں کے سہارے وہ غم غلط کرتے تھے ۔ اور اس طرح وقت کاٹنے کی صورت نکل آتی تھی ورنہ وقت تو ان سے کاٹے نہیں کٹتا تھا ۔

مجاز جب تک زندہ رہے ان کے پاؤں میں چکر رہا ۔ شاید ہی زندگی میں کوئی دن ایسا ہو جب وہ جم کر گھر میں بیٹھے ہوں ۔ دن بھر بس اِدھر اُدھر گھومتے ہی رہتے تھے ـــ ابھی دیکھا یونیورسٹی میں کھڑے کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں ـــ تھوڑی دیر بعد دیکھا حضرت گنج چلے جا رہے ہیں ـــ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہیں ـــ امین آباد کا چکر لگا رہے ہیں ـــ غرض سارا دن اسی طرح گزر جاتا تھا رات گئے وہ گھر پہنچتے تھے ـــ اور وہ بھی اس حال میں کہ انھیں خود اپنی خبر نہیں ہوتی تھی ـــ وہ خود تو خیر گھر کیا پہنچتے تھے پہنچائے جاتے تھے ـــــ اور دوسرے دن صبح کو پھر یہی چکر

دُور ہو جاتا تھا ـــــ ان کی طبیعت میں ایک بے چینی تھی۔ ان کے مزاج میں ایک تلوّن تھا ـــــ وہ چین سے ایک جگہ بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے ـــــ ایک بیتابی کیفیت انھیں نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتی تھی ـــــ اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ مسرتوں سے محروم تھے اور ان کی زندگی میں جو غم تھا وہ ہر گھڑی کچوکے لگاتا رہتا تھا ـــــ اس احساس کو کم کرنے ہی کے لیے وہ مارے مارے پھرتے تھے ـــــ علیگڈھ میں میرس روڈ کے چکر لگانا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور لکھنؤ میں امین آباد، حضرت گنج، یونیورسٹی روڈ، اور فیض آباد روڈ پر چہل قدمی ان کی عادت سی بن گئی تھی ـــــ کوئی مل جائے تو خیر ورنہ وہ اکیلے ہی اس مشغلے کو جاری رکھتے تھے ـــــ یوں تو ان کا یہ مشغلہ بے مقصد تھا۔ لیکن انھیں دیکھ کر یہ بات محسوس ضرور ہوتی تھی کہ وہ ایسا کر کے اپنی زندگی کے کسی بڑے ہی مہیب خلا کو پر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس خلا کا پُر ہونا آسان نہیں تھا اس لیے انھیں یہاں بھی ناکامی ہی ہوتی تھی ـــــ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس عالم میں کسی نہ کسی ساتھی کے تلاشی رہتے تھے۔ ان کی نظریں کسی دوست اور ہمنوا کو تلاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ـــــ اور جب واقعی کوئی دوست انھیں مل جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے دل کی کلی کھل گئی ہے۔ اور وہ فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے ہیں ـــــ حالانکہ مسرت کے حصول سے کہیں زیادہ مسرت سے محرومی کے غم کو وہ اس طرح غلط کرنے کی کوشش کرتے تھے ـــــ تھوڑی دیر کے لیے اس طرح یہ غم غلط ہو بھی جاتا تھا لیکن دیکھنے والے کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے غم کے سائے ان کی زندگی کے اُفق پر پھیل کر کچھ اور بھی بیکراں ہو گئے ہیں۔

یوں مجازؔ تنہا بہت ہی کم رہتے تھے۔ کوئی نہ کوئی انھیں مل ہی جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس زندگی میں تنہا نظر آتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی میں بڑی تنہائی تھی اور اسی لیے وہ اس احساسِ تنہائی سے پیدا ہونے والے غم کو بھلانے کے لیے دوستوں اور ملنے والوں کی تلاش میں رہتے تھے اور جب کوئی دوست یا ملنے والا انھیں مل جاتا تو وہ

اس کے ساتھ گھنٹوں وقت گزارتے ـــــ دوستوں اور ملنے والوں کی تلاش اور تلاس کے بعد گھنٹوں کافی ہاؤس میں ان کے ساتھ بیٹھنا بھی ان کے معمولات میں داخل تھا ـــــ یہاں وہ خوش گپیاں کرتے، خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے تھے ـــــ بس اس سے آگے بڑھنا انھیں نہیں آتا تھا ـــ اگر کوئی سنجیدہ بات چھیڑ دیتا تو وہ چپ ہوجاتے تھے ـــ بہرحال صرف وقت گزارنے کی خاطر اس طرح بیٹھنا ان کے مزاج کا جزو بن گیا تھا ـــــ میں بارہا ان کے ساتھ بیٹھا ہوں ـــــ اور مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ ان کی زندگی میں تنہائی کے خلا نے جس غم کو پیدا کیا ہے وہ اُس کو اس طرح بھلانے کی کوشش کر رہے ہیں ـــ شاید یہی وجہ ہے کہ ایسی محفلوں میں وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حاضر نہیں ہیں۔ لوگ باتیں کرتے اور وہ خاموش رہتے اور کبھی کبھی تو یہ خاموشی اتنی گہری ہوجاتی کہ انھیں متوجہ کرنا پڑتا۔ تاکہ انھیں اس بات کا احساس رہے کہ وہ اس محفل میں شریک ہیں۔ البتہ ان محفلوں میں جب کبھی بھی بولتے تو ان کا فقرہ مزے دار ہوتا اور اس لیے اس میں لطیفے کا لطف آتا ـــ لطیفے پر سب لوگ تو ہنستے لیکن وہ خود ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموشی میں ڈوب جاتے۔ اور اس طرح ڈوبتے کہ انھیں بڑی مشکل سے نکال کر باہر لانا پڑتا ـــ حقیقت یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر غم کے شدید احساس ہی کے باعث وہ اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے تھے ـــ یہ زندگی کی تلخیاں ہی تھیں جو ان پر شگفتگی کے باوجود اس خاموشی کو مسلط رکھتی تھیں ـــ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہنسی کی تہہ میں بھی ایک اداسی اور غمگینی کا احساس ہوتا تھا ـــــ وہ ہنستے تھے شگفتہ باتیں کرتے تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ غم غلط کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔

مجاز بُری طرح شراب پیتے تھے۔ لیکن ان کی یہ شراب نوشی بھی اپنے آپ کو بھلا دینے کے لیے تھی۔ اس میں کسی قسم کا نشاطیہ پہلو نہیں تھا۔ وہ یک گونہ بے خودی چاہتے تھے شراب سے انھیں جو والہانہ وابستگی تھی اس کو دیکھ کر یہ احساس ضرور ہوتا تھا۔ اسی لیے شراب کے

لطیف پہلوؤں کی طرف انھوں نے کبھی بھی توجہ نہیں کی ـــ وہ ہر قسم کی شراب پی سکتے تھے۔ کیونکہ انھیں تو نشے سے غرض تھی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ اسی لیے وہ دیسی شراب تک سے گریز نہیں کرتے تھے ـــ اور ایک زمانہ تو ان پر ایسا بھی گزرا ہے جب وہ "ٹھرّہ" ہی پیتے تھے شراب کے سُرور سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ پینے تھے تو بس پیتے ہی چلے جاتے تھے۔ اور جلد ہی ایک ایسی منزل آجاتی تھی جب انھیں دنیا و مافیہا کا خیال ہی نہیں رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ اور گرد وپیش سے بے خبر ہو جاتے تھے ـ۔ اور اس عالم میں دیکھنے والے کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ صرف اسی غرض سے پی رہے تھے کہ جلد بے حال ہو کر اپنے آپ سے باہر ہو جائیں ـــ اسی لیے اس عالم میں ان کو دیکھ کر ہمیشہ افسوس ہوتا اور ترس آتا تھا ـــ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نشے کے عالم میں جب ان پر بدمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی تو وہ واقعی رحم کے قابل ہوتے تھے۔

میں نے مجاز کو شراب پیتے اور پی کر اس طرح بے حال ہوتے ہوئے بارہا دیکھا ہے۔ اور ہمیشہ مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے یہ شخص زندگی سے مُنہ موڑ کر تیزی سے اپنی موت کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔ جوشؔ صاحب کی محفلِ نا و نوش میں انھیں اکثر دیکھا اور انھیں دیکھ کر ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں شراب جلد سے جلد اپنے اندر اتار لینے کے درپے ہیں۔ چنانچہ تیزی سے پینے اور زیادہ پینے کی کوشش کرتے ـــ نتیجہ یہ ہوتا کہ بہت جلد بہکنے لگتے اور تھوڑی دیر کے بعد انھیں اپنا ہوش نہ رہتا ـــ جوشؔ صاحب کو ہمیشہ ان کی اس حالت پر افسوس ہوتا، وہ اس پر کڑھتے، مجاز کو بُرا بھلا کہتے، شفقت بھرے انداز میں نصیحت کرتے لیکن مجاز کب سنتے تھے! بالآخر جب ان کی حالت زیادہ خراب ہوتی تو جوشؔ صاحب کہتے "لے جاؤ اس کو" غرض مجاز لے جائے جاتے۔ ـــ ان کے اعصاب نے جواب دے دیا تھا اس لئے شراب ان کی برداشت سے باہر تھی۔ لیکن اس صورتِ حال نے شراب کے معاملے میں ان کی حالت ایک ایسے بیمار کی سی کر دی تھی جو کھانا کھا نہیں سکتا لیکن کھانے کی ہوس جس کے یہاں شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے ـــ مجاز کو شراب کا

ہُو کا' ہو گیا تھا — مجازؔ کی شراب نوشی کا محرک یک گونہ بے خودی کا خیال ہوا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کے بے پایاں غم کو بھولنے کے لئے شراب پی لیکن آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ بغیر کسی خیال کے پیتے تھے — مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ مجازؔ کو شراب کی لت پڑ گئی ہے۔ چنانچہ خاصا زمانہ ان کی زندگی میں ایسا گزرا ہے کہ وہ ہر وقت شراب کے خیال میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان کی زندگی کا اور کوئی مقصد ہی نہیں رہا تھا جب ملتے تو شراب کا ذکر کرتے شراب ملتی تو شراب کی باتیں کرتے خصوصاً ان لوگوں کی صحبت میں جنھیں شراب سے دور کا واسطہ بھی نہیں اور جو خود بقول مجازؔ اس معاملے میں زاہد خشک ہیں — وہ شراب کی باتیں کچھ زیادہ ہی کرتے اور ان باتوں میں حسنِ طلب کے ساتھ ساتھ ایک حسرت کا احساس بھی ہوتا تھا۔

شام کو کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ مجازؔ ہمارے ساتھ بیٹھتے اور ہم لوگ چائے یا کافی پیتے — میں چائے یا کافی کی پیالی بڑھا کر کہتا — "لو بھئی چائے پیو"۔

اِس فقرے پر وہ مسکرا کر ٹھنڈی سانس بھرتے اور کہتے "اچھا"۔

مجھے اِس پر ہنسی آجاتی اور میں چھیڑنے کی غرض سے کہتا "کیوں — کیا چائے کو جی نہیں چاہ رہا ہے"۔

وہ پھر ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیتے "جی تو چاہ رہا ہے — پی لیں گے — لیکن یار! چائے یا کافی بھی کوئی پینے کی چیز ہے"۔

میں کہتا — "پھر پینے کی چیز کیا ہے —؟"

وہ کہتے "جس کو تمھارے ایسے لوگ نہیں پیتے"۔

غرض وہ جتنی دیر بیٹھتے اسی طرح کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا — وہ بیٹھتے تو ہمارے ساتھ تھے لیکن انھیں خیال شراب کا رہتا تھا — اور چائے یا کافی پینے کے بعد شراب کی تلاش میں نکلتے تھے — کوئی پینے والا مل گیا تو خیر، ورنہ حالت یہ ہو گئی تھی کہ کوئی دوست مل گیا تو اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیئے اور جو کچھ مل گیا نکال لیا — اور جا کر جیسی شراب بھی ملی پی لی — اور رات گئے

یا تو بُرے حال میں گھر پہنچے یا پہنچائے گئے۔

مجاز کے تمام دوست اور عزیز اُن کی شراب نوشی سے خائف تھے۔ جوش صاحب تک جو خود شراب کے والہ و شیدا ہیں مجاز کو بہت ملامت کرتے اور سمجھاتے تھے لیکن مجاز اس منزل سے گزر چکے تھے جب انسان پر کسی کی بات کا اثر ہوتا ہے۔ انھیں خود اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا۔۔ چنانچہ اس شراب نے مجاز کی جان تک لے لی ـــ اور ان کی شراب نوشی کا جو عالم تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہی چاہتے بھی تھے۔ زندگی ان کے لئے ایک بوجھ تھی اور اس بوجھ کو اٹھانے کی سکت ان کے اندر باقی نہیں رہی تھی ـــ اس لئے انھوں نے شراب کا سہارا لیا ـــ ساری زندگی اسی کے سہارے جئے اور بالآخر اسی کے سہارے اس دنیا سے سفر کر گئے ـــ رات بھر شراب پی اور شراب بھی دیسی صبح کو شراب خانے میں ادھ موئے پائے گئے ـــ ہسپتال پہنچایا گیا لیکن بے سود ـــ شراب نے ان کی جان لے لی یا یوں کہئے کہ شراب کا سہارا لے کر وہ جان دینے کی منزل سے گزر گئے۔ کیونکہ زندگی کا زہر اب ان سے پیا نہیں جاتا تھا۔

شراب نوشی کو مجاز نے غم غلط کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو بھلانے کے لئے اپنایا لیکن وہ ان کے لئے مصیبت بن گئی۔ چنانچہ اس شراب نوشی نے ان سے عجیب وغریب حرکتیں بھی کرائی ہیں۔ اس بھنور میں پھنس کر وہ کبھی کبھی اپنی انسانیت اور شرافت سے بھی گر گئے ہیں جس کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ شراب پی کر رات گئے سڑکوں پر لڑکھڑاتے پھرنا، لوگوں سے لڑنا جھگڑنا اور اول فول بکنا ان کا شعار بن گیا تھا ـــ شراب پینے کے لئے پیسے نہ ہوں تو وہ طرح طرح سے پیسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے کوئی جاننے والا مل جاتا تو اس کی شامت آجاتی ـــ مجاز اسے چھوڑتے نہیں تھے جو کچھ جس طرح بھی مل جاتا وصول کر لیتے۔ شراب نہ ہو تو انھیں اس بات کا خیال نہیں رہتا تھا کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا کچھ کر رہے ہیں۔

وہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے ـــ چند سال ہوئے مجاز پیسوں سے بہت تنگ تھے ـــ ایک دن جب شراب پلانے والا کوئی دوست بھی نہ ملا تو ایک پبلشر کے پاس پہنچے اور اپنے مجموعۂ کلام کا

ہوکا' ہو گیا تھا — مجاز کی شراب نوشی کا محرک یک گونہ بے خودی کا خیال ہوا۔ ابھی ایسی زندگی کے بے پایاں غم کو بھلانے کے لئے شراب پی لیکن آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ اسی کو خیال کر کے پیتے تھے — مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ مجاز کو شراب کی لت پڑ گئی ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ ان کی زندگی میں ایسا گزرا ہے کہ وہ ہر وقت شراب کے خیال میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان کی زندگی کا اور کوئی مقصد ہی نہیں رہا تھا جب ملتے تو شراب کا ذکر کرتے شراب ملتی تو شراب کی باتیں کرتے خصوصًا ان لوگوں کی صحبت میں جنھیں شراب سے دور کا واسطہ بھی نہیں اور جو بقول مجاز اس معاملے میں زاہد خشک ہیں — وہ شراب کی باتیں کچھ زیادہ ہی کرتے اور ان باتوں میں حسنِ طلب کے ساتھ ساتھ ایک حسرت کا احساس بھی ہوتا تھا۔

شام کو کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ مجاز ہمارے ساتھ بیٹھتے اور ہم لوگ چائے یا کافی پیتے — میں چائے یا کافی کی پیالی بڑھا کر کہتا — "لو بھئی چائے پیو"۔

اس فقرے پر وہ مسکرا کر ٹھنڈی سانس بھرتے اور کہتے "اچھا"!

مجھے اس پر ہنسی آ جاتی اور میں چھیڑنے کی غرض سے کہتا "کیوں — کیا چائے کو جی نہیں چاہ رہا ہے"؟

وہ پھر ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیتے "جی تو چاہ رہا ہے — پی لیں گے — لیکن یار! چائے یا کافی بھی کوئی پینے کی چیز ہے"!

میں کہتا — "پھر پینے کی چیز کیا ہے —"؟

وہ کہتے "جس کو تمھارے ایسے لوگ نہیں پیتے"!

غرض وہ جتنی دیر بیٹھتے اسی طرح کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا — وہ بیٹھتے تو ہمارے ساتھ تھے لیکن انھیں خیال شراب کا رہتا تھا — اور چائے یا کافی پینے کے بعد شراب کی تلاش میں نکلتے تھے — کوئی پینے والا مل گیا تو خیر، ورنہ حالت یہ ہو گئی تھی کہ کوئی دوست مل گیا تو اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیئے اور جو کچھ مل گیا نکال لیا — اور جا کر جیسی شراب بھی ملی پی لی — اور رات گئے

! تو بُرے حال میں گھر پہنچے ! پہنچائے گئے ۔

مجاز کے تمام دوست اور عزیز ان کی شراب نوشی سے خالف تھے ۔۔ جوش صاحب تک جو خود شراب کے والہ و شیدا ہیں مجاز کو بہت ملامت کرتے اور سمجھاتے تھے لیکن مجاز اس منزل سے گزر چکے تھے جب انسان پر کسی کی بات کا اثر ہوتا ہے ۔ نہیں خود اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا ۔

چنانچہ اس شراب نے مجاز کی جان تک لے لی ۔۔۔ اور ان کی شراب نوشی کا جو عالم تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہی چاہتے بھی تھے ۔ زندگی ان کے لئے ایک بوجھ تھی اور اس بوجھ کو اٹھانے کی سکت ان کے اندر باقی نہیں رہی تھی ۔۔۔ اس لئے انھوں نے شراب کا سہارا لیا ۔۔۔ ساری زندگی اسی کے سہارے جئے اور بالآخر اسی کے سہارے اس دنیا سے سفر کر گئے ۔۔۔ رات بھر شراب پی اور شراب بھی دیسی صبح کو شراب خانے میں ادھ موئے پائے گئے ۔۔ ہسپتال پہنچایا گیا لیکن بے سود ۔۔ شراب نے ان کی جان لے لی یا یوں کہئے کہ شراب کا سہارا لے کر وہ جان دینے کی منزل سے گزر گئے ۔ کیونکہ زندگی کا زہراب ان سے پیا نہیں جاتا تھا ۔

شراب نوشی کو مجاز نے غم غلط کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو بھلانے کے لئے اپنایا لیکن وہ ان کے لئے مصیبت بن گئی ۔ چنانچہ اس شراب نوشی نے ان سے عجیب و غریب حرکتیں بھی کرائی ہیں ۔ اس بھنور میں پھنس کر وہ کبھی کبھی اپنی انسانیت اور شرافت سے بھی گر گئے ہیں جس کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے ۔ شراب پی کر رات گئے سڑکوں پر لڑکھڑاتے پھرنا ، لوگوں سے لڑنا جھگڑنا اور اول فول بکنا ان کا شعار بن گیا تھا ۔۔ شراب پینے کے لئے پیسے نہ ہوں تو وہ طرح طرح سے پیسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے کوئی جاننے والا مل جاتا تو اس کی شامت آجاتی ۔۔ مجاز اسے چھوڑتے نہیں تھے جو کچھ جس طرح بھی مل جاتا وصول کر لیتے ۔ شراب نہ ہو تو انھیں اس بات کا خیال نہیں رہتا تھا کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا کچھ کر رہے ہیں ۔

وہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔۔ چند سال ہوئے مجاز پیسوں سے بہت تنگ تھے ۔۔۔ ایک دن جب شراب پلانے والا کوئی دوست بھی نہ ملا تو ایک پبلشر کے پاس پہنچے اور اپنے مجموعۂ کلام کا

معاملہ صرف پچاس روپے میں طے کرلیا۔ پچاس روپے پبلشر نے دے دئے ۔ مجاز نے ان روپوں کی شراب پی لی اور پبلشر نے "سازِ نو" کے نام سے ان کا مجموعہ کلام چھاپ لیا ـــــ دوستوں کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجاز کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ـــ انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی ۔ اپنے کئے پر نادم بھی ہوئے لیکن وہ مجبور تھے بعض باتیں ان کے اختیار سے باہر تھیں ۔

مجاز کے مزاج میں حد درجے کا لاابالی پن تھا ۔ کسی کام کو باقاعدگی سے وہ کرنا جانتے ہی نہ تھے کسی جگہ جم کر بیٹھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ۔ تھوڑی دیر بیٹھتے پھر اٹھ جاتے ۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوسری جگہ سے تیسری جگہ ۔ بس یہی ان کا معمول تھا ۔ وہ وعدے کرلیتے لیکن وعدے کو وفا کرنا انھیں نہیں آتا تھا کسی کام کی تکمیل سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ساری زندگی ایک تلون کے عالم میں بسر کی کبھی کوئی کام نہیں کیا ۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ کیا کرنا چاہیے ۔ کسی وقت بھی انھیں مستقبل کا خیال نہیں آیا ۔ وہ تو بس حال ہی کو بسر کرنا جانتے تھے ۔ اور وہ بھی کسی قاعدے اور اصول کے ماتحت نہیں ۔ بے اصولی ہی ان کا اصول تھا ـــ بے قاعدگی ہی ان کا معیار تھا اور زندگی میں ہر لمحہ وہ اپنے اقوال و افعال سے اس بے اصولی اور بے قاعدگی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے ـــ اور اس کا سبب بھی یہی تھا کہ انھیں زندگی اور اس کے نظام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی ۔ حالات نے انھیں زندگی کے ہر پہلو سے بیزار کردیا تھا ـــــ وہ تو زندگی کو بھلا دینا چاہتے تھے ـــــ اس لئے اس کے اصول اور قدروں کی بھی انھیں پروا نہیں تھی ۔

میں نے مجاز کے لاابالی پن کو صرف دیکھا ہی نہیں مجھے اس سے سابقہ بھی پڑا ہے کیونکہ مجاز کی یہ مشقِ ستم احباب پر سب سے زیادہ ہوتی ـــــ چند سال پہلے کا ذکر ہے مجاز ایک دفعہ دلّی آئے تو میزبان کے لئے میرا انتخاب کیا ـــ صبح کو دیکھا تو اپنا بکس اور بستر لئے چلے آرہے ہیں ۔

کہنے لگے ۔ "جوش صاحب کے پاس ٹھہرنے کا ارادہ تھا لیکن سوچا اب کے تمھارے پاس ٹھہروں گا "

میں نے کہا ـ "بڑی خوشی کی بات ہے ۔ لیکن آخر یکایک دلّی کا پروگرام کیسے بنا " ؟

بولے ـ "بس یونہی ATRANDOM آنکلے "۔

میں نے کہا "کوئی مشاعرہ وشاعرہ ہوگا ؟"

مجازؔ نے جواب دیا ۔" مشاعرہ وشاعرہ کوئی نہیں ، بہت دنوں سے لکھنؤ میں طبیعت گھبرا رہی تھی ہم نے کہا ذرا دلّی کی سیر کرلیں "

میں نے کہا ۔ " ہاں دلّی کی سیر تو کرنی ہی چاہیئے ۔ تم نے بہت اچھا کیا ۔ اب ایک مہینہ یہیں گزارو اگلے مہینے سے چھٹیاں ہونے والی ہیں ۔ پھر ساتھ ہی لکھنؤ واپس چلیں گے "

اور وہ اس پر راضی ہو گئے ۔

میں نے ان کا سامان وغیرہ رکھوایا ۔ وہ نہائے دھوئے اور ناشتہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر رخصت ہوئے ۔ کہ ذرا گھومنے پھرنے جا رہے ہیں کھانے کے وقت تک واپس آجائیں گے ۔ لیکن جانے کے بعد تین دن تک لوٹ کر خبر نہ لی ۔ خدا جانے کن لوگوں میں پھنس گئے ۔۔ میں نے جوشؔ صاحب کو ٹیلی فون کیا انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی ۔ لیکن تیسرے دن دوپہر کو دیکھا کہ جوشؔ صاحب ہانپتے کانپتے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے " مجازؔ مرگیا " میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ۔ جوشؔ صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ، ان پر رقّت طاری تھی اور یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کرب کی سی کیفیت میں مبتلا ہیں ۔۔ میں نے انھیں تسلّی دی اور کہا کہ وہ پرسوں یہاں آئے تھے ۔ سامان ان کا یہ رکھا ہوا ہے اس کے بعد سے کہیں غائب ہیں ۔ میں سمجھتا تھا آپ کی طرف ہوں گے ۔ شاید کسی اور کی طرف چلے گئے ہوں ۔

جوشؔ صاحب کہنے لگے ۔ " صاحب ! ابھی کسی نے مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی ہے کہ وہ مرگیا "

میں نے انھیں دلاسا دینے کے خیال سے کہا ۔ " آپ فکر نہ کیجئے ۔ کسی نے یونہی غلط خبر اُڑا دی ہے "

تھوڑی دیر بعد میں نے جوشؔ صاحب کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ آپ جاکر آرام کیجئے میں اُس کو تلاش کرتا ہوں ۔

جوشؔ صاحب تو رخصت ہوئے ۔ میں نے کچھ لڑکوں کو شہر میں اِدھر اُدھر دوڑایا ۔ شام تک انھوں نے مجازؔ کو ڈھونڈھ نکالا ۔ لال کنوئیں میں انھوں نے کسی کے ہاں بُری طرح شراب پی لی تھی

اور بے ہوش پڑے تھے لوگ یہ سمجھے کہ شاید مر گئے۔ اس لئے کسی نے جوشؔ صاحب کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دی — خیر صبح کو مجازؔ جوشؔ صاحب کے ہاں پہنچائے گئے۔ وہاں پہنچ کر مجازؔ نے مجھے چند سطریں لکھیں وہ یہ تھیں!

پیارے عبادت!

زندہ ہوں۔

میں بھی تمھارا عجیب مہمان ہوں۔

بہرحال اس وقت حامل رقعہ کے ہاتھ ہمارا ایک کرتہ اور پائجامہ جو کہ ہمارے بستر بند میں ہے اوپر ہی ایک کپڑے میں لپٹا ہوا ہے۔ بھیج دو۔

کل ملیں گے اور رخصت ہوں گے — مجازؔ

میں نے ان کے حکم کی تعمیل تو کر دی۔ لیکن ساتھ ہی لکھ بھیجا "تم بڑے نالائق ہو۔ تم نے مجھے بھی پریشان کیا اور جوشؔ صاحب کو بھی تکلیف پہنچائی — آخر لاابالی پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

لکھنے کو تو یہ سب کچھ لکھ دیا لیکن مجھے ان کے اس لاابالی پن پر تعجب نہیں تھا۔ یہ تو بڑی معمولی سی بات تھی میں نے تو انھیں اس سے بھی زیادہ عجیب حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ حضرت لکھنؤ سے دلی صرف شراب پینے کی غرض سے آئے ہیں — لکھنؤ میں تو انصار ہاروانی نے ان پر سخت احتساب کر رکھا تھا اور انصار سے یہ ڈرتے بھی تھے۔ اسی لئے تنگ آکر دلی کی طرف بھاگے ہیں — اور میرا یہ خیال سو فی صدی صحیح نکلا۔

یہ لاابالی پن اور بے راہروی مجازؔ کی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ وہ اسی سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی ان کی شخصیت میں بہت کچھ تھا۔ وہ بڑے ہی شریف آدمی تھے نیکی اور سیدھے پن کی خصوصیت بقول شخصے ان کی گھٹی میں پڑی تھی — انھیں کسی شخص سے بگڑنا نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ برائی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی کی بہتری کے سوا کوئی اور بات ان کے ذہن میں آتی ہی نہیں تھی۔ کسی سے انتقام لینا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے —

ان کی شخصیت میں شرافت ہی شرافت تھی ۔ اُن کا خلوص بے پایاں تھا ۔ ان کی محبت بے اندازہ تھی وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے ـــ ان کی دوستی پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا ـــ اور اس میں شک نہیں کہ وہ بہت ہی اچھے دوست تھے ـــ انھوں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا ۔ کبھی کوئی چھچھوری بات نہیں کی ۔ نشے کی اور بات ہے لیکن ہوش کے عالم میں میں نے کبھی بھی انھیں شرافت کے دائرے سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا ۔ وہ کبھی بھی نیچے نہیں گرے ۔ انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی ـــ کبھی کسی کو بے جا طور پر نہیں سراہا ۔ انھیں تکلف اور بناوٹ سے نفرت تھی ۔ وہ جو کچھ تھے وہی اپنے آپ کو ظاہر کرتے تھے ۔ انھیں شہرت کی خواہش نہیں تھی ـــ ناموری کی پروا نہیں تھی ۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز تھے ۔ انھیں ہمیشہ خیر کا خیال رہتا تھا ۔ شر کے تو وہ پاس بھی نہیں پھٹکتے تھے ـــ برائی کا انھیں خیال بھی نہیں آتا تھا وہ تو ایک رند تھے ۔ اور رندی کی تمام خصوصیات ان کے اندر موجود تھیں۔

اور یہ رندی مجاز کے مزاج میں داخل تھی ۔ اور اسی رندی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ لاابالی مزاج تھے۔ ان کی طبیعت میں بے راہروی تھی ۔ باقاعدگی کی کسی قدغن کو وہ اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں خود اپنے اوپر قابو نہیں تھا ۔ بعض معاملات میں تو وہ بالکل ہی بے بس تھے ـــ اور یہ خصوصیات درحقیقت ایک 'جینیس' کی خصوصیات تھیں ۔ 'جینیس' میں کسی نہ کسی طرح کی بے راہروی کسی نہ کسی نوعیت کی بے قاعدگی ہوتی ضرور ہے ـــ مجاز بھی ایک 'جینیس' تھے اور اس لئے یہ بے قاعدگی اور بے راہروی کی خصوصیات ان کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں ـــ یہی وجہ ہے کہ انھیں ان مذمومات کا شکار دیکھ کر ہمیشہ محبت اور ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا تھا ۔ مجھے تو ان کی ایسی باتوں پر ہمیشہ پیار آیا ہے ـــ اور اس میں شک نہیں کہ وہ پیار کرنے ہی کی چیز تھے ـــ مجاز کی زندگی کے اس لاابالی پن میں بھی ایک معصومیت اور سادگی تھی ۔ وہ کسی اوباشی کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئی تھی ۔ مجاز کی حالت اس معاملے میں بالکل اس معصوم بچے کی سی تھی جو نتائج کو سمجھے بغیر بعض ایسی حرکتیں بھی کرتا ہے جن سے سوائے نقصان کے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ اور اگر اس کو نہ روکا جائے تو یہ حرکتیں اس کی زندگی بن جاتی ہیں ـــ مجاز بھی ساری زندگی کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار رہے ۔ مجاز کی

زندگی کے اس پہلو کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور دیکھنا بھی نہیں چاہیے تھا ــ عزیز اور دوست سب ان سے نالاں تھے۔ لیکن کبھی کسی نے یہ غور نہیں کیا کہ اس شخص کی زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں نے کتنے بڑے خلا کو پیدا کیا تھا ــ اور مجاز کی یہ حرکتیں درحقیقت اس خلا کو پُر کرنے کی ایک غیر شعوری کوشش تھیں اور پھر کون سا 'جینیس' ایسا گزرا ہے جو اس قسم کی بے راہروی کا شکار نہ ہو ــ ایسا کیوں ہوتا ہے ــ؟ 'جینیس' میں باقاعدگی کیوں نہیں ہوتی ـ؟ وہ زندگی کے مروجہ نظام اقدار سے بغاوت کیوں کرتا ہے؟ اس کو سکون کیوں نہیں ملتا؟ اس کی زندگی میں ہنگامے کیوں ہوتے ہیں؟ وہ کسی کی پروا کیوں نہیں کرتا؟ کسی کی بات کیوں نہیں مانتا؟ اپنی موت کو کیوں دعوت دیتا ہے؟ ــ مجاز کی شخصیت کو دیکھ کر یہ اور اسی قسم کے ان گنت سوالات ہمیشہ میرے ذہن میں اُبھرے ہیں ــ لیکن میں انھیں حل نہیں کر سکا ہوں ـ یہ باتیں آج بھی میرے لئے ایک معمہ ہیں ـ

مجاز ایک 'جینیس' تھے ـ اس لئے ان کی زندگی میں یہ بے راہروی ایسی کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتی ـ اس پر افسوس ضرور ہوتا ہے لیکن ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا ــ اور یہ حقیقت ہے کہ مجاز کی اس بے راہروی پر افسوس کرنے والے تو بہت تھے لیکن ان سے نفرت کرنے والا ایک بھی نہیں تھا ــ بات یہ ہے کہ مجاز کی اس بے راہروی میں بڑی انسانیت تھی ــ انسان ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہوتا ـ اس میں کمزوریاں ہوتی ہیں اور یہ کمزوریاں مجاز میں بھی تھیں اور ان کی بے راہروی درحقیقت انھیں انسانی کمزوریوں کا مظہر تھی ـ اس لئے میں تو ان کی اس بے راہروی کو ہمیشہ نظرانداز کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہوں کیونکہ میں نے خود انھیں اس معاملے میں مجبور پایا ہے ـ کوئی ان دیکھی طاقت ان سے وہ سب کراتی تھی جو وہ خود کرنا نہیں چاہتے تھے ــ اس لئے ان کی بے قاعدگی اور بے راہروی کو دیکھ کر ان پر ترس آتا تھا اور ان سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا تھا ــ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ انھیں بُرے حال میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، مجھ پر رقت طاری ہو گئی خصوصاً اس وقت جب میں نے یہ دیکھا کہ ان کی انسانیت اور شرافت اس مدہوشی کے عالم میں بھی برابر چھپ چھپ کر اپنے آپ کو رُونما کرتی رہتی ہے ـ

یہ ایک حقیقت ہے کہ مجاز طبعاً بڑے ہی نیک اور شریف آدمی تھے ـ نشے کی اور بات ہے

لیکن ویسے اس شرافت کا مظاہرہ وہ ہر وقت اپنی حرکات و سکنات سے کرتے رہتے تھے۔ انھیں اپنی خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کی عزت کرتے تھے۔ چھوٹوں کا لحاظ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ وہ بیکار اور لایعنی باتیں کبھی بھی نہیں کرتے تھے۔ دل کی بات کو وہ دل کے اندر رکھنے کے قائل نہیں تھے جو کچھ ان کے دل میں ہوتا وہ زبان پر آجاتا تھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتے اور سچ بات کے لئے جان کی بازی تک لگا دینے کو تیار رہتے تھے — وہ بڑے ہی غیور اور بے باک تھے۔ انھیں کسی سے دبنا اور کسی کی خوشامد کرنا نہیں آتا تھا۔ وہ کسی قسم کی غلط بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی آواز ہمیشہ حق کی آواز ہوتی تھی کسی کی تکلیف کو دیکھ کر ان کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا تھا اور وہ بہت جلد بے چین ہو جاتے تھے — مجھے مجاز کی زندگی کے ایسے بے شمار واقعات کا علم ہے۔ جو اُن کی شخصیت کی ان خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔

مجاز یوں تو ایک رند لااُبالی مزاج تھے لیکن اپنے بزرگوں کے سامنے ان کی رندی بھی ختم ہو جاتی تھی، لااُبالی پن بھی جواب دے دیتا تھا۔ مجاز کو شراب کی بُری عادت طالب علمی کے زمانے ہی میں پڑ گئی تھی۔ لیکن ایک زمانے تک انھوں نے اپنے والدین اور دوسرے بزرگوں سے اس کو چھپائے رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ ظاہر ہے اس بات کو وہ کب تک چھپا سکتے تھے۔ بالآخر ان کے گھر والوں کو اس کا علم ہو گیا لیکن اس کے باوجود مجاز یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ اس بُری عادت کا شکار نہیں ہیں — بلکہ جن لوگوں نے بھی ان کے والدین کو اس طرف متوجہ کیا ان سے وہ خفا ہو جاتے تھے۔ حالانکہ ویسے انھیں خفا ہونا نہیں آتا تھا — ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شوکت تھانوی صاحب نے مجاز کے والد صاحب سے مجاز کا ذکر کرتے ہوئے بڑی تعریفوں کے بعد آخر میں یہ کہہ دیا کہ مجاز کو شراب نوشی کی بُری عادت پڑ گئی ہے کسی طرح اسے چھڑا دیجئے — یہ خبر مجاز تک بھی پہنچی — بہت خفا ہوئے اور اکثر دوستوں سے شوکت کی شکایت کی اور کہا کہ میں نے شوکت سے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ یا تو میرے والد سے دوستی رکھیں یا مجھ سے۔ بیک وقت باپ بیٹے دونوں سے دوستی مناسب نہیں۔ شوکت صاحب نے تو حقیقت کا اظہار کیا تھا مجاز اس پر خفا ہوتے

خفا ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی شراب نوشی کا ذکر ان کے گھر والوں سے کیا گیا تھا۔ اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے گھر والوں کو ان کی شراب نوشی کا علم ہے، نہیں چاہتے تھے، کہ اِس بُرے کام کا تذکرہ ان لوگوں سے کیا جائے۔

یوں بظاہر دیکھنے میں یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ مجازؔ کی ایک گھریلو زندگی بھی ہے کیونکہ وہ ہمیشہ گھر سے باہر ہنگامے کرتے رہتے تھے لیکن ان کی ایک گھریلو زندگی بھی تھی۔ وہ گھر کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ خاندان کے ہر فرد کا حتی الامکان خیال رکھنے کی کوشش کرتے۔ والدین اور بھائی بہنوں سے تو انھیں والہانہ محبت تھی خاصا وقت وہ گھر میں گزارتے تھے۔ کبھی کہیں سے کچھ آمدنی ہوجاتی تو ضرور کچھ نہ کچھ چیزیں گھر والوں کے لئے خرید کر لے جاتے ـــ بیہوشی کے عالم میں بھی انھیں اس بات کا ہوش رہتا تھا ـــ اپنے چھوٹوں کا انھیں خاص طور پر بڑا پاس لحاظ رہتا تھا۔ انصارؔ اور صفیہ کا وہ کہنا مانتے تھے ـــ انصارؔ ہی کے کہنے سے وہ کبھی کبھی شراب چھوڑ دیتے تھے ـــ بلکہ انصارؔ سے تو وہ ڈرتے بھی تھے۔ اس سے تو ان کی روح قبض ہوتی تھی ـــ اس لئے نہیں کہ وہ اُن پر سختی کرتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس کی بات کو رد کرنے کی سکت ان میں نہیں تھی۔

مجازؔ نے کبھی جم کر کوئی ملازمت نہیں کی ـــ ریڈیو میں ملازم ہوئے لیکن زیادہ عرصے نہ رہ سکے۔ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں کچھ عرصے کام کیا لیکن وہاں بھی وہ زیادہ دنوں جم نہ سکے۔ اس میں ان کی طبیعت کے انتشار، مزاج کے تلون، رندی اور لاُابالی پن ہی کو دخل نہیں تھا۔ آزادی کا خیال اور خودداری کا احساس بھی اس میں شامل تھا ـــ اس لئے وہ ملازمت کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتے کیونکہ ان کے خیال میں ملازم کو دوسرے کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے ـــ خودداری پر زخم کاری لگتا ہے ـــ اور انسان اس طرح کسی کام کا باقی نہیں رہتا ـــ پھر یہ بھی ہے کہ اپنے مزاج کے خلاف باتیں کرنی پڑتی ہیں ـــ بے جا خوشامد کرنی پڑتی ہے ـــ خواہ مخواہ ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے ـــ یہی وجہ ہے کہ ساری زندگی عسرت اور پریشانی کے

عالم میں رہے لیکن ملازمت کو زندگی کے لئے ایک لعنت ہی سمجھا اور اسی لئے اس سے دور بھاگتے رہے۔ لیکن کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ ان کی غیرت مندی کا یہ ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔

مجاز کی بے باکی اور صاف گوئی بھی ان کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا۔ وہ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے جو کچھ بھی ان کے دل میں ہوتا زبان پر آجاتا تھا —— نشے کی حالت میں بھی وہ ایسا کرنے سے باز نہیں رہتے تھے —— پچھلی جنگ کے زمانے کی بات ہے۔ جب اُردو کے بعض شاعروں نے حکومت کی ملازمتیں کرلی تھیں اور اس طرح شاعرت افسر ہوگئے تھے —— انھیں دنوں دلّی ریڈیو پر ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا —— اس مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر تاثیر مرحوم کررہے تھے۔ اور اس میں فیض (جو اس زمانے میں لفٹننٹ کرنل یا کرنل ہوگئے تھے) اور بعض دوسرے شعرا بھی شریک تھے ——— مجاز کا قیام ان دنوں دلّی ہی میں تھا۔ انھیں بھی مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی —— مجاز مشاعرے میں ذرا تاخیر سے پہنچے —— بُری طرح نشے میں تھے۔ جب انھیں پڑھنے کے لئے مائیکروفون پر طلب کیا گیا تو وہ اپنی جگہ سے جھومتے جھامتے اُٹھے اور اپنی نظم یا غزل پڑھنے سے قبل یہ شعر پڑھنا شروع کیا :

شاعر ہوں اور امیں ہوں عروسِ سخن کا میں
کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں میں

لیکن مجاز کی آواز یہ شعر پڑھتے پڑھتے ڈوب گئی —— ریڈیو کو بند کردیا گیا —— اس زمانے میں تو یہ حکومت کی توہین تھی —— خان بہادر اور کرنل قسم کے شاعر تو خیر اس پر کچھ زیادہ چیں بجبیں نہ ہوئے لیکن ریڈیو کے محکمے میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا —— کئی دن تک کھچڑی پکتی رہی اور آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ ریڈیو پر مجاز کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا —— لیکن مجاز ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی کب پروا کرتے تھے —— مُنہ تک آئی ہوئی بات ان سے رُکتی نہیں تھی —— نشے کے عالم میں بھی انھیں اس بات کا خیال رہتا تھا —— اور وہ اس کا اظہار کردیتے تھے —— بدیسی حکومت کی ملازمت ان کے نزدیک ایک لعنت تھی —— حکومت کی پرورش کو وہ شاعر کی توہین سمجھتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں حکومت یہ ہتھکنڈے استعمال کررہی تھی اور اس نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو

خرید لیا تھا ـــ مجازؔ اس کو بُری نظر سے دیکھتے تھے ـــ اور اس کے اظہار میں انھیں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔ ریڈیو کی محفلِ مشاعرہ تک اس سے نہیں بچ سکتی تھی۔ کرنلوں اور خان بہادروں کے سامنے بھی وہ بے باکی کے ساتھ اپنی رائے پیش کرنے میں نہیں جھجکتے تھے۔

اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مجازؔ کو انسان عزیز تھا، انسان کی انسانیت عزیز تھی اور انسانیت کی بنیادی قدریں عزیز تھیں اور چونکہ انسان کو وہ بہت عظیم سمجھتے تھے اس لئے اس کی توہین ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی ـــ چنانچہ جب بھی وہ انسانیت کی قدروں کو گھائل ہوتا ہوا دیکھتے تو ان کا پارہ چڑھ جاتا تھا ـــ اور وہ کسی کو بھی بخشتے نہیں تھے ـــ انھیں انسانوں سے دلچسپی تھی ایسے انسانوں سے جو صحیح معنوں میں انسان ہوں، جنھیں انسانیت کی قدریں عزیز ہوں ـــ اور یہ خوبیاں انھیں ملمع کئے ہوئے انسانوں سے کہیں زیادہ ان عام انسانوں میں نظر آتی تھیں جو نام نہاد تہذیب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ـــ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انھیں عوام سے دلچسپی اور ہمدردی تھی اور وہ انھیں کو انسانیت اور انسانی قدروں کا علم بردار سمجھتے تھے اسی لئے مزدوروں اور کسانوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

مجازؔ کو انھیں باتوں نے اشتراکیت سے قریب کیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ نظریاتی طور پر ایک سچے اشتراکی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اشتراکی فکر و فلسفہ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن نظامِ اقدار کی ناہمواری کے شدید احساس نے مجازؔ کو اشتراکی بنا دیا تھا اس احساس نے ان پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ انسانیت کا مداوا یہی اشتراکی نظام ہے ـــ اس کے مسائل اسی نظام کے سہارے حل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مجازؔ نے اشتراکی نظام کے قیام کو ضروری سمجھا ہے۔ اور اس طرف توجہ بھی دلائی ہے۔ اس کا پیام بھی دیا ہے ـــ لیکن وہ اس منزل تک جذبات کے راستے سے پہنچتے ہیں ـــ عقل و شعور کی کارفرمائی اس میں کم نظر آتی ہے۔ علمی اور حکیمانہ زاویۂ نظر کا احساس بھی اُن کے یہاں نہیں ہوتا ـــ لیکن اس سے ان کے اشتراکی نظریے کو ٹھیس نہیں لگتی۔

کیونکہ ان کی ذہانت ان باتوں کے بغیر بھی انھیں صحیح قسم کا اشتراکی بنا دیتی ہے ——— ایک اشتراکی کی عملیت تو بے شک ان کے یہاں نہیں تھی لیکن ویسے جہاں تک سوچنے کا تعلق ہے وہ اشتراکی زاویۂ نظر سے سوچتے تھے ——— یہی وجہ ہے کہ انھیں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام سے نفرت تھی امرا اور رؤسا سے نفرت تھی ——— مزدوروں سے وہ زیادہ قریب تھے ——— عوام سے انھیں زیادہ لگاؤ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے لوگوں میں انھیں بٹھا دیا جائے تو وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ ایسے ماحول میں ہمیشہ ان کا دم گھٹتا تھا —— اور وہ ہمیشہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے تھے ——— چنانچہ جب اس موضوع پر بات کرتے ان کی بے ربط باتوں میں بھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مارکسی فلسفے کے اسرار و رموز کو صحیح طور پر پیش کر رہے ہیں ۔

مارکسیت سے ان کی یہ دلچسپی محض جذباتی ہی نہیں تھی وہ ذہنی طور پر بھی ایک اشتراکی تھے ۔ ہرچند کہ انھوں نے اشتراکی نظریات کا گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا ۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظریات سے وہ ایک طبعی مناسبت رکھتے تھے اس لئے اس کی بنیادی باتوں سے انھوں نے واقفیت حاصل کر لی تھی اور پھر اپنی خداداد ذہانت سے وہ ان اصولوں اور نظریات کی روشنی میں زندگی کے ہر پہلو کو کچھ اس طرح دیکھتے تھے کہ نتائج صحیح نکلتے تھے ——— لیکن جہاں تک ان اصولوں اور نظریات کو برتنے کا تعلق ہے وہ اس میں انتہاپسند نہیں تھے ۔ خصوصاً ادب و شعر کے معاملے میں ان کا یہ تصور نہیں تھا کہ کوئی بات ایسی کہی ہی نہ جائے جو پارٹی لائن کے خلاف ہو ——— اس معاملے میں وہ خاصے کشادہ دل اور روشن دماغ تھے اور شاعر کو شاعر پہلے سمجھتے تھے ۔ چنانچہ جنگ کے زمانے میں جب ان کی نظموں پر خالص اشتراکی نقاد اعتراض کرتے تو وہ مذاق میں ہمیشہ یہی کہہ دیتے "جی ہاں ! یہ نظم ذرا پٹری سے اُتر گئی ہے" ——— حالانکہ ان کی نظمیں یوں پٹری سے کم ہی اُترا کرتی تھیں ۔ لیکن خالص اشتراکی نقاد یہ سمجھتے ضرور تھے کہ وہ پٹری سے اُتری ہوئی ہیں ——— لیکن مجازؔ نے کبھی ان باتوں کی پروا نہیں کی وہ جو کچھ خود صحیح سمجھتے تھے وہی کرتے تھے ——— میکانیکی انداز اُن کے تخلیقی مزاج کو اور فن کارانہ ذہن کو ڈانواں ڈول نہیں کر سکتا تھا ۔

مجازؔ صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فن کار اور ایک شاعر تھے ــــ اس تخلیقی فن کار اور شاعر کو فکر و خیال کی جو آزادیاں ہونی چاہئیں وہ مجازؔ کو بہت عزیز تھیں - یہی وجہ ہے کہ وہ میکانیکی نقادوں کی ہر بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ ان کی باتوں کو مذاق میں اُڑا دیتے تھے - اُن کے خیال میں شاعر کا اپنا ایک زاویۂ نظر ہوتا ہے - وہ لکیر کا فقیر نہیں ہوسکتا - یہی وجہ ہے کہ خود ان کی شاعری میں جدّت اور اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے - اور اس جدت اور اچھوتے پن کو پیدا کرنے میں ان کی ذہانت اور طباعی کو بڑا دخل ہے - اچھوتے پن کے بغیر ان کی کوئی بات ہوتی ہی نہیں تھی - یہی خصوصیت ان کی شاعری میں بھی سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے -

نہ صرف شاعری بلکہ ان کی ایک ایک بات سے یہ اچھوتا پن ٹپکتا تھا ــــ وہ ہر بات پر کوئی نہ کوئی فقرہ کستے اور کوئی نہ کوئی لطیفہ تراشتے تھے ــــ اور اس فقرے اور لطیفے میں بڑی ہی لطافت ہوتی تھی، بڑی ہی نفاست کا احساس ہوتا تھا - فقرے اور لطیفے اکثر مبتذل ہو جاتے ہیں - لیکن مجازؔ کو میں نے کبھی مبتذل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا - وہ اس فقرے اور لطیفے میں بات کی تہ تک پہنچے ہوئے معلوم ہوتے تھے - اور درحقیقت لطیفے اور فقرے سے یہی اُن کا مقصد ہوتا تھا ــــ لیکن ان میں سب سے زیادہ ان کی شگفتگی اور ظرافت، برجستگی اور لطافت اپنی طرف متوجہ کرتی تھی - یہی وجہ ہے کہ مجازؔ ان فقروں اور لطیفوں سے روتوں کو ہنسا سکتے تھے، بزمِ ماتم کو محفلِ نشاط بنا سکتے تھے اور مجازؔ کے یہ فقرے اور لطیفے دو چار نہیں ہیں، دس بیس نہیں ہیں بلکہ اگر یہ جمع کیے جائیں تو ان کی تعداد ہزاروں تک ضرور پہنچ سکتی ہے ــــ کیونکہ مجازؔ کی تو ہر بات میں لطیفے کا پہلو ہوتا تھا ــــ چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات بھی جب مجازؔ کی زبان سے ادا ہوتی تو اس میں دل موہ لینے والا انداز پیدا ہو جاتا ــــ مثلاً وہ بات ایک معمولی ہی سی بات تو تھی جو موٹر کار کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر آجاتی تھی ــــ موٹر کار کو دیکھ ہمیشہ وہ یہ کہا کرتے "یار! یہ موٹر زن سے ہمارے قریب سے اس طرح گزرتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پر طنز کر رہی ہے" ــــ یا پھر شادی کے بارے میں ان کا یہ فقرہ کہ "بھئی شادی تو ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد وہ جو ایک وادی

ہوتی ہے وہ اچھی خاصی مصیبت ہے ۔ آدمی گھن چکر ہو جاتا ہے گھن چکر" ـــــ اسی طرح مجاز کا ایک اور فقرہ بھی بہت دلچسپ ہے ـــــ ایک صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ دوسری شادی کی فکر میں تھے ۔ احباب ان سے پوچھ رہے تھے کہ آخر اس میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے ؟ ـــــ اس پر وہ صاحب بولے " صاحب ! میں کسی بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور ابھی تک کوئی بیوہ ملی نہیں"۔ مجاز یہ سنتے ہی بول اٹھے ۔ "صاحب! اس میں کون سی قباحت ہے۔ آپ شادی کر لیجئے وہ خود ہی بیوہ ہو جائے گی"

پاکستان بننے کے بعد مجاز مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کراچی اور لاہور آئے ـــــ کچھ عرصے قیام کے بعد لکھنؤ واپس پہنچے ۔ تو پاکستان کی بہت سی باتیں کہیں ـــــ اور آخر میں کہنے لگے "پاکستان بننے سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے ۔ میری اہمیت بہت بڑھ گئی ہے "

میں نے کہا " وہ کیسے ؟ "

کہنے لگے " جانتے نہیں ہو میں FOREIGN COUNTRY کی سیر کر کے آ رہا ہوں ۔ اور اب میں بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی ایک FOREIGN COUNTRY دیکھا ہے "

غرض اس قسم کے ان گنت فقرے اور لطیفے مجاز نے ہمیں دئے ہیں ـــــ وہ ایک باغ و بہار آدمی تھے اور ہر لمحہ ان لطیفوں اور فقروں کے پھول بکھیرتے رہتے تھے ۔ انھیں جمع کر کے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ وہ ایک ایسے انسان کی تخلیق ہیں جو اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ۔

مجاز یوں تو ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے لیکن ویسے ان کی زندگی ایک بہت بڑا المیہ تھی ـــــ زندگی کو انھوں نے بہت کچھ دیا ۔ لیکن وہ خود زندگی سے محروم رہے ۔ کہنے کو تو وہ زندہ تھے لیکن ان کی زندگی کے انداز کو دیکھ کر ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ زندگی سے تنگ آ کر اور پریشان ہو کر موت کی طرف بھاگ رہے ہیں ـــــ چنانچہ میں نے انھیں دیکھ کر ہمیشہ یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس چراغ کی طرح بجھتے جا رہے ہیں جس میں تیل

باقی نہیں رہتا ــــــ ان کی شگفتگی بھی وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی جا رہی تھی ــــــ مگر گذشتہ سال جب میں ان سے لکھنؤ میں ملا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہر وقت چہکنے والے اس باغ و بہار انسان کو چُپ سی لگ گئی ہے ــــــ بہت کم باتیں کرتے ہیں اور جب باتیں کرتے بھی ہیں تو زندگی کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کی باتیں کرتے ہیں اور زندگی کا رونا روتے ہیں۔
میں کافی ہاؤس پہنچا تو دیکھا ایک کونے میں بیٹھے ہیں - تین چار نوجوان لڑکے ان کے آس پاس ہیں بڑے تپاک سے ملے دیکھ کر کلی کلی کھل گئی بغل گیر ہوئے - اور پھر میں اسی میز پر بیٹھ گیا۔ اور اس طرح ایک زمانے کے بعد ایک دفعہ پھر پرانی صحبتوں کی یاد تازہ ہوئی ــــــ لیکن میں نے ان کے اندر خاصا تغیر محسوس کیا۔ اب وہ باتوں میں ہنستے نہیں تھے۔ فقرہ مشکل ہی سے ہوتا تھا ــــــ سنجیدگی کے عالم میں گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے پرانی صحبتوں کا ذکر کر کے ہنسانے کی کوشش کی لیکن وار خالی گیا۔ گفتگو اس دائرے سے باہر نہ نکل سکی -

"بھئی خوب آ گئے"

"لکھنؤ دیکھنے اور احباب سے ملنے کی خاطر آ گیا ــــــ بہت جی چاہتا تھا"

"لکھنؤ اب کہاں"؟

"غزالان لکھنؤ کا کیا حال ہے؟"

"اب یہاں کوئی غزال نہیں سب چلے گئے"

"پھر جی کس طرح لگتا ہے؟"

"وقت کاٹتے ہیں۔ مانوس صورتیں تک دیکھنے کو نہیں ملتیں"

"ماحول کو بدلنا ہی چاہیے تھا"

"ہو کا عالم ہے ویرانی ہی ویرانی ہے۔ ایسا بھی ماحول کا بدلنا کیا ہوا"

"وقت کس طرح گزرتا ہے؟"

"دن بھر گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ شام کو ادھر آ نکلتے ہیں"

"شعر و شاعری کا کیا حال ہے"

"بہت دنوں سے کچھ نہیں کہا۔ شعر اس ماحول میں کہاں ہوتا ہے"

"لاہور کیوں نہیں آتے؟"

"دل بجھ گیا ہے۔ کہیں آنے جانے کو جی نہیں چاہتا"

"صحت کیسی ہے؟"

"بس جی رہے ہیں"

غرض کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک کچھ اسی طرح کی گفتگو کے بعد ہم وہاں سے اٹھے۔ مجازؔ کو اتنا سنجیدہ میں نے کبھی نہیں پایا۔ اس درجہ قنوطیت کا شکار کبھی نہیں دیکھا وہ بالکل بجھ گئے تھے ان میں کوئی شگفتگی باقی نہیں رہی تھی بات کرنے میں بھی انھیں تکلف ہوتا تھا ـــ بات کیجئے تو جواب دیتے جاتے تھے۔ ورنہ محسوس تو یہ ہوتا تھا جیسے ان میں بات کرنے کی سکت ہی نہیں ہے۔ وہ بول سکتے ہی نہیں ـــ انھیں اس عالم میں دیکھ کر معلوم ہوا کہ اب ان کا غم پھیل کر بیکراں ہو گیا ہے۔ وہ اس میں ڈوب گئے ہیں۔ اور انھیں اپنے گرد و پیش سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے ـــ ان کے خلوص میں کمی نہیں ہوئی تھی ـــ لیکن اس خلوص کا اظہار جس طرح وہ کیا کرتے تھے اب ان سے ممکن نہیں تھا ـــ اب تو وہ صرف رونا رو سکتے تھے ـــ چنانچہ وہ دیر تک زندگی کے ناسازگار حالات کا رونا روتے رہے ـــ اور میں برابر سوچتا رہا کہ وہ شخص جو کبھی، مطرب بزم دلبراں، اور شاعر محفلِ وفا، تھا اور جس سے وابستہ ہونے کے لیے لوگ اپنی تنہائیوں میں جھوٹ موٹ محض دل بہلانے کی غرض سے قرعے نکالتے تھے ـــ اس کو زمانے نے کسی طرح ایک شمع کشتہ بنا دیا ہے۔ زندگی کتنی عجیب ہے۔

مجازؔ میں یہ حیرت انگیز تبدیلی دیکھ کر میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا اور بہت سے خیالات میرے ذہن میں آئے تھے ـــ ایسے خیالات جنھیں میں ذہن میں لانا نہیں چاہتا تھا ـــ لیکن جن سے باوجود کوشش کے میں پیچھا نہ چھڑا سکا اور پھر یہ تمام خیالات ایک دن حقیقت بن گئے۔

جب کسی نے لاہور میں ٹیلی فون پر یہ خبر سنائی کہ مجازؔ اس دنیا سے منہ موڑ کر ہمیشہ کے لیے چلے گئے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی لیکن مجھے اس پر تعجب نہیں ہوا کیونکہ یہ تو مجھے عرصے سے معلوم تھا کہ مجازؔ مرنے کی آرزوؤں میں مرتے ہیں ——— ان کی یہ آرزو پوری ہو گئی ——— شاید اب انھیں سکون مل گیا ہوگا ——— لیکن کون جانے کہ اب بھی انھیں سکون ملا ہے کہ نہیں!

انتخاب کلام مجاز

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

انتخاب سخن بنیادی طور پر ذاتی پسند کا عمل ہے اور شاید اسی لئے رسوائی کا سبب بھی! ذاتی پسند کا یہ عمل قدماء کے یہاں دیدہ زیب بیاضوں کی شکل اختیار کر لیتا تھا، اس لئے ہر وہ شخص جو صاحب دیوان نہیں بن سکتا تھا، صاحب بیاض ضرور ہوتا، موجودہ زمانے میں شعراء کے انتخابات مخصوص مسلک اور نقطۂ نظر کے تحت بھی کئے جانے لگے ہیں۔ تحسین شناسی کا یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ اس میں شک نہیں ہر شاعر کا انتخاب ہر عہد میں مختلف انداز پر ہوگا لیکن اس کے چند رشحات قلم سے کوئی انتخاب خالی نہیں ہو سکتا۔ یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کے کلام کا کچھ حصہ ہر عہد اور عصر کے مذاق کی تسکین کا سامان اپنے اندر بہم رکھتا ہے۔ کچھ حصہ ایسا بھی ہوگا جو رد و قبول کے عمل سے گزرے گا۔ اسی سے نئے ادبی ذوق کی نشان دہی کی جائے گی۔

مجاز کے کلام کا کوئی انتخاب ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے، لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک زمانے میں مجاز کے کلام کے ان حصوں پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے جو کسی وقتی تقاضہ یا مسلک کی ضرورت کو پورا کرتے رہے ہیں۔ یہ وقتی تقاضہ "نمائش" بھی ہو سکتی ہے اور "ہمارا جھنڈا" بھی۔ مجاز کا بحیثیت غزل گو بھی کافی چرچا رہا ہے۔ حالانکہ مجاز صحیح معنوں میں غزل کے شاعر نہیں۔ اس سانچے میں ڈھل کر ان کی آواز کا سارا بانکپن زائل ہو جاتا ہے۔ مجاز کی شاعری کے انقلابی پہلو پر بھی ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے، ہر چند کہ اس کا ہاتھ شمشیر سے زیادہ شناسائے ساز و جام ہے۔ وہ دراصل شباب اور شہنائی کا شاعر ہے۔ "دوزگلو" اس کا سب سے بڑا ملکہ ہے۔ حسن و خیال اس کی ذہانت اور فطانت کی زد پر رہتے ہیں۔ وہ ایک سبک روح،

مست نغمہ، چھپا تا ہوا شاعر تھا جس کی دنیا اور ہستی نغمہ طرازی، صہبا پرستی اور شور مستی سے عبارت تھی۔ رزم ہو یا بزم وہ ہر جگہ پاک دل و پاکباز رہا۔ اس نے نہ یاقوت کھایا نہ زہر اُگلا، ہر وقت اور ہر جگہ شاعر رہا، بلبل رہا، گاتا رہا، نور و نغمہ بکھیرتا رہا۔ اس کے بہت سے نغمے ابھی تک ان سنے رہے ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال اس کا مشہور ترانہ "نذرِ علی گڑھ" ہے۔ حال ہی میں علی گڑھ کی فضا اس ترانے سے معمور رہنے لگی ہے حالانکہ اس کا چرچا علی گڑھ میں بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر شاعر کے یہاں انکشافات کا مواد ہمیشہ موجود ہوتا ہے یہی وجہ جواز ہے اس مختصر انتخاب کی!

غزل

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے
اس سعیٔ کرم کو کیا کہیئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم!
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیئے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی!
محفل تو تری سُونی نہ ہوئی کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اُس محفلِ کیف و مستی میں اُس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

۱۹۳۳ء

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی — نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی — وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں — آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت — ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں — نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی جھومتی — سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سَو پیچ و خم — اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی — پٹڑیوں پر دُور تک سیماب چھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات — شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی
منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں — دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی
تیز تر ہوتی ہوئی منزل بمنزل دم بہ دم — رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار — ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے — رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں — جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو — آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی
یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال — ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ — خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام — وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک — اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار — اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی — غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی — اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی، بکھری ہوئی — شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی
پُل پہ دریا کے دمادم کوندتی للکارتی — اپنی اس طوفان انگیزی پہ اِتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں — ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر — دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی
آگے آگے "جستجو آمیز" نظریں ڈالتی — شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی — ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی
تیزیٔ رفتار کے سکے جماتی جا بجا — دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب — اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش — حال و مستقبل کے دلکش خواب دکھلاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر — کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامنِ تاریکیٔ شب کی اڑاتی دھجیاں — قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر — ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی! — پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی
ایک سرکش فوج کی صورت عَلَم کھولے ہوئے — ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار — عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہُوا میں سیکڑوں جنگی ڈھل بجتے ہوئے وہ بگُل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

سنہ ۱۹۳۳ء

غزل

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہئے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے
اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے
یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب اُن کی جفا کو کیا کہئے
اک نشترِ زہرآگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

سنہ ۱۹۳۴ء

نذرِ علیگڈھ

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بُلبل ہوں

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغرِ نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی اُبلتی ہے
جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات اُبلتی ہے
اسلام کے اس بُت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس مے خانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی
یاں حسن کی برق چمکتی ہے، یاں نور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے
ہر شام ہے شامِ مصر یہاں، ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا یہ خلدِ بریں ارمانوں کی
فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں، چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں
اس فرش سے ہم نے اُڑ اُڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں
اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چومے ہیں
اس بزم میں گر کر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اُتارے ہیں
ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرّات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکستِ فاش یہاں
اس گلکدۂ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں، پھر برق کڑکنے والی ہے
جو ابر یہاں سے اُٹھے گا، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہرِ طرب پر گرجے گا ہر قصرِ طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

۱۹۳۶ء

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی!
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہُوک سی سینے میں اُٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
اُن کو پا سکتا ہوں میں، یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندرسبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

سنہ ۱۹۳۷ء

کس سے محبت ہے؟

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اُس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بُو ہے پیکرِ حُسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اُس کی

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُس کی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھُونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اُس کی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اِس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُس کی

جبیں پر سایہ گستر پرتوِ قندیلِ رُہبانی!
عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی!
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سُلیمانی!
ازل سے معتقد ہے محفلِ نورانیاں اُس کی

ادائیں لے کے آئی ہے وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملکہ ہے خراج اُس نے لئے ہیں بوستانوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اُس کی

وہ میری جرأتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر ناز کی بجلی گرا دینا
نگاہِ شوق کی بے باکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درسِ تمکیں دے گئیں نادانیاں اُس کی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اُس نے گنگنایا ہے
سُنی ہیں میں نے اکثر چھُپ کے نغمہ خوانیاں اُس کی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دُنیا بدل دیتی ہے خوش الحانیاں اس کی

لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھُومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اُس کا تبسّم اُس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اُس کی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اُس کی

۱۹۳۹ء

مزارِ رہنما

بر مزارِ ڈاکٹر انصاری مرحوم

سُنیں اربابِ دل اہلِ نظر بھی! — نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی
جمالِ قوم بھی صاحب نظر بھی! — مسافر بھی، خضر بھی چارہ گر بھی
خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں — خروشِ برق و طوفانِ شرر بھی
سکونِ دیر۔ تقدیسِ کلیسا — گدازِ اُمتِ خیر البشر بھی
یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گذر بھی

۱۹۳۹ء

خوابِ سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر — رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا — دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا
اک نہ اک مذہب کی سعیِ خام بھی ہوتی رہی — اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی
آسمانوں سے فرشتے بھی اُترتے ہی رہے — نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے

ابنِ مریم بھی اُٹھے موسیٰ عمراں بھی اُٹھے
رام و گوتم بھی اُٹھے، فرعون و ہاماں بھی اُٹھے

اہلِ سیف اُٹھتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے
ایں جناب اُٹھتے رہے اور آنجناب آتے رہے

حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی

مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی

اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے

یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

سنہ ۱۹۳۹ء

غزل

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہگذرِ کارواں سے ہم

کیا پوچھتے ہو جھومتے آئے کہاں سے ہم
پی کر اُٹھے ہیں خُمکدۂ آسماں سے ہم

کیونکر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں
وہ رازِ دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم

ہمدم یہی ہے رہگذرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھیے
اُلجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

ہر نرگسِ جمیل نے مخمور کر دیا
پی کر اٹھے شراب ہر اک بوستاں سے ہم

ٹھکرا دیے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے ہم

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق
لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم

بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جراتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

سنہ ۱۹۴۱ء

عیادت

یہ کون آ گیا رخِ خنداں لئے ہوئے
عارض پہ رنگ و نور کا طوفاں لئے ہوئے

بیمار کے قریب بصد شانِ احتیاط!
دلداریِ نسیمِ بہاراں لئے ہوئے

رخسار پر لطیف سی اک موجِ سرخوشی
لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے

پیشانیِ جمیل پہ انوارِ تمکنت
تابندگیِ صبحِ درخشاں لئے ہوئے

زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی
اک کاروانِ نکہتِ بستاں لئے ہوئے

آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز!
ظلمت کدے میں شمعِ فروزاں لئے ہوئے

اک اک ادا میں سیکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسشِ پنہاں لئے ہوئے

میرے سوادِ شوق کا خورشیدِ نیم شب
عزمِ شکستِ ماہ جبیناں لئے ہوئے

درسِ سکون و صبر بہ ایں اہتمامِ ناز
نشتر زنیِ جنبشِ مژگاں لئے ہوئے

آنکھوں سے ایک رو سی نکلتی ہوئی ہر آن
غرقابیِ حیات کا ساماں لئے ہوئے

اٹھتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لئے ہوئے

یہ کون ہے مجاز سے سرگرمِ گفتگو
دونوں ہتھیلیوں پہ زنخداں لئے ہوئے

سنہ ۱۹۴۲ء

مادام

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لئے
لب پہ افسوں لئے آنکھوں میں مئے ناب لئے

ہر نفس رو میں لئے شورشِ طغیانِ نہاں
ہر نظر شوق کا افسانۂ بے تاب لئے

سحر و اعجاز لئے جنبشِ مژگانِ دراز
خندۂ شوخ جمالِ دُرِ خوش آب لئے

ضو فگن روئے حسیں پر شبِ مہتاب شباب
چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لئے

نشۂ ناز جوانی میں سرابور ادا
جسم ذوقِ گہرِ اطلس و کمخواب لئے

زلفِ شبرنگ لئے صندل و عود و عنبر
خمِ ابروئے حسیں دیر کی محراب لئے

لبِ گلرنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں
شوخیِ برق لئے لرزشِ سیماب لئے

ایک صیاد خوش اندامِ سوادِ مشرق
زلفِ بنگال لئے، طلعتِ پنجاب لئے

نزہت و ناز کا اک پیکرِ شاداب و حسیں
نکہت و نور کا امڈا ہوا سیلاب لئے

میری وارفتگیِ شوق مسلّم۔ لیکن
کس کی آنکھیں ہیں زلیخا کا حسیں خواب لئے

سنہ ۱۹۴۴ء

شرارے

خود کو بہلاتا تھا آخر خود کو بہلاتا رہا
میں بہ ایں سوزِ دروں ہنستا رہا گاتا رہا

مجھکو احساسِ فریبِ رنگ و بو ہوتا رہا
میں مگر پھر بھی فریبِ رنگ و بو کھاتا رہا

میری دنیائے وفا میں کیا سے کیا ہونے لگا
اک دریچہ بند مجھ پہ ایک وا ہونے لگا

اک نگارِ نازکی پھرنے لگیں آنکھیں مجاز
اک بتِ کافر کا دل درد آشنا ہونے لگا

عین ہنگامِ طرب رُخِ طرب تھرّا گئی
دفعتاً دل کے افق پر اک گھٹا سی چھا گئی

ایک آغوشِ تمنا کا تقاضا دیکھ کر — ایک دل کی سرد مہری بھی مجھے یاد آگئی

مجرمِ سرتابیٔ حسنِ جواں ہو جائیے — گلفشانی تا کجا، شعلہ فشاں ہو جائیے

کھائیے گا اک نگاہِ لطف کا کب تک فریب
کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جائیے

۱۹۴۵ء

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے
خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خوابگاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے
حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

ان دنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاریٔ عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہریاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا
بسترِ مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دنیا میری

جنتِ شوق تھی بیگانۂ آفاتِ سموم
درد جب درد نہ ہو، کاوشِ درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزمِ پرویں تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم
لیلیٔ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لئے دعوتِ خواب آتی تھی

سنگ کو گوہرِ نایاب و گراں جانا تھا
دشتِ پرخار کو فردوسِ جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آبِ رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا
میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرت میں ہے رازِ غم و حسرت پنہاں

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز، مرا نالۂ زار

شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں
میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟
۱۹۴۵ء

سانحہ

(گاندھی جی کی موت سے متاثر ہوکر)

دردِ غمِ حیات کا درماں چلا گیا — وہ خضرِ عصر و عیسیٔ دوراں چلا گیا
ہندو چلا گیا، نہ مسلماں چلا گیا — انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا
رقصاں چلا گیا، نہ غزلخواں چلا گیا — سوز و گداز و درد میں غلطاں چلا گیا
برہم ہے زلفِ کفر، تو ایماں ہے سرنگوں — وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا
بیمار زندگی کی کرے کون دلدہی — نبّاضِ و چارہ سازِ مریضاں چلا گیا
کس کی نظر پڑے گی اب عصیاں پہ لطف کی — وہ محرمِ نزاکتِ عصیاں چلا گیا

وہ رازدار محفلِ یاراں نہیں رہا
وہ غم گسارِ بزمِ حریفاں چلا گیا

اب کافری میں رسم و رہِ دلبری نہیں
ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا

اک بیخودِ سرورِ دل و جاں نہیں رہا
اک عاشقِ صداقتِ پنہاں چلا گیا

با چشمِ نم ہے آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا

اے آرزو وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش
ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا

اب سنگ و خشت و خاک و خذف سربلند ہیں
تاجِ وطن کا لعلِ بدخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغِ خونچکاں
خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

دیو بدی سے معرکہ سخت ہی سہی
یہ تو نہیں کہ زورِ جواناں چلا گیا

کیا اہلِ دل میں جذبۂ غیرت نہیں رہا
کیا عزمِ سرفروشیِ مرداں چلا گیا

کیا باغیوں کی آتشِ دل سرد ہو گئی
کیا سرکشوں کا جذبۂ پنہاں چلا گیا

کیا وہ جنون و جذبۂ بیدار مر گیا
کیا وہ شبابِ حشر بداماں چلا گیا

خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

سنہ ۱۹۵۰ء

مجازؔ کا فن — ایک تجزیہ

سیّد مشرف علی

انسان کے ذوقِ جمال کی نمود و تکمیل میں شعر و ادب نے جو اہم حصہ لیا ہے وہ اپنی جگہ ایک طویل تہذیبی داستان ہے۔ یہ سوال کہ شاعری کہاں تک ایک اجتماعی فریضہ، کہاں تک ایک انفرادی ضرورت، اور کہاں تک انسان کے ذوقِ جمال کا نمود و ظہور ہے، اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اور اس پر جو بھی فکر صرف کی جائے وہ اپنی جگہ نتیجہ خیز ہی ہوگی۔ میں اس وقت اس بحث میں الجھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ وجدانی طور پر میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اچھی شاعری وہی ہے جو دل و دماغ کو کسی حیثیت سے بھی توانا اور صحت مند اثرات سے بہرہ ور کرے۔ توانا اور صحت مند اثرات صرف براہِ راست تبلیغ کا ہی اجارہ نہیں ہیں۔ یہ عام تجربہ ہے کہ وہ اثرات جو بالواسطہ ذہن پر پیدا ہوتے ہیں۔ زیادہ دور رس اور زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔

مجاز کی شخصیت اور شاعری کے مطالعہ سے جو چیز سب سے پہلے نمایاں ہوتی ہے وہ یہ احساس ہے کہ وہ ابھی راہ کے درمیان میں ہے، کسی منزل پر نہیں پہنچا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا درمیان راہ کے تجربے جو اُسے ذوقِ لذت پر ابھارتے ہیں، نشاط کے نغمے بے اختیار اس کی زبان پر لے آتے ہیں اندرونی طور پر اس کے دل و دماغ کو اس طرح مجروح بھی کر دیتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی دیدہ زیب سہی بہرحال خونی تہہ قائم ہو جاتی ہے۔ مجاز کی شخصیت میں جتنی محبوبیت ہے اسی درجہ حیرت کا سامان ہے۔ وہ ایک فراخ طبیعت انسان تھا جو زندگی کو خوشگواری کے ساتھ برتنے کی تمنا رکھتا تھا اس کی نگاہیں رنگ و نکہت کے جادو کو جگاتی تھیں اور اس کے نغمے سینے کی اندرونی دھڑکنوں کو

زبان دے دیتے ہیں۔ وہ ایک خوش مزاج نشاط پسند، عیش محفل کی داد دینے والا انسان تھا لیکن اس کی زندگی بہت کم تمناؤں کی تکمیل کا سامان بن سکی۔ بیشتر اس نے لذت دل کے جام و مینا توڑے ہیں اور نغمہ نیم شب کو فغان سحر بنا ڈالا ہے۔ زندگی کے یہی اطوار کشمکش کے وہ سامان پیدا کرتے ہیں۔ جو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ہر انسان کے دماغ میں وجہ خلش بنتے ہیں۔ اور فنکار کے یہاں یہی چیزیں شدید ہو کر اس کے فن کا موضوع بن جاتی ہیں کچھ لوگ ہیں جو میرؔ کی طرح شائستہ آہ و فریاد کو اپنا مسلک بنا لیتے ہیں اور اس طرح غم دوراں، غم جاناں، سب کو اپنے اندرون وجود میں تحلیل کرتے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو غالبؔ کی طرح غم پر تڑپتے ہیں، احتجاج کرتے ہیں اور غموں سے کھل کر لڑنا چاہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ زندگی کے غموں سے بے پروا ہو کر نے نوازی کرتے ہیں کہ اس طرح ان کی تسکین دل کا سامان ہوتا رہے۔ مجاز بھی اسی صف کا آدمی تھا زندگی نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا، مشاعروں کی داد و تحسین سے قطع نظر اپنی انفرادی دنیا میں اسے جو سناٹے سے نظر آئے اور زندگی کو جن بے کیفیوں سے سابقہ پڑا۔ انھوں نے اس کے تصوارات میں اندرونی طور پر بڑا انتشار پیدا کر دیا مجاز کی شراب نوشی کا بھی یہی حال تھا "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے" کہا جا سکتا ہے کہ اس کی شخصیت میں یہ آن کیوں نہ پیدا ہو سکی کہ وہ مردانہ وار غم زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آجاتا۔ مجاز اس طبیعت کا آدمی نہ تھا وہ ان لوگوں میں نہیں تھا جو دوسروں کا خون بہا کر ہیرو بنتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو اپنے خون تمنا سے بزم کی رونق بڑھاتے ہیں۔

مجاز کی زندگی ایک المیہ (TRAGEDY) ہے ایک پر درد داستان ایک انتہائی غم انگیز گیت جس میں خوشی کی لہریں صرف اس لیے آئی ہوں کہ غم کا تاثر اور بڑھ جائے۔ اس کی زندگی نے بڑی بے دردی کے ساتھ اس عبرت کو نمایاں کیا جو بیشتر فنکاروں کا حصہ رہی ہے جب ہم اس کا ذوق سرمستی دیکھتے ہیں، اس کی محفل آرائی کا شوق ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے اور اس کی زبان سے ہم یہ رجز سنتے ہیں کہ۔

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چومے ہیں
اس بزم میں گر گر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں
آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں

تو ہمیں حیرت ہونے لگتی ہے کہ ایسا حوصلہ پیکار رکھنے والا فراخ مشرب نوجوان کس طرح اپنی زندگی ہی میں غموں کے سامنے سپر انداختہ ہو کر رہ گیا کہ اس کی زندگی بہت حد تک قابل رحم بن گئی فن زندگی کی پردہ پوشی کرتا رہتا ہے، یہ اس کا بڑا کمال ہے لیکن زخموں پر پردہ ڈالنے سے مرہم نہیں ملا کرتا ایک وقت آتا ہے کہ وہ زخم پردے میں چاک پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تمنا اور حسرت کی کش مکش اور فن اور زندگی کی بے ربطگی نمایاں ہو کر بالکل سامنے آجاتی ہے فنکار کے تصورات ایک چیز ہیں اور زندگی کی حقیقتیں بیشتر حالتوں میں بالکل دوسری ہیں۔ فن زندگی کے خوابوں کی تعبیر ہمیشہ رہا ہے زندگی کی در و بست کی تدبیر بہت کم بن سکا ہے اسے فن کی عاجزی سمجھیے یا زندگی کی، ظلم پسندی، بہر حال یہ تلخ حقیقت ادب میں اکثر ابھرتی رہی ہے اور ابھرتی رہے گی۔ مجاز مرحوم اس تلخ حقیقت کا ایک عبرت انگیز نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

مجاز کی شاعری میں غم بھی ملتا ہے۔ یہ غم نہ کوئی رسمی تخلیق ہے اور نہ آورد کی چیز ایسے موقع آتے ہیں جب اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ تنہا بزم طرب سے دور نہیں ہے بلکہ زندگی کے اطمینان سے بھی دور ہے۔ کوئی مبہم سی خواہش جو بے اختیار اسے بے چین کرتی ہے اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، وہ ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پاتا کہ اپنی تکمیل خواہش کا سامان کیونکر پیدا کرے

ایک حسرت سی دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ یہی مبہم آرزو اور اسی کی خاطر حیرت و حسرت کے پھیلنے والے میدان اس کی شاعری کو ایک لذت سے بھرا ہوا اور دسیتے ہیں رومانیت ایسے ہی اجزا سے بنتی ہے جہاں ابہام، نظر کی خیرگی، ذہن و دل کی حسرت زدگی ایک نہ معلوم سی تڑپ اور نہ سمجھنے والا درد ہوتا ہے۔ مجاز کی شاعری رومانیت کا ایک گہرا انداز رکھتی ہے۔ اُردو میں رومانی ادب فلسفیانہ کم ہے۔ خیال آرائی اور آرائش بیان سے زیادہ عبارت ہے۔ مجاز نے اپنی شاعری کو فلسفیانہ انداز نہیں دیا۔ اس کے یہاں رومانیت عورت کی کارفرمائی، دل و دماغ کے حوصلوں بیان کی نغمگی اور مبہم آرزوؤں کے جادو سے ملتی ہے لیکن مجاز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے یہاں یہ رنگ بہت شائستہ اور بہت نکھرا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی طبیعت کا پتہ دیتا ہے جو جنون و محبت کی ادب آشنا ہے اور سلیقہ جس کے لیے بہت بڑی چیز ہے۔ مجاز کا تعارف ادبی دنیا سے خصوصی طور پر ترقی پسند ادیبوں کے واسطے سے ہوا۔ ترقی پسند ادیب ادب کا یہ تصور لے کر اٹھے کہ ادب زندگی کی عکاسی اور ترجمانی ہے اور ادب کا فرض ہے کہ وہ زندگی کی کش مکش میں خاموش ناظر بن کر نہ رہ جائے بلکہ موج و طوفان سے کھیلے تاکہ ساحل کی رونق زد میں نہ آنے پائے۔ مجاز ظلم کا دشمن ہے۔ وہ بھی سامراجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ عوام میں آزادی کی لہر دیکھ کر وہ بھی بے اختیار مسرت کے لہجہ میں کہہ اٹھتا ہے۔

بول ری دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈاواں ڈول
بول ری دھرتی بول.....

مجاز کے سلسلہ میں ایک چیز خاص طور پر نگاہ میں رکھنے والی ہے وہ یہ کہ روزِ اوّل سے اس کے کلام میں وہ رچا ہوا رنگ رہا جو غزل کا سب سے بڑا فیضان ہے۔ اس کی شاعری میں جو نفاست، نغمگی، سوز اور تڑپ اور بات کو دل نشیں بنا کر کہنے کا سلیقہ ملتا ہے وہی درحقیقت اس کے فن کی حقیقی خوبی ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوانے میں کتنی فرزانگی اور اس وارفتہ حسن میں

آداب محبت کا کس درجہ لحاظ تھا۔ مجاز کسی بھی علقہ سے وابستہ رہا ہو لیکن اس کی شاعری کبھی بھی کسی ایک حلقے تک محدود نہ رہی۔ یہ زبردست مقبولیت مجاز کو صرف اس لیے حاصل ہوئی کہ غیر شعوری طور پر سہی وہ یہ جانتا تھا کہ ہر ادب کی روایات اس کی تہذیب کی گود سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ اس تہذیب کے پورے حلقے کے لیے سامان تسکین فراہم کرتی رہیں۔ یہ احساس جس ادیب اور شاعر میں جتنا زیادہ قوی ہوگا اتنا ہی اس کے ادب میں زیادہ جان ہوگی اور اسی قدر مقبولیت کے ساتھ خدمت ادب کر سکے گا۔

مجاز کی موت سے نئی نسل کو یہ محسوس ہوا گویا ان کا سب سے زیادہ دل نشیں شاعر چھن گیا۔ ادب زندگی کو اثر و تاثیر دینے والے فنون میں ایک باعظمت فن ہے۔ وہ فنکار یقیناً ادبی قدر و ستائش کے مستحق ہیں جن کی آواز پر زمانہ یہ کہہ اٹھے کہ

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

نوحۂ مجاز

(۱)

او زندہ دل مجاز تجھے آخری سلام
او میرے دلنواز تجھے آخری سلام
او رندِ پاکباز تجھے آخری سلام

(۲)

تو جا رہا ہے چھوڑ کے بازیچۂ حیات
لیکن پکارتی ہے تجھے روح کائنات
تو اس قدر خموش ! کہ سنتا نہیں ہے بات

(۳)

اُف اِس قدر خموش ! ارے اس قدر خموش
کیا کہہ رہے ہیں ؟ سُن ۔ ترے اربابِ ناؤنوش
یہ میکشی بھی کیا ؟ نہ رہے زندگی کا ہوش

(۴)

کروٹ ترے بغیر نہ بدلیں گے صبح وشام
اسٹیم کے گیت گائے گا ۔ ڈالر کا ہر غلام
رُک جا ۔ بُلا رہے ہیں تجھے مضمحل عوام

(۵)

ہیں یوں تو لاکھ امن کے پیغامبر یہاں
ہاں تیری بات اور تھی ۔ افسوس تو کہاں
ڈر ہے کہ ٹوٹ جائے نہ شیشے کا یہ جہاں

(۶)

شیشے کے اِس جہان میں لاکھوں ہیں مُورتیں
دل جن کے ہیں اُداس ۔ پریشاں ہیں صورتیں
پستی ہیں ہر مشین میں جن کی ضرورتیں

(۷)

اِن مُورتوں کو تیری ضرورت ہے اندنوں
رُک جا ۔ کہ تیرا ہجر قیامت ہے اندنوں
دُنیا پناہ خواہِ محبت ہے اندنوں

(۸)

تجھ کو پکارتی ہیں دھڑکتی جوانیاں
یاد آرہی ہیں سب کو تری مہربانیاں
آکر سنا دے ان کو ۔ انھیں کی کہانیاں

(۹)

جھنکار چوڑیوں کی خموشی میں کھو گئی
آکاش میں بہار ۔ ستارے پرو گئی
ساغر پکارتا ہے کہ آ رات ہو گئی

(۱۰)

لیکن تری جگہ تو ستاروں سے دُور ہے
دنیا کی" ہولناک بہاروں سے دُور ہے
تُو" اب ہماری راہگذاروں سے دُور ہے

(۱۱)

دل کو یقین ہے کہ تُو واپس نہ آئے گا
آیا - تو یہ طلسم ازل ٹوٹ جائے گا
جیسے یہاں نبھائی - وہاں بھی نبھائے گا

(۱۲)

کیا غم! چلا جو غلغلۂ جنگ چھوڑ کے
دیکھیں گے - ہولیوں میں ترا رنگ چھوڑ کے
شاید یونہی گیا ہے تو آہنگ چھوڑ کے

(۱۳)

اے زندہ دل مجاز - تجھے آخری سلام
اے میرے دلنواز - تجھے آخری سلام
اے رندِ پاکباز - تجھے آخری سلام

شہید صفی پوری

شکستہ ساز

خموشِ نغمۂ ہستی ہے ساز ٹوٹ گیا طلسمِ عشق و فسونِ نیاز ٹوٹ گیا
تسلسلِ الم جانگداز ٹوٹ گیا ستم ہے رشتۂ جانِ مجاز ٹوٹ گیا
اسیر چھوٹ گیا سوگوار زنداں ہے

زباں پہ حرفِ شکایت نہ درد کی روداد غمِ بہار ہے باقی نہ شکوۂ صیاد
نہ التہابِ تمنا نہ حسرتِ فریاد نہ بے بسی کا اندھیرا نہ ظلمتِ بیداد
نہ اضطراب نمایاں نہ سوزِ پنہاں ہے

امینِ کشمکشِ ذوقِ جستجو نہ رہا قتیلِ شوق، گنہگارِ آرزو نہ رہا
اداشناسِ حسینانِ خوبرو نہ رہا کنارِ باغ کے نباضِ رنگ و بو نہ رہا
چمن سے رخصتِ صورت گرِ بہاراں ہے

زبانِ دل پہ تھا جس کی پیامِ بیداری تنِ نحیف میں الفت کی رگ تھی ساری
بنا کے خوں سے کیا جس نے عزمِ گلکاری اُسے لحد میں چھپانے کی اب ہے تیاری
وداعِ شاعرِ [illegible]

حصہ دوم

مقالات، افسانے، نظمیں

"یہ دانش گاہ (مسلم یونیورسٹی) ہمارے وطن کے ایک ایسے سپوت کے خوابوں کی تعبیر ہے جس نے اپنی دوراندیشی سے انیسویں صدی کی سیاسی اور تہذیبی کشمکش میں ہندوستان کی تقدیر پڑھ لی تھی، اور مشرق کے جذب وشوق کو مغرب کے علم وآگاہی سے آشنا کرنے کی سعی شروع کردی تھی۔ سید احمد خاں کسی طرح اس پر راضی نہ تھے کہ ہندوستان کے مسلمان بس ماضی کے طلسمات میں اسیر رہیں اور حال کے تقاضوں اور مستقبل کے امکانات کو نظرانداز کردیں۔ اپنی جامع شخصیت اور انتھک کوشش سے انھوں نے عقیدہ کو عرفان سیاست کو بالغ نظری، تہذیب کو جامعیت، ادب کو خلوص کی گرمی اور علم کی روشنی اور معاشرت کو پُرکار سادگی عطا کی۔ اور ماضی کو بار دوش کے بجائے حال کے لیے سہارا بنایا۔"

ذاکر حسین

لکھنؤ کی زبان

اثرؔ لکھنوی

نوٹ: اس مضمون کی بنیاد حضرت جلالؔ لکھنوی کی کتاب سرمایۂ زبان اُردو ہے۔ یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُس وقت سے ابتک زبان میں متعدد تغیرات ہوگئے ہیں جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ورنہ ان کی تعداد کثیر ہے۔۔

آگ کا درخت ۔ مدار کا درخت

عرضِ اثرؔ ۔ اسے آک کا درخت کہتے ہیں۔ کاف عربی بجائے فارسی۔

آنکھیں پتھرانا ۔ آنکھوں کا بے نور ہو جانا۔ جرأت۔

ع کہیو اے پیغامبر آنکھیں تو یاں پتھرا گئیں   جلد آپہنچو اجی ہم منتظر ہیں دیر سے

ذوقؔ ع پتھرا دیا جلوے نے ترے چشمِ صنم کو   چکرا دیا غمزے نے ترے طوفِ حرم کو

عرضِ اثرؔ ۔ آنکھیں پتھرانا شدید انتظار یا کسی اور سبب سے آنکھوں کا جم جانا بے حس و حرکت ہو جانا ہے یہ ضرور نہیں کہ ان کا نور بھی زائل ہو جائے۔ قریب بمرگ ہونا بھی ہے۔

آنکھیں چھت سے اور چھت کو لگ جانا ۔ کنایہ ہے حیرت زدہ اور دنگ رہ جانے سے۔ جرأتؔ۔

ع گئے یوں بسترِ غم پر کہ آنکھیں لگ گئیں چھت سے   نظر آیا تھا جرأت ہم کو جلوہ بام پر کس کا

مولفہ ع   مرے گھر کیوں نہ آیا وہ شب وعدہ یہ حیرت ہے

جو سوئے در لگی تھیں اب وہ آنکھیں لگ گئیں چھت سے

عرضِ اثرؔ ۔ اس کا مفہوم انتظار یا بیماری کے سبب سے بے حس و حرکت پڑے رہنا اور چھت کی طرف

دیکھتے رہنا ہے۔ حیرت زدگی کا پہلو نہیں نکلتا۔

آنکھیں مانگنا ۔ کنایہ ہے نور بصر کی جستجو اور نور بینائی ڈھونڈھنے سے ۔ بحر

تمھاری زلف نے کانوں کو کالے دن دکھائے ہیں در روزن سے آنکھیں مانگنے بچھو نکلتے ہیں
کانوں؟

عرض اثر ۔ کنایۃً ضعیف و ناتواں ہو جانا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا جانا ہے۔

ادل بدل ۔ ادلا بدلا ۔ عوض اور بدل کسی چیز کا کہ ایک چیز دیں اور دوسری چیز لیں۔

عرض اثر ۔ دونوں فقرے مرادف نہیں ہیں۔ ادل بدل چیزوں کا مبادلہ ہے اور ادلا بدلا احسان یا عداوت کا عوض ہے۔

ادھن ۔ لگن کے وزن پر۔ وہ پانی جسے کھانا پکانے کے لئے دیگ میں گرم کریں۔

عرض اثر ۔ اس لفظ کا استعمال مخصوص ہے اس پانی کے لئے جو اناج (دال چاول وغیرہ) ابالنے کے لئے گرم کریں۔ نیز پینے کے لئے ٹھنڈے پانی کے عوض گرم پانی ملے تو کہتے ہیں کہ ادھن پی رہے ہیں۔

ارے ۔ ایک کلمہ ہے کہ مرد حقیر کو اس سے خطاب کرتے ہیں

عرض اثر ۔ کلمۂ استعجاب بھی ہے ۔ مثلاً ارے یہ کیا ہو گیا۔ زائد بھی آتا ہے ۔ مثلاً ارے میاں بھی اس چلچلاتی دھوپ میں کہاں جاؤ گے

اصیل ۔ کفیل کے وزن پر۔ اچھے لوہے کی تلوار ۔ زن طباخہ و خدمت گزار۔

عرض اثر ۔ ملازمہ کے معنوں میں تنہا نہیں آتا۔ ماما اصیل بولتے ہیں ۔ تلوار ہی نہیں جانور بھی اصیل ہوتے ہیں مثلاً اصیل گھوڑا ، اصیل مرغ ۔

اللہ کرے ۔ ایک کلمہ ہے دعائیہ ۔ بحر۔

ع چھینے نہ دیا ایک مجھے لاکھ جھڑے پھول اللہ کرے خانۂ گلچیں میں پڑے پھول

عرض اثر۔ صرف دعائیہ کلمہ نہیں کوسنا بھی ہے ۔ بحر کے شعر میں یہی مفہوم ہے۔ اللہ کرے خانۂ گلچیں میں پڑے پھول کا مطلب ہے اللہ کرے گلچیں کے گھر میں آگ لگے ۔

اندھا کنواں ۔ کنایہ ہے چاہ تاریک سے ۔ بحر۔

؎ اے انتظار، جان مسافر نہ گر پڑے — اندھے کنویں نہیں آنکھوں میں یہی گر تنے نہیں

میر تقی؎ نہ اک یعقوب رویا اس الم میں — کنواں اندھا ہوا یوسف کے غم میں

عرض اثر۔ اندھا کنواں، ایسا کنواں ہے جس میں پانی نہ ہو۔

اندھیارا۔ اندھیرا۔ تاریکی۔ لیکن فی زمانہ اندھیرا مستعمل ہے اور اندھیارا متروک الاستعمال ہے

عرض اثر۔ ایک حد تک یہ فیصلہ درست ہے مگر اندھیارا یا اندھیاری کو متروک کیوں قرار دیجئے۔ اگر

میں اس کی اندھی تقلید کرتا تو میرا یہ مطلع معرض وجود میں نہ آتا ؎

پاؤں میں چھالے راہ میں کانٹے آنکھ تلے اندھیارا ہے — ڈوبتے دل کی آس نہ توڑو یار کے تم کو پکارا ہے

طلسم فصاحت میں محمد حسین جاہ لکھنوی حضرت جلال کے معصرا لکھتے ہیں ؎

اندھیاری کا اس کی چاندنی نام — تھا عرصۂ دو جہاں بھی اک گام

انڈے لڑانا قمار بازی کی ایک قسم ہے کہ باہم انڈے لڑاتے ہیں اور جیت ہار کرتے ہیں۔

عرض اثر۔ یہ لفظی معنی ہوئے۔ مجازاً بیکار مشغلوں میں وقت گنوانا۔

انکھڑیاں۔ معشوق کی آنکھیں۔

عرض اثر۔ اتنا اضافہ کرنا چاہیئے تھا کہ آنکھوں کے برخلاف انکھڑیوں میں خوبصورتی کا مفہوم شامل ہے۔

اٹھ بیٹھ۔ نشستن و برخاستن کا ترجمہ ہے اور ایک قسم کی تعذیر (تعزیر؟) سے عبارت ہے جیسے

کہ معلم اور ادیب خطا وار لڑکوں کو اٹھ بیٹھ کراتے ہیں۔

عرض اثر۔ اٹھ بیٹھ بار بار اٹھنا بیٹھنا بہت مصروف ہونا ہے۔ بچوں کی تادیب کو اٹھا بیٹھی کہتے ہیں۔

اداسی۔ سوا معنیٔ معروف کے اس لفظ کا کسی رنگ کے شوخ نہ ہونے پر اور شمع و چراغ کی بے رونقی پر

بھی اطلاق کرتے ہیں۔

عرض اثر۔ اداسی فقیروں کے ایک گروہ کا بھی نام ہے۔ میرا شعر ہے ؎

دل سے یوں حسرتیں چلیں جیسے — غول اداسی فقیروں کا جائے

اڑان گھائی۔ کنایہ ہے فریب دینے سے۔

عرض اثر - اب زبانوں پر اڑن گھائی ہے - اڑان کا دوسرا الف نکال دیا۔

اوشغلا چھوڑنا - کوئی سخن فساد انگیز کہہ کر دو آدمیوں کو آپس میں لڑا دینا -

عرض اثر لکھنؤ کی بیگمات اشتلا کہتی ہیں - غ کو ق سے بدل دیا - غور کیجئے کس میں زیادہ لطافت ہے۔

اولما ہونا - واؤ مجہول اور لام ساکن کے ساتھ - یہ کلمہ وہاں بولتے ہیں جہاں پوست انسان خواہ حیوان کا بسبب آب گرم ڈالنے کے گوشت سے جدا ہو جائے -

عرض اثر - آب گرم کی قید ضروری نہیں - پان میں چونا زیادہ ہونے سے منہ کٹ جائے تو کہتے ہیں کہ اتنا چونا تھوپ دیا منہ اولما ہو گیا

بازار کی مٹھائی - کنایہ ہے اس چیز سے جو ہر ایک کو دستیاب ہو جائے

عرض اثر - مجازاً کسبی - مثل بھی ہے - بازار کی مٹھائی جس نے پائی اس نے کھائی - انشا نے بھی دریائے لطافت میں اس کے معنی زن کسبی لکھے ہیں -

بایاں - سوائے دست و پائے چپ کے ایک ساز کا بھی نام ہے کہ اس کو طبلہ کے ساتھ بجاتے ہیں -

عرض اثر - طبلے کے ساتھ نہیں بجاتے بلکہ بایاں خود اس طبلے کو کہتے ہیں جو بائیں ہاتھ سے بجایا جاتا ہے -

برس کے برس دن - اس دن کو کہتے ہیں جو سال بھر کے بعد آتا ہے اور کوئی خوشی و جشن اس دن کرتے ہیں مانند عید اہل اسلام وغیرہ -

عرض اثر - ہم برس برس کے دن کہتے ہیں -

بڑبڑیا - جو بہت لاف و گزاف کی باتیں کرتا ہو -

عرض اثر - ہم ایسے شخص کو بھڑ بھڑیا کہتے ہیں

بسم اللہ - ایک تقریب شادی کا نام ہے کہ اہل اسلام مکتب میں اپنے لڑکوں کو بٹھاتے ہیں - ایک کلمۂ تعظیم -

عرض اثر - اور بھی محل استعمال ہیں - مثلاً کھانا شروع کرنے کی استدعا یا اور کسی کام کا آغاز کرنے کے قبل - زنانی سواری اترنے کے وقت کہار یہ کلمہ زبان پر لاتے ہیں - کسی گرتے ہوئے کے سنبھلنے کے لئے

کہتے ہیں - میرا شعر ہے -

لڑکھڑائے جو قدم حسن کہے بسم اللہ　　پہلے یہ تو محبت میں یہ امکان کرو

بکٹنا - ہاتھ کی انگلیوں کو پھیلا کر کوئی چیز لینا ..

عرض اثر - بلا تشدید درج ہے - یہ بضم اول و فتح دوم و تشدید تائے ہندی ہے - بکٹا بھرنا انگلیاں پھیلا کر کسی کا گوشت مسلنا، بھر مٹھی چٹکی لینا بھی ہے

بندھن بار اور بندھن وار، دامن دار اور چمن زار کے وزن پر - وہ ریسمان خواہ رشتہ جس میں باغبان پھول و برگ اور میوے باندھ کر شادی کے گھر کے دروازے پر لا کر باندھ دیتے ہیں لیکن بندھن وار جو چمن زار کے وزن پر بولا جاتا ہے اس کی صحت میں مولف ہیچمدان کو کلام ہے -

عرض اثر - صحت و عدم صحت کا سوال نہیں زباں زد بندھن وار ہے بندھن بار کوئی نہیں بولتا - فاضل مولف نے کوئی وجہ نہیں بتلائی کہ ان کو بندھن وار کی صحت میں کیوں کلام ہے - بندھن باندھنا ہے اور دوار، دوار (دروازہ) کا مخفف ہے - پھر صحت میں کیوں شک ہو

بوٹی بوٹی پھڑکنا - دونوں واو مجہول - مسخرگی و رقص میں کسی کے تمام اجزائے بدن کا پھڑکنا اور جنبش کرنا -

عرض اثر - مجھے حیرت ہے کہ فاضل مولف نے عورتوں کی ایک شوخ اور حسین ادا کو رقص و مسخرگی میں مبدل کر دیا - عام طور پر کوئی نو عمر عورت جو شوخ اور چلبلی ہو اس کی نسبت کہتے ہیں کہ بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے

بھچک - حیران و متحیر -

عرض اثر - اب اس جگہ جو لفظ مستعمل ہے وہ بھوچکا ہے - بھچک کوئی نہیں بولتا -

بھگو - کاف فارسی مشدد - واو معروف - لڑائی سے بھاگا ہوا خواہ آدمی ہو خواہ جانور -

عرض اثر - اب قطعاً مستعمل نہیں - بھاگا ہوا آدمی بھگوڑا ہے - بھاگا ہوا جانور خصوصاً بیٹرا بھگتا ہے -

بھونڈ پیرا - واو غیر ملفوظ اور نون غنہ جس کا پیرا منحوس ہو - عورت کے لئے بھنڈ پیری -

عرضِ اثر۔ لکھنؤ کی بیگمات اس کا تلفظ بھن پیرا اور بھن پیری کرتی ہیں جو یقیناً مندرجہ الفاظ سے بگڑے ہیں۔

بینڈی کھوپری ۔ مجازاً شخص کم فہم اور جاہل ۔

عرضِ اثر۔ ہم اوندی کھوپری کہتے ہیں ۔ ایسا شخص جس کی عقل گدّی میں ہو۔ البتہ باتیں اینڈی بینڈی ہوتی ہیں ۔

پسینا چھوٹنا ۔ پسینا نکلنے کا مرادف ہے ۔ جرأت سہ

میں آہ گرم لگا کھینچنے تو پھر کیا کیا　　پسینا اس کے رُخ پر عتاب سے چھوٹا

عرضِ اثر ۔ پسینا چھوٹنا خالی پسینا نکلنا نہیں ہے بلکہ کثرت سے پسینا آنا ہے ۔ جرأت کے شعر میں بھی یہی مطلب ہے ۔ کیا کیا سے کثرت کا اظہار ہوتا ہے ۔

پکسانا ۔ میوے کا درخت سے ٹوٹ کر گھر میں رہ کر پختہ ہونا ۔

عرضِ اثر ۔ اس کا صحیح مفہوم ہے گھر میں رکھ کر اتنا پکانا کہ پھل سڑنے کے قریب ہو جائے اور مزے سے اتر جائے ۔

پنواڑی ۔ وہ جگہ جہاں پان کے درخت ہوتے ہیں ۔

عرضِ اثر۔ پنواڑی تو ہندی میں پان بیچنے والے یا تنبولی کو کہتے ہیں ۔ ہم اس جگہ کو جہاں پان کے درخت ہوتے ہیں پنواڑی نہیں بلکہ بھیٹ (یائے معروف) کہتے ہیں۔

پوٹ ۔ بوا و بھول ۔ رخت کفن ۔ میر سہ

کیا کیا عذاب گور میں ہوتے ہیں دیکھئے　　گٹھری مرے گناہوں کی مردے کی پوٹ ہے

عرضِ اثر ۔ پوٹ بڑی گٹھری یا پشتارے کو کہتے ہیں نہ کہ رخت کفن کو ۔ میر کے شعر میں بھی مردے کی پوٹ نظم ہے خالی پوٹ نہیں ہے ۔

پھپھٹ ۔ شور و غوغا اور فساد ۔

میر تقی سہ دیتی ہے طول بلبل کیا نالہ و فغاں کو　　دل کے الجھنے سے ہے یہ عاشقوں کی پھپھٹ

عرضِ اثر ۔ یہ لفظ ہائے ملفوظ کے ساتھ پھبھٹ ہے نہ کہ پھپھٹ (ہائے مخلوط و تشدید بائے فارسی)

بہت عام لفظ ہے فاضل مولف نہ معلوم کس دھن میں تھے۔ اسلئے کا اختلاف ہو نہیں سکتا کیونکہ اس سے قبل اور اس کے بعد متعدد الفاظ ہائے مخلوط سے درج ہیں۔ مثلاً ماقبل پھبتی، پھبن پھپا وغیرہ اور مابعد پھپک، پھپھس، پھپھولا وغیرہ۔ کتاب میں بھی ہائے ملفوظ و ہائے مخلوط کے فرق کا لحاظ رکھا گیا ہے مثلاً پہاڑ۔ میرے پاس جو مبیر کا کلیات ہے اس میں بھی پھپھٹ ہائے ملفوظ سے درج ہے۔

پھولام۔ ایک کپڑے کا نام ہے کہ اس میں پھولوں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں۔

عرض اثر۔ ہم اسے ماٹھا پھلام کہتے ہیں۔ اس میں پھولوں کی تصویریں کیسی موٹا جھوٹا سفید سوتی کپڑا ہوتا ہے۔ یہ کپڑا پہلے پہل مدراس کے ایک قصبے ماداپالم میں بنا تھا انگریزوں نے اسے اس قصبے کے نام پر MADAPOLLAM کہا ہم نے میڈا کو ماٹھا اور پالم کو پھلام توڑ مروڑ کر بنا لیا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق مدفیوضہ نے بھی اپنی مرتب کردہ انگریزی۔ اُردو ڈکشنری میں اسے ماٹھا پھلام لکھا ہے نہ کہ خالی پھلام۔

پیالا۔ (ہونا؟)۔ ہائے مخلوط التلفظ کیسا تھ۔ فقیروں کی جو فقیروں کے یہاں اور لکڑی پھینکنے والوں کی دعوت جو لکڑی پھینکنے والوں کے یہاں ہوتی ہے۔

ناسخ ؎ پیالا مجھ آزاد کا بھروے ساقی نہیں میرا پیالا ہوا چاہتا ہے۔

عرض اثر ناسخ کا شعر غیر متعلق ہے اس میں پیالا ہونا بمعنی دعوت ہونا نہیں ہے بلکہ مرنے کے بعد قل یا فاتحہ ہونا ہے۔ پیالا ہونا عرس ہونا بھی ہے اسے کھینچ تان کر فقیروں کی دعوت فقیروں کے یہاں ہونا کہہ لیجئے مراد اس سے بھی قل یا فاتحہ ہونا ہے۔ جہاں تک پٹے بازوں کا تعلق ہے پیالا ہونا کے معنی بالکل مختلف ہیں۔ یہ مفہوم میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا فسانہ آزاد سے اس کی مزید تصدیق ہوئی۔ اس کے معنی ہیں کہ ایک استاد کامل بنوٹ پر کئی شخص ایک ساتھ حملہ کرتے ہیں اور وہ سب کے وار خالی دے کر ان کو بیکار او ر زیر کر لیتا ہے اس وقت کہتے ہیں کہ پیالا (بروزن پالا) ہوا۔

پیٹ بھرا - کنایہ ہے غنی اور مال دار سے -

عرض اثر - پیٹ بھر کے کھانے ہوئے (شکم سیر) سے التباس بچانے کو اس کا تلفظ اس طرح کرتے ہیں کہ یائے مجہول کی آواز بہت خفیف نکلتی ہے یعنی مال دار شخص کو پیٹ بھرا کہتے ہیں -

پینگ بڑھانا - گہوارہ کی آمد و شد کا بڑے ہوا زیادہ کرنا -

عرض اثر - یہ تو محض لفظی معنی ہوئے - بروئے محاورہ ربط ضبط یا باہمی ارتباط میں اضافہ ہونا ہے

پیٹ مارنا یائے تحتانی مجہول کے ساتھ - کنایہ ہے پیٹ میں چھری مار کر اپنے کو ہلاک کرنے سے -

ناسخ ؎ نظر آیا جو پیٹ ساقی کا شیشۂ مے نے اپنا مارا پیٹ

عرض اثر - شاید ہی کوئی فاضل مولف کا ہمنوا ہو - شیشۂ مے کے پاس چھری کہاں سے آئی کہ اپنے پیٹ میں مار کر جان دے دی پیٹ مارنا غذا میں تقلیل کرنا یا فاقہ کرنا ہے مثلاً وہ اپنا پیٹ مار کر بچوں کی پرورش کرتا ہے - ناسخ کے شعر کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ شیشے نے دیکھا کہ ساقی کا پیٹ پچکا ہوا اور بہت خوبصورت ہے اور میرا پیٹ پھولا ہوا اور بدہیئت ہے لہذا اس نے تہیہ کیا کہ میں فاقے کر کے اور شراب سے حلق تک پر نہ رہ کر اپنا پیٹ گھٹاؤں گا نفس کشی کروں گا -

ترنگ - لاف و گزاف و تعلی -

ناسخ ؎ توڑے لکد سے شیشہ و ساغر جو ساقیا یہ بھی اک اپنے نشۂ مے کی ترنگ تھی

عرض اثر - لفظ ترنگ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا لفظ ہے مگر معنی مختلف ہیں - فارسی میں تیر چلاتے وقت کمان کے کڑکنے کی آواز کو کہتے ہیں - ہندی میں اس کے متعدد معنی ہیں مثلاً چونپ، امنگ، جوش، ولولہ، دھن نیز جو معنی حضرت مولف نے درج کئے ہیں تعلی و لاف و گزاف - ناسخ نے لفظ ترنگ ہندی معنوں میں ضرور استعمال کیا ہے مگر سیاق عبارت لاف و گزاف و تعلی کے بجائے نشے کی دھن کی طرف اشارہ کرتا ہے -

تڑیڑا - آب گرم کا خواہ اس گرم پانی کا جس میں دوائیں جوش کی ہوں کسی عضو درد مند اور صدمہ رسیدہ پر زور سے ڈالنا - کسی عضو نجاست آلود یا جامۂ نجس پر بھی بعد ازالۂ نجاست کے زور سے پانی ڈالنا

عرض اثر۔ ہم ۱ کو ترڑیڑا بہر دو رائے ہندی اور ۲ کو ترڑیڑا پہلی رائے بلا اور دوسری رائے ہندی کے ساتھ بولتے ہیں اور اس طرح نازک فرق مفاہیم کو نمایاں کرتے ہیں۔

ترڑیڑا کرنا۔ اسی پانی کا اسی طرح ڈالنا۔

عرض اثر۔ ہم ترڑیڑا اور ترڑیڑا دینا بولتے ہیں نہ کہ ترڑیڑا یا ترڑیڑا کرنا۔

تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ مجازاً نہایت تنگ جگہ۔

عرض اثر۔ اس جگہ پر اطلاق ہوتا ہے جہاں کثیر مجمع ہو۔ جگہ تنگ ہو یا کشادہ۔

تناریری۔ مغنیوں کے کچھ کلمات معین ہیں۔

عرض اثر۔ جہاں تک مجھے علم ہے تناریری سارنگی کی آواز کو کہتے ہیں۔ مغنیوں کے الفاظ مقررہ تا تھئیا تھئی ہیں۔

تو۔ واو معروف کے ساتھ ایک کلمہ ہے کہ اس سے ناکسوں کو خطاب کرتے ہیں۔

عرض اثر۔ کیا اللہ سے بربنائے وحدانیت اور معشوق سے بربنائے محبت و اخلاص تو کر کے خطاب نہیں کرتے؟

تنکی۔ ایک قسم کی نان تنک تر و خستہ تر کو کہتے ہیں۔

عرض اثر۔ ہم تنکی اس نان خستہ و باریک کو کہتے ہیں جو نمش کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ دوسری ایسی روٹیوں کو ہوائی روٹی کہتے ہیں۔

توتے ہاتھوں کے اڑ جانا۔ ..... یہ محاورہ بدون ہاتھوں کے لفظ کے بھی کلام قدما میں مستعمل ہے۔

میر ؎ اس نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے اُڑ گئے آئنے کے توتے سے

عرض اثر۔ انشا کے زمانے تک یہ محاورہ بلا استثنا بغیر ہاتھوں کے اضافے کے بولا جاتا تھا چنانچہ اس نے دریائے لطافت میں توتے اڑ جانا ہی لکھا ہے ہاتھوں کے توتے کی طرف کوئی اشارہ نہیں اس سے شاید یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ محاورے میں تغیر بعد کو ہوا۔ لہذا حضرت مولف کا یہ فرمانا گمراہ کن ہے کہ قدما کے کلام میں بدون ہاتھوں کے لفظ کے بھی تھا یعنی دونوں طرح تھا۔

تیرنا۔ شناوری کرنا۔ بعضے اس کو بجائے فوقانی بائے فارسی سے بولتے ہیں۔

عرض اثر۔ ہم نے اس طرح فرق کیا ہے کہ تیرنا کسی چیز کا پانی پر بہنا ہے اور پیرنا فن شناوری ہے۔

ٹکور۔ تکمید سے عبارت ہے یعنی پارچۂ گرم کردہ سے کسی عضو ماؤف کو سینکنا اور نوبت کے نقاروں کی آواز۔

عرض اثر۔ تکمید یا ٹکور بہر گرم کپڑے سے نہیں بلکہ پوٹلی سے سینکنا ہے۔ ہم نے یہاں بھی فرق کر دیا ہے۔ ٹکور بمعنی تکمید کو بکسر اول اور نوبت کی آواز کو ٹکور بفتح اول بولتے ہیں۔

ٹھاٹھ مارنا۔ بال و پر مارنا طائروں اور کبوتروں کا پرواز کے وقت۔

عرض اثر۔ سمندر یا دریا بھی ٹھاٹھ مارتا ہے جب اس میں اونچی اونچی لہریں اٹھیں کسی کا مصرع ہے:

سمندر ٹھاٹھ مارے گر نچوڑوں پاٹ دامن کا

ٹھگ۔ بالفتح سوا راہزن کے کنایۃً اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی سے بفریب کچھ لے لے۔

عرض اثر۔ ہم ایسے شخص کو ٹھگیا کہتے ہیں۔

جاگ۔ شب بیداری۔

عرض اثر۔ ایک معنی ہیں گھر والوں کا جاگ اٹھنا اور چور کا بے نیل مرام بھاگ جانا۔ مثلاً جاگ ہو گئی نہیں تو چور موس لے گیا تھا۔ شب بیداری تو رات بھر عبادت یا مراد برآنے کے لئے جاگتا رہنا ہے۔

جاگیر۔ سوائے معنی معروف کے طالب العلموں کے روزینۂ اندک کو کہتے ہیں کہ کہیں سے مقرر ہو جائے۔

عرض اثر۔ اسے جاگیر نہیں بلکہ وظیفہ کہتے ہیں۔

جال میں پھنسانا۔ سوا معنی معروف کے کنایہ ہے فریب کرنے اور کسی کو فریب میں لانے سے بھی۔

عرض اثر۔ یہ جال میں پھانسنا ہے نہ کہ پھنسانا۔

جبد۔ بروزن ابد۔ گراں اور ثقیل۔

عرض اثر۔ یہ زبانوں پر جبدا بفتح اول و دوم و تشدید بائے عربی و اضافہ الف ہے۔ مثلاً یہ کنکوا بہت جبدا ہے نہ کہ بہت جبد ہے۔

جڑاؤ ۔ واؤ معروف کے ساتھ ۔ زیور مرصع ۔

عرض اثر ۔ واو مجہول موقوف کے ساتھ بروزن ہواؤ بھی ہے ۔ اس صورت میں اس کے معنی ہیں جڑنے کی ترکیب ۔ مثلاً اس زیور کا جڑاؤ بہت خوش نما ہے ۔

جھنڈولے بال ۔ وہ موٹے سر جو کثرت سے سر پر ہوں ۔

عرض اثر ۔ گھونگھر ہونا بھی ضروری ہے اور صرف بچوں کے بالوں کے لئے مستعمل ہے ۔

جھوجھرا ۔ ذی تخلخل چیز ۔ یعنی وہ چیز جس کے اجزا باہم پیوستہ نہ ہوں ۔

عرض اثر ۔ لکھنؤ کی بیگمات اس کپڑے کو جھوبجھا کہتی ہیں جس کی سلائی صاف و ہموار نہ ہو بلکہ جا بجا جھول ہو ۔

جھونجھل ۔ واو معروف کے ساتھ ۔ غصہ او رپیچ و تاب ۔

عرض اثر ۔ ہم جھنجھلاہٹ کہتے ہیں بضم اول ۔

جیتا لہو ۔ خون تازہ جو بدن سے ابھی نکلا ہو ۔

عرض اثر ۔ لفظ جیتا کی تکرار کے ساتھ جیتا جیتا لہو کہتے ہیں ۔

جیوٹ ۔ دلیر و بہادر ۔

عرض اثر ۔ جیوٹ دلیری و بہادری ہے ۔ دلیر و بہادر کو جیالا یا جیوٹیا کہتے ہیں ۔

چاہیتا ۔ معشوق ۔ محبوب ۔

عرض اثر ۔ ہم پہلا الف حذف کرکے چہیتا کہتے ہیں ۔

چٹکی بجانے میں کام کرنا ۔ جلد تر کوئی کام کرنا ۔

عرض اثر ۔ ہم چٹکی بجاتے کام کرنا بولتے ہیں ۔

چکنی باتیں ۔ دلفریب اور خوشامد آمیز باتیں ۔

عرض اثر ۔ ہم چکنی چپڑی باتیں کہتے ہیں ۔

چوکی بھرنا ۔ کسی چیز کی حفاظت کرنا وقت معین تک باری باری ۔

عرض اثر۔ ایک مفہوم ہے مراد برآنے کے لئے عورتوں کی شب بیداری۔ شمع لے کر باری باری کھڑی ہوتی ہیں اور جب تک وہ جلتی رہتی ہے ایستادہ رہتی ہیں۔

چھکا لگنا۔ چھکا دینا۔ آگ سے بدن کا جل جانا۔

عرض اثر۔ ہم نے اس کا مفہوم گرم کھولتے ہوئے پانی سے گزند پہنچنے تک محدود کر دیا ہے۔ میرا شعر ہے:

ع اب ہے مزا دونے کا لے دل دینے لگا ہے چھکا پانی

خود منڈا۔ جو مرید کسی فقیر کا اور شاگرد کسی استاد کا نہ ہو۔

عرض اثر۔ میرے کان آشنا نہیں۔ بے گرُا یا بے استادا کہتے ہیں۔

دربار معمور ہونا۔ مجلس امرا و سلاطین کا حضار سے بھر جانا۔

عرض اثر۔ دربار معمور ہونا دربار برخاست ہونا ہے احتراماً معمور ہونا کہتے ہیں۔ خود حضرت مولف نے میم کی ردیف میں معمور ہونا کے یہ معنی لکھے ہیں۔

دولتی چھانٹنا۔ گھوڑے کا دونوں پچھلے پاؤں ایک ساتھ اٹھا کر مارنا۔

عرض اثر۔ ہم اسے دولتی جھاڑنا کہتے ہیں۔

دھتا بتانا۔ کسی کو اپنے پاس سے دور کرنا۔ اور یہ محاورہ بازاریوں کا ہے۔

عرض اثر۔ مجھے اتفاق نہیں۔ عوام و خواص سبھی بولتے ہیں۔

دھریاں اڑانا۔ ذلیل و خوار کرنا۔

عرض اثر۔ ہم دھرّے اڑانا کہتے ہیں۔

دھنا سیٹھ۔ مفسد اور سرکش آدمی۔

عرض اثر۔ اس کے یہ معنی نہیں بلکہ بہت مالدار شخص کو کہتے ہیں۔ انشا کی دریائے لطافت میں بھی یہی معنی درج ہیں۔

دھوپ۔ واو مجہول کے ساتھ دھوبی کے ہاتھ سے کپڑے کے دھوئے جانے کو کہتے ہیں۔

عرض اثر۔ ہم اسے شوب نا کہتے ہیں۔ عوام دھوب کہتے ہیں بائے موحدہ نہ کہ بائے فارسی سے۔

رحمت ہے۔ اک کلمہ ہے کہ تحسین و مرحبا کی جگہ اس کو بولتے ہیں۔ میر تقی۔ (ع)

ہماری خاک یوں اڑتی پھرے اے ابر رحمت ہے

عرض اثر۔ اس میں بیشتر طنز و شکایت کا پہلو ہوتا ہے۔ میر کے مصرع میں بھی موجود ہے۔

رسائن۔ ایک کلمہ ہے کہ لفظ آہستہ کا فائدہ دیتا ہے۔

عرض اثر۔ ہم بغیر ہمزہ رسان کہتے ہیں۔

زرا۔ ایک کلمہ ہے کہ لفظ اندک اور قلیل کے معنی کا فائدہ دیتا ہے اور جو اس لفظ کو ذال معجمہ سے لکھتے ہیں مولف ہیچمدان کے عندیہ میں خطا پر ہیں کیونکہ ذال معجمہ کا وجود جب فارسی میں بعض محققین کے نزدیک نہیں ہے تو کلمات ہندیہ میں کیونکر مسلم رکھا جائے گا۔

عرض اثر۔ لطف یہ ہے کہ مولف موصوف نے ہزار جگہ گذرنا، گذارا وغیرہ ذال معجمہ سے لکھا ہے۔

سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا جب تک ٹیڑھی نہ کیجئے۔ ایک مثل ہے اس شخص کی نسبت کہتے ہیں کہ لطف و نرمی سے اس سے کام نہ نکلے۔

عرض اثر۔ جب تک ٹیڑھی نہ کیجئے مثل کا جز نہیں اور فصیح بھی اس کے بغیر ہے۔

شرابور۔ شور بور۔ جو پانی وغیرہ میں سر سے لے کر پاؤں تک تر ہو۔ اور دریائے لطافت محاورہ فصحائے لکھنؤ سے ہے اور دوسرا لفظ ظاہراً محاورہ اہل دہلی سے معلوم ہوتا ہے۔ ناسخ۔

؎ غم سے برسات میں اس درجہ ہوا جوش شراب ہو گئی بادہ گلگوں میں شرابور گھٹا

میر تقی ؎ آج تیری گلی سے ظالم میر لوہو میں شور بور آیا ہے

عرض اثر۔ میں نے دونوں محاوروں کو استعمال کیا ہے:۔

موجوں کو شرابور کئے دیتی ہیں موجیں قطرے ہیں کہ چھوٹی ہوئی افشاں کے ستارے

؎ ہر سمت سے ہے بارش انوار سرمدی جلووں میں شور بور ہوا جا رہا ہوں میں

انشا کی دریائے لطافت سے معلوم ہوا کہ اس کے عہد تک دہلی میں دونوں محاورے رائج تھے۔ اس کی عبارت یہ ہے:۔

(شور بورا از زبان مرداں و شرابور از زبان زناں بمعنی آلودہ از سرتا پا)

یہ فرق برسوں رہے کر بعد کو شور بور دہلی سے اور شرابور لکھنؤ سے مخصوص ہو گیا

غبارا - ایک قسم ہے آتشبازی کی کہ مشہور و متعارف ہے اور بعضے اس لغت میں بائے موحدہ کو مشدد بولتے ہیں - بحر -

اڑے گا گنبد افلاک بن کے غبارا　　　جو میری آہ جہاں سوز کا دھواں پہونچا

لیکن تحقیق مقام یہ ہے کہ اول فصیح ہے اور دوم غیر فصیح -

عرض اثر - کیا خواص کیا عوام سب بہ تشدید با بولتے ہیں اور یہ غلط العام فصیح" کا مصداق ہے۔ غلط ہے تو ہوا کرے - یہ مسئلہ زبان کا ہے نہ کہ لغت کا -

غش لانا - بیہوش ہو جانا - ناسخ - دانستہ میں غش لایا تنزیا اسے کہتے ہیں -

عرض اثر - خود ناسخ کے مصرع سے واضح ہے کہ غش لانا بیہوش ہو جانا نہیں ہے بلکہ بیہوشی کا بہانہ کرنا ہے۔

کانٹوں پر کھینچنا - کنایہ ہے گناہگار کرنے اور آزار پہونچانے اور تکلیف دینے سے - بحر -

ع　جو کوئی فاتحہ کو آئے نام نہ لے بہار کا　　　کانٹوں پہ کھینچے گا مجھے سبزہ مرے مزار کا

عرض اثر - دوسرا محاورہ ہے کانٹوں میں کھینچنا یا گھسیٹنا جس کے معنی ہیں زیر بار احسان کرنا۔ وہ بھی درج کرنا چاہئے تھا کہ دونوں کا فرق نمایاں ہوتا -

کانوں پر ہاتھ رکھنا - کنایہ ہے کچھ آگاہ ہونے اور کچھ نہ جاننے سے - غالب دہلوی - قطعہ -

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں　　　دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام　　　اس سے یہ ہے مراد کہ ہم آشنا نہیں

عرض اثر - اس قطعہ سے محاورے کے معنی اخذ کئے گئے ہیں گویا الٹی گنگا بہائی گئی ہے - حالانکہ محاورے کا صحیح مفہوم پناہ مانگنا اور برأت چاہنا ہے - مثلاً وہ تمھارا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں یعنی تم سے بیزار ہیں -

کلیجا کھرچنا - کنایہ ہے اشتہائے صادق سے یعنی سچی بھوک سے -

عرض اثر۔ کلیجا کلہ جیا شدت کی بھوک لگنا ہے۔

کلیجا کا ٹکڑا۔ وہ فرزند جو نہایت عزیز ہو۔

عرض اثر۔ کلیجے کا ٹکڑا کہنا چاہئے۔

کنویں جھانکنا۔ کنایہ ہے جان دینے کے ارادہ پر کسی کے کنویں میں گر پڑنے سے۔ تجر۔

ے یہ جگہ وہ ہے فرشتوں نے کنویں جھانکے ہیں ۔۔۔ پاک آلائش دنیا سے نشہ کیا ہوگا

عرض اثر۔ کنویں جھانکنا کسی کی تلاش میں حیراں و سرگرداں ہونا ہے نہ کہ جان دینے کے ارادے سے کنویں میں گر پڑنا۔

کوتل۔ وہ مرکب جو خاص امرا کی سواری کا ہو۔

عرض اثر۔ کوتل وہ مرکب ہے کہ جس کی پشت پر سوار نہ ہو مگر ساز و یراق سے آراستہ امرا کے جلوس کے ہمراہ ہو کہ اگر ان کے دل میں آئے تو سوار ہو لیں۔

کوٹھیاں پڑنا۔ حلقہ ہائے گلیں یا چوبیں کا کنویں کے اندر کنواں کھودنے والوں کا ڈالنا۔

عرض اثر۔ یہ کوٹھیاں پڑنا نہیں بلکہ کوٹھیاں گلانا کہلاتا ہے۔

کھاری کنویں میں ڈال دینا۔ کنایہ ہے کسی چیز سے درگذرنے سے۔ تجر۔

ے قناد اگر سنے ترے شیریں دہن کے وصف ۔۔۔ کھاری کنویں میں قند کے کوزں کو ڈال دے

عرض اثر۔ اس کے معنی درگذرنے کے نہیں ہے بلکہ کسی چیز کو ضائع یا تلف کر دینا۔ تجر کے شعر میں بھی یہی مطلب ہے۔ لڑکی کی شادی اچھی جگہ نہ ہو تو کہتے ہیں کہ لڑکی کو کھاری کنویں میں ڈھکیل دیا یا ڈال دیا۔

کھلے بند۔ کنایہ ہے بے تکلف آدمی سے۔ میر تقی۔

ے کہا صبحدم میں نے غنچے سے جا کر ۔۔۔ کھلے بند مرغ سحر سے ملا کر

عرض اثر۔ اول تو یہ فقرہ کھلے بندوں ہے نہ کہ کھلے بند۔ کھلے بندوں کے معنی ہیں آزادی سے کھلم کھلا کھلے خزانے پالٹیکس میں بھی کھلے بندھوں اور کھلے بندوں ہے۔ نسیم لکھنوی کا بیت بھی میری تائید میں ہے:

ے کہکر کھلے بندوں جی کی تنگی ۔۔۔ بے ننگ ہوئی وہ شوخ تنگی

علاوہ بریں میرؔ کا قطعہ بند شعر بھی غلط نقل کیا گیا۔ قطعہ اس طرح ہے:۔

سحر گوش گل میں کہا میں نے جاکر کھلے بند دوں مرغ سحر سے ملا کر

لگا کہنے فرصت ہے یاں یک تبسم سو وہ بھی گریبان میں منہ چھپا کر

کھونپ۔ واؤ مجہول کے ساتھ ایک قسم کی دوخت یا سلائی کو کہتے ہیں۔

عرض اثر۔ کھونپ کپڑے کا وہ حصہ ہے جو سینے سے چھوٹ جائے اور جھول رہ جائے یا جو حصہ ادھڑ جائے۔ سلائی کے معنی میں کھونپ نہیں بلکہ کھونپ بھرنا ہے۔

کیڑا کتاب۔ وہ کیڑا جو کتاب میں لگ کر کتاب کو خراب و تباہ کر دیتا ہے اور کنایہ ہے اس شخص سے جو کتاب دیکھنے میں ہر وقت مشغول رہے۔

عرض اثر۔ یہ کتاب کا کیڑا ہوا نہ کہ کیڑا کتاب۔

گھٹ بڑھ۔ کمی زیادتی کسی چیز کی اس کی پیمائش کے وقت۔

عرض اثر۔ اس کے معنی ہار جیت کے بھی ہیں مثلاً پہلوانوں کی کشتی یا مرغ یا بیٹر کی پالی میں۔

گھما گھم اور گھما گھمی۔ رونق، ہنگامہ، گرمیٔ بازار۔

عرض اثر۔ میں نے ان الفاظ کو ہائے مخلوط کے ساتھ لکھنؤ میں کسی کو بولتے نہیں سنا۔ (ہ) کا اعلان ہوتا ہے مثلاً آج فلاں شخص کے گھر میں بڑی گہما گہمی ہے۔ محمد حسین جاہؔ لکھنوی کی تصنیف طلسم فصاحت میں بھی ہائے ملفوظ سے درج ہے "گہما گہمی اور دھوم دھام"، دونوں فقرے ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں، اور ہائے ملفوظ و ہائے مخلوط کی طرز تحریر میں فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ طلسم فصاحت کا سال تصنیف ۱۲۹۱ھ اور حضرت جلالؔ کی سرمایۂ زبان اردو کا ۱۳۰۳ھ ہے۔ لفظ گھما گھم رائج ہی نہیں ہے صرف گہما گہمی ہے۔

گھونگھٹ کی دیوار۔ وہ دیوار جس کو باغ کے یا مکان کے اندر آمد و شد کے دروازے کے مقابل کھینچ دیتے ہیں تاکہ نظر رہروؤں کی باغ کے یا مکان کے اندر نہ پڑے۔

عرض اثر۔ ہم اسے پردے کی دیوار کہتے ہیں۔

لاگو - واو معروف کے ساتھ وہ شخص جو کسی کے درپے ہو اور پریشان حال ہوتا ہو۔

عرض اثر - آدمی پر موقوف نہیں شیر چیتا کتا بند۔ وغیرہ جانور بھی لاگو ہوتے ہیں۔ لاگو کے معنی پریشان حال بہت مشتبہ ہے اس کا مفہوم ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ ہاں اب قانون بھی لاگو ہونے لگا!

لُثّھی - کاررفتہ (از کار رفتہ ؟) اور نرم شدہ چیز کو کہتے ہیں۔

عرض اثر - ہم از کار رفتہ چیز کو لُجھی پُچھی (بالکسر و تشدید ہر دو جیم) کہتے ہیں اور نرم شدہ چیز کو لیجھی (با اضافہ یائے معروف بعد لام بکسر)۔ لیجھی دراصل نشاستہ وغیرہ کے فضلے کو کہتے ہیں۔

لکیر کا فقیر - کنایہ ہے اس شخص سے جو ہمیشہ کسی کے گرد رہتا ہو اور عاشق اور شیدا ہو معشوق کے کسی نشان پر۔ چنانچہ کوئی شاعر کہتا ہے (ع) ہم مانگ کی لکیر کے اے دل فقیر ہیں۔

عرض اثر - محاورے کے عمومی مفہوم سے خالی الذہن ہو کر مندرجہ مصرع سے محاورے کے معنی گڑھے گئے ہیں۔ حالانکہ لکیر کا فقیر اس شخص کو کہتے ہیں جس کی طبیعت میں اپج اور جدت نہ ہو بلکہ کسی کے بتائے ہوئے یا پامال جادے پر چلے۔

لگاؤ - واو موقوف کیساتھ دو معنی پر آتا ہے (۱) تعلق طبیعت کا جو کسی کے ساتھ ہو گیا ہو۔ (۲) ایک مکان کا اتصال جو دوسرے مکان سے ہو۔

عرض اثر - معنی ۲ میں اتنے اضافے کی ضرورت ہے کہ اس طرح مکان محفوظ نہ ہو اور چوری کا اندیشہ ہو۔

لنگوٹیل یار - جس سے عہد طفلی سے یارانہ ہو۔

عرض اثر - اسے لنگوٹیا یار کہتے ہیں۔

لونگ چڑا - ایک قسم کے کباب کو کہتے ہیں کہ یہ کباب سوا لکھنؤ کے اور کہیں نہیں بنتا یعنی مختص ہے لکھنؤ کے ساتھ۔

عرض اثر - یہ ادعا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ انشا نے دریائے لطافت میں جہاں مصطلحات دہلی کا ذکر کیا ہے یہ فقرہ استعمال کیا ہے: "لونگ چڑے والا ہے یعنی بسیار ذلیل و تباہ و کم تشخص است۔"

لوہے کے چنے کا چبانا - کسی سخت تر اور دشوار تر کام کرنے سے کنایہ ہے۔

عرض اثر - محاورہ لوہے کے چنے چبانا ہے نہ کہ لوہے کے چنے کا چبانا۔

مار اتارنا - کسی کو مار ڈالنا۔

عرض اثر - اس کے معنی ہیں کسی کو بہت ہلکان اور پریشان کرنا۔

ماں جہت - نون غنہ کے ساتھ - قدر و منزلت۔

عرض اثر - لکھنؤ کی مستورات اس جگہ مان منتا یا مان گون بولتی ہیں۔

مٹک چٹک - تمسخر آمیز حرکتیں کسی کی۔

عرض اثر - اس کا مفہوم ہے شوخی اور چلبلا پن اور صرف عورتوں کے لئے مستعمل ہے۔ صحیح نشست الفاظ چٹک مٹک ہے۔

مرچیں سی لگنا - نہایت ناگوار ہونا کسی بات کا۔

عرض اثر - محاورے میں لفظ سی شامل نہیں صرف مرچیں لگنا ہے۔ مثلاً ہم کچھ کہتے ہیں تو مرچیں لگتی ہیں۔

ملائی - ہمزہ تحتانی معروف کے ساتھ ایک چیز ہوتی ہے دودھ کی بہت لذیذ اور عمدہ لطیف کہ اس کو ناخورش کرتے ہیں اور یوں بھی کھاتے ہیں اور یہ جو اس کو بالائی بائے موحدہ اور الف کے ساتھ بولتے ہیں غلط بولتے ہیں۔

عرض اثر - ملائی میں ایک سے زیادہ رکاکت کا پہلو نکلتا تھا۔ نواب سعادت علی خاں نواب وزیر اودھ نے اس کا نام بالائی رکھا۔ لکھنؤ میں یہ اتنا مقبول ہوا کہ خواص بالائی کے سوا ملائی بولتے ہی نہیں البتہ عوام زیادہ تر ملائی بولتے ہیں۔ سوال صحیح یا غلط کا نہیں بلکہ فصیح و غیر فصیح کا ہے اور اس نقطۂ نظر سے فیصلہ یقیناً بالائی کے حق میں ہوگا۔

نکتوڑا - واو مجہول کے ساتھ احسان و منت اور رنجش و آزردگی کی بات اور معشوقوں کے ناز و ادا کو کہتے ہیں۔

عرض اثر - لکھنؤ کی بیگمات اسے نکتورا (بکسر اول و رائے مہملہ) کہتی ہیں بمعنی غمزۂ بے جا۔

ورغلانا ۔ کسی کو جنگ وغیرہ پر آمادہ کرنا ۔

عرض اثر ۔ ہم ورغلانا کہتے ہیں نہ کہ ورغلانا ۔ اگر فیلن کا اعتبار کیا جائے تو ورغلانا دہلی کی زبان ہے ۔

ہاتھ کنگن کو آرسی کی کیا حاجت ۔ ایک مثل ہے کہ جو کچھ ظاہر و عیاں ہے اس کا بیان کرنا کیا ضرور ہے ۔

عرض اثر ۔ مثل عموماً یوں بولی جاتی ہے: ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ۔

ہاتھی ہزار لٹے پھر لاکھ من کا ۔ ایک مثل ہے اس صاحب مقدور اور ذی مایہ پر کہتے ہیں جو بالفعل مفلس و نادار ہو گیا ہو ۔

عرض اثر ۔ مثل اس طرح مشہور ہے: ۔ ہاتھی ہزار لٹے گا پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا ۔

ہراہند ۔ نون غنہ کیساتھ جن مسالوں کو مانند پیاز لہسن وغیرہ کے گوشت میں ڈال کر بھونتے ہیں ان کے کچے رہ جانے کی بو کو خوب بھونے نہ گئے ہوں ۔

عرض اثر ۔ ہراہند ہلدی کچی رہ جانے کی بو کو کہتے ہیں ۔ دوسرے مسالے کچے رہیں تو کچا بسا ہے گوشت کی بو بساہند ہے ۔

ہزار منہ ہزار باتیں ۔ ایک مثل مشہور ہے کہ مفہوم بھی اس کا متعارف ہے ۔

عرض اثر ۔ زبان زد اس طرح ہے: ۔ جتنے منہ اتنی باتیں ۔

ہنستی پیشانی ۔ کنایہ ہے انسان کی خندہ روئی سے ۔

عرض اثر ۔ ہم ہنسمکھ یا خندہ پیشانی کہتے ہیں ۔

ہتھ چھٹ ۔ وہ شخص جس کی ضرب خالی نہ جائے ۔

عرض اثر ۔ ہتھ چھٹ وہ شخص ہے جو ذرا سے اشتعال پر مار بیٹھے ۔

یاد اللہ ۔ ایک کلمہ ہے کہ بندگی اور سلام علیک کی جگہ زبان پر لاتے ہیں ۔

عرض اثر ۔ یاد اللہ کے معنی ہیں معمولی شناسائی ۔ خالی صاحب سلامت ۔

سید امین اشرف

غزل

ہوتا کہاں ہے قصۂ رنج و محن تمام
جب تک نہ ہو یہ منزلِ دار و رسن تمام

غنچے پریدہ رنگ گل و یاسمن اُداس
آئی ہے یوں بہارِ چمن در چمن تمام

جن کے لبوں سے تھا مئے ہستی کا کیف و کم
سوہان روح نکلے وہ شیریں سخن تمام

خوش ہوں کہ اب وہ مستیٔ خوابِ گراں نہیں
لو ہو رہا ہے سلسلۂ فکر و فن تمام

چھٹنے کو ہے غبارِ رہِ رہروانِ شوق
ہونے کو ہے جفائے سپہرِ کہن تمام

کچھ گلفروش اپنی تمنا ہے ان دنوں
کچھ ہو رہے ہیں آپ بھی گل پیرہن تمام

پوچھو تو کچھ ہمیں سے ہے یہ بزم رنگ و بو
فردوسِ عارض و لب و زلف و دہن تمام

ہم آج امین ان کو بہ یک جنبشِ نگاہ
کرتے ہیں نذر نقد دل و جان و تن تمام

سہیل مرحوم

افتخار اعظمی

شبلی آسمانِ علم و ادب کے آفتاب تھے۔ اس آفتاب کے گرد مختلف سیارے حلقہ زن ہوئے حمید الدین فراہی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، عبدالسلام ندوی اور اقبال احمد خاں سہیل ——— ان تمام فضلائے عصر نے شبلی ہی سے کسب فیض کیا۔ لیکن ان میں سہیل مرحوم کی ذات گرامی ایسی ہے جس پر شبلی کی شاعرانہ شخصیت کا سب سے زیادہ اثر ہے۔ شبلی کی لطافتِ خیال اور جولانیٔ طبع اگر کسی کے حصہ میں آئی تو وہ سہیل اور صرف سہیل ہیں سہیل کی یہ خوش نصیبی ہے کہ انھیں اپنے دور کے دو جلیل القدر عالموں سے استفادہ کا موقعہ ملا۔ حمید الدین فراہی اور علامہ شبلی دونوں علم و ادب کے اساطین تھے۔ سہیل مرحوم ان کی بزم شرف سے ہمیشہ منسلک رہے۔ عربی اور فارسی کا ذوق انھیں فضلائے عصر نے اُن کے اندر پیدا کیا۔ وہ فارسی اور اردو پر یکساں قدرت رکھتے تھے بعض ناقدین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ ان کی فارسی شاعری ان کی اردو شاعری سے کہیں زیادہ لطیف ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی اردو شاعری کے متنوع پہلو ہیں۔ اس میں رنگِ تصوف کے ساتھ ساتھ ہماری تحریکِ آزادی کی پوری داستان کمالِ لطافت کے ساتھ آگئی ہے۔ سہیل کی شخصیت میں رنگا رنگی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ان کے کردار کے تمام گوشوں کا احاطہ ممکن نہیں۔ میں نے مبسوط انداز میں "ذکر سہیل" میں ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ مقالہ عنقریب "اردو ادب" کے ذریعہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائیگا۔ میں یہاں صرف سہیل کے فن کے بارے میں اجمالاً اپنی رائے پیش کروں گا

جی تو یہی چاہتا ہے کہ تفصیل سے لکھوں، لیکن "علی گڑھ میگزین" کی تنگ دامانی تفصیل کے بجائے اجمال کی طالب ہے۔

سہیل مرحوم کا شعور بیسویں صدی کے آغاز میں بیدار ہوا۔ اس لیے اس دور کے حالات سے وہ اثر پذیر ہوئے بیسویں صدی کے اوائل میں حُبّ وطن، تمنائے آزادی اور ولولۂ حیات کے آثار پیدا ہوئے۔ نشاط ہستی کی طلب دلوں میں پیدا ہوئی زندگی کی جوئے رواں کا تموّج کچھ اور بڑھا۔ حالی کا اصلاحی اور اخلاقی رجحان کم ہوگیا اور سیاسی رجحان کا ظہور ہوا۔ وطنیت اور قومیت نے مستقل تحریک کی صورت اختیار کرلی صلح جوئی کا دور ختم ہوگیا۔ دو مختلف قوتیں میدانِ سیاست میں نبرد آزما ہوگئیں۔ سرفروشانِ وطن نے پہلی جنگ عظیم کے بعد آزادی کی لے کچھ اور تیز کردی۔ چین میں نئی زندگی کی شعاعیں پھوٹیں ترکی میں انقلاب نو نے آنکھیں کھولیں، اور روس میں آفتاب تازہ کی چمک سے فضائیں جگمگا اٹھیں۔ ان حالات نے ہندوستان کے کاروانِ انقلاب کو کچھ اور سبک گام بنا دیا۔ یہی دور ہے، جب جذباتی رومانیت نے ادب میں ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کی حبّ وطن کا تصوّر بھی اس کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ برٹش سامراج کے خلاف اظہارِ نفرت ایشیا کے گوشے گوشے میں کیا گیا۔ برطانیہ کی عیارانہ اور جابرانہ سیاست نے ہندوستان کو تاراج کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم سے لے کر ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۵ء تک ہندوستان میں ایک ہیجان و اضطراب بپا رہا۔ اعتدال پسندی کی رَو تھم گئی اور انتہا پسندی ظہور میں آگئی۔ انقلاب حکومت کی خواہش پوری قوت سے اُبھر پڑی۔ شاعروں اور ادیبوں کے ایک گروہ نے زمانے کی رفتارِ تغیر کا ساتھ دیا۔ اگرچہ ان کے ہاں حقائق کا احساس ملتا ہے، لیکن شدّتِ جذبات اور شورش و اضطراب سے کسی کا کلام خالی نہیں۔ درحقیقت عصری حالات کا اقتضا ہی یہ تھا، سیماب، جوش، ظفر علی خاں، روش، اور اقبال سہیل سبھی وطنیت کے شاعر ہیں۔ ان سب نے نئی زندگی کا استقبال کیا۔ اور ایک نئے نظام کے لیے راہیں ہموار کیں۔ جوش وغیرہ کے کلام میں جذباتیت ضرورت سے زائد ہے۔ روش کے ہاں شدتِ احساس تو ضرور ہے لیکن جذباتی ابال کم ہے۔ سہیل مرحوم بھی حسرت کی طرح داعیانِ حریت کی صف میں انتہا پسند تھے۔ لیکن ان کے کلام میں

ہیجان جذبات کم ہے، سنجیدگی جذبات زیادہ ہے سہیل کے انداز بیان اور طرزادا میں ایک ٹھہراؤ اور وقار ہے۔ ان کی شاعری فوجی بگل نہیں ہے۔ اور یہ کلاسیکل ذوقِ ادب کا فیضان ہے۔ ان کی فارسیت اور الفاظ و تراکیب کے بارے میں اُن کا حسنِ انتخاب ان کے کلام کو سنجیدگی اور متانت بخشنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ برٹش سامراج کے خلاف جب غصہ کا اظہار کرتے ہیں تو ان کے عتاب میں ایک سنجیدہ انداز جلال ہوتا ہے۔

سہیل، قوم وطنیت کے شاعروں میں سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے تحریک آزادی کے ہر گوشے کو بھرپور کیفیتِ تغزل کے ساتھ اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ سیاست کے پیچیدہ مسائل بھی ان کے دائرۂ تغزل میں آکر پیکر لطافت بن جاتے ہیں انھوں نے غزل گوئی کے آداب و علامات سے کہیں بھی سرمو انحراف نہیں کیا ہے۔ چونکہ انگریز دشمنی ان کے مزاج کا جزو بن چکی تھی۔ اس لیے جب وہ اپنی غزلوں میں برطانوی ملوکیت کے خلاف اظہار خیال کرتے ہیں تو ہمیں اجنبیت یا مغائرت نہیں محسوس ہوتی۔ انگریزوں سے نفرت سہیل کو اپنے آباو اجداد سے ملی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ان کا خاندان انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں شریک ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ جب سہیل برطانوی استبداد کے خلاف کچھ کہتے ہیں تو اس میں جذبہ کی حرارت اور احساس کی شدت ہوتی ہے۔ سہیل کی غزلوں کی سیاسی رمزیت اپنے اندر ایک جہانِ معانی رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے سہیل کا کوئی ہمسر نہیں۔ انھوں نے ہر سیاسی خیال کو رموز و علامات کی رنگین نقاب میں پیش کیا ہے۔ اپنی اس اشاریت کی بدولت سہیل کی غزلیں فنی حیثیت سے بہت بلند ہو گئی ہیں انھوں نے جہاد حریت کی داستان کے ہر پہلو کو حسنِ تغزل کے ذریعہ ایک لطیف حکایت بنا دیا ہے، انگریزوں کی عیارانہ سیاست کے مختلف گوشوں کی طرف انھوں نے جابجا اشارے کیے ہیں انگریز جب یہاں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان اگرچہ مختلف قوموں کا گہوارہ ہے۔ لیکن ان قوموں میں اختلافِ مذاہب کے باوجود اتحاد و توافق بھی ہے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک ہندوستان کے مختلف فرقوں میں یہ رشتۂ اتحاد باقی رہے گا برطانیہ کے ملوکانہ ارادے عمل میں نہ آسکیں گے اس لیے انگریزوں نے مختلف حیلوں سے ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا۔ سامراج کی یہ

وہ حکمت عملی بھی، جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں محبت کے بجائے نفرت اور خلوص کے بجائے بغض و حسد کا جذبہ پیدا کیا۔ چشمۂ صدق و صفا گدلا ہو گیا۔ ہندوستان کی فضا فرقہ داریت کے دھوئیں سے مسموم ہو گئی۔ سہیل مرحوم نے انگریزوں کی اس شرانگیز پالیسی پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

خدا سمجھے بتِ سحر آفریں سے — گریباں کو لڑایا آستیں سے
پہنچی یہاں بھی شیخ و برہمن کی کشمکش — اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا
صیاد مژدہ باد عناد ل میں چل گئی — اس کش مکش میں فکر کسے آشیاں کی ہے
اسی میں خیر ہے ساقی ئے رنگین پلائے جا — یہ کشمکش ہوش میں آئے تو سمجھو تہ نہ ہو جائے

سہیل جیتے جی متحدہ قومیت کی دعوت دیتے رہے۔ ان کے نزدیک اس اتحاد، اس یگانگت اور اس اخوت قومی کی اساس وہ مشترکہ تہذیب ہے جو ہندوستان کی مختلف قوموں کے میل جول سے صدیوں کے بعد ظہور میں آئی۔ ہندوستان اگرچہ مختلف تہذیبوں کا مرکز ہے پھر بھی اس رنگارنگی کے باوجود اس کے ہاں ایک تہذیبی وحدت بھی ہے۔ سہیل کی ایک مشہور غزل کا یہ شعر ہے۔ جو اسی تہذیبی وحدت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی اہمیت کو قبول کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

مل جل کے برنگِ شیر و شکر دونوں کے نکھرتے ہیں جوہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے

سہیل مرحوم کا فن حالات کی رفتار سے کبھی بے نیاز نہیں رہا۔ انھوں نے ہندوستان کی عوامی تحریکوں کا خیر مقدم کیا۔ وہ عمر بھر کانگریس سے ملحق رہے۔ برطانوی ملوکیت کے خلاف وہ اس لیے تھے کہ انھیں جمہوریت کے عادلانہ تصور پر یقین تھا۔ تحریکِ آزادی کے مختلف نشیب و فراز ان کی غزلوں میں آ گئے ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ترکِ موالات، لیگ اور کانگریس کی کشاکش، انگریزوں کی عیاری و بربریت اور جہدِ آزادی کی لگن غرضیکہ سیاسی کشاکش کے مختلف آثار ملتے ہیں۔

تاراجِ نشیمن ٹھیک سہی، صیاد مگر امتحان یہ ہے — جب عشق کی دنیا لٹتی ہے تب حسن کا ماتم ہوتا ہے

یہ آگ دہکتی ہے جتنی اتنا ہی دھواں کم ہوتا ہے　　احساسِ ستم بڑھ جاتا ہے، تو شورِ فغاں کم ہوتا ہے

ہم نشیمن کو بھی رو ئیں تو خطا ہوتی ہے　　پھونک ڈالیں وہ چمن بھی تو ہنر کرتے ہیں

تقسیمِ گل پہ بحث عنادل میں چھڑ گئی　　گلزار لُٹ رہا ہے کچھ اس کی خبر نہیں

کیوں بڑھایا آپ نے جامِ تہی میری طرف　　اور اس سے تیز میری تشنہ کامی ہو گئی

پوچھئے کیا ہو و یارِ دل کی جہاں پروری　　جو بلا باہر سے آئی وہ مقامی ہو گئی

اے گرفتارِ قفس وقت پر افشانی ہے　　پھر ملے شاخِ نشیمن تو غزل خواں ہو نا

سہیل مرحوم اگرچہ اصغر اور فانی کو اپنا ہمزباں سمجھتے ہیں، لیکن ان کی شاعری اپنے لب ولہجہ اور فکر وخیال کے اعتبار سے ان دونوں باکمال شاعروں کے کلام سے مختلف ہے۔ میرا خیال ہے کہ سہیل فانی اور اصغر سے اس لیے قریب ہیں کہ ان سب کا طرزِ ادا کلاسیکل شاعری کی روح کا آئینہ دار ہے جہاں تک فکر و تصور کا تعلق ہے، سہیل، اصغر، فانی، اور شاد عظیم آبادی سے کلیتاً مختلف ہیں سہیل، اصغر کو سماوی حسن کی فضائے رنگین میں اور فانی کو وادیٔ غم کی تیرگی میں چھوڑ کر رزمگاہِ حیات کا رخ کرتے ہیں۔ سہیل کا مزاج ان دونوں سے مختلف ہے۔ وہ ایک مردِ جری ہیں، انھیں تیر بارانِ حوادث کی پرواہ نہیں جہد وعمل اور وہ بھی ایک خاص مقصد کی خاطر ان کا دستورِ حیات رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ انھوں نے اصغر کی طرح ملکوتی یا لاہوتی دنیا کے حسن میں جانا پسند کیا، اور نہ فانی کی طرح ظلمت خانۂ غم میں رہنے کو صحیح سمجھا۔ وہ زندگی سے قریب آئے۔ عصری میلانات کو انھوں نے سمجھا، زندگی کے نئے تقاضوں کا خیر مقدم کیا۔ اپنے دور کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا، دیکھا کہ ملک برطانوی استبداد کی چکی میں پسا جا رہا ہے، معاشی استحصال کی وجہ سے ہندوستان کنگال ہو گیا ہے، آزادی جو انسان کا فطری حق ہے، وہ پورے طور سے چھن گئی ہے، غلامی کی وجہ سے جذبات میں وہ رفعت اور احساسات میں وہ عظمت نہیں رہی جو پہلے کبھی تھی۔ ملوکیت کے منحوس سائے نے ہندوستان کو سیہ خانۂ غم بنا رکھا ہے۔ جمہوریت کے فیضانِ تجلی سے کشورِ ہند محروم ہے۔ یہ غم انگیز حالات تھے، جنھوں نے انھیں کشاکشِ حیات میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ انھوں نے اصغر اور فانی کی طرح راہِ فرار نہیں اختیار کی

وہ عزم وہمت اور یقین وعمل کا چراغ لے کر تحریکِ آزادی کے ساتھ ہوگئے۔ اور انھوں نے اہلِ وطن کو یہ دعوت دی ۔

اس طرف آئیں کہاں ہیں طالبانِ زندگی — ہے دمِ شمشیر، خضرِ آستانِ زندگی
راحتِ کنجِ قفس سے زندگی کو کام کیا — بجلیوں سے کھیلتا ہے آشیانِ زندگی
ایک ٹھوکر مار دیتا ہے جہاں پائے طلب — خود ابلتا ہے وہاں سیلِ روانِ زندگی
رو پڑے راہِ طلب میں جس جگہ دو آبلے — لہلہا اٹھا وہیں اک گلستانِ زندگی
سعئ آزادی میں پیشانی سے ٹپکے جو عرق — اس کا ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانِ زندگی
کربلائے عشق سے آتی ہے اب تک یہ صدا — رفعتِ نوکِ سناں ہے نردبانِ زندگی

پہلے پیدا تو کر آتش کدۂ شوقِ خلیل — آج بھی سہل ہے شعلوں کا گلستاں ہونا
اے گرفتارِ قفس وقتِ پر افشانی ہے — پھر ملے شاخِ نشیمن تو غزل خواں ہونا

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا — ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا
شبِ غم اب منائے خیر اپنے جیب و داماں کی — رہے دستِ جنوں باقی تو کر لیں گے سحر پیدا

حرم والوں میں شایانِ کرم شاید نہیں کوئی — کہ برقِ امتحاں لرزاں ہے بیتابانہ برسوں سے

قفس میں دیتے ہو کیا طعنِ سستِ پروازی — فضا کھلی ہوئی ملتی تو امتحاں ہوتا

سہیل مرحوم جیتے جی ہندوستان کے اقبال کے خواہشمند رہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں نشاطِ ہستی کی تمنا، صحیح جمہوریت کے قیام کی خواہش، عدل و انصاف اور قومی اتحاد کی آرزو پورے طور سے پائی جاتی ہے۔ وہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے ہمیشہ مخالف رہے۔ زمینداروں کے مقابلہ میں کسانوں کی انھوں نے حمایت کی۔ ان کی نظم "زمیندار اور کسان" ملکیت ارض کے مسئلے پر ان کے عادلانہ تصور کی آئینہ دار ہے۔ غلامی پر آزادی کو، تنزل پر ترقی کو، ملوکیت پر جمہوریت کو، فرقہ داریت پر متحدہ قومیت کو اور سرمایہ داری پر مساویانہ تقسیمِ دولت کو انھوں نے ہمیشہ ترجیح دی۔ اگرچہ ان کے یہاں کوئی منضبط تصورِ حیات نہیں ہے، پھر بھی اعلیٰ اقدارِ انسانی کا بھرپور احساس

ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری، زندگی اور اس کے متعلقات سے بے نیاز نہیں ہے سماجی فلاح و بہبود کا جذبہ ان کی تخلیقات میں متحرک نظر آتا ہے۔ فانی، اصغر اور شاد عظیم آبادی وغیرہ کے کلام میں تنقید حیات بہت کم ہے لیکن سہیل کے یہاں یہ بات پورے طور سے نہیں ملتی ہے۔ وہ ایک دور تک تو ضرور اصغر کی طرح رنگِ تصوف کے دلدادہ رہے۔ لیکن ۳۰ء کے بعد وہ صوفیت کی بھول بھلیاں سے نکل آئے۔ اس دور تک کے کلام کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو وہ اصغر سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ اصغر میں اور ان میں دوستانہ روابط تھے۔ اس لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ ان دونوں نے ایک دوسرے سے اثر لیا ہو۔ ذیل میں کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں، جو رنگ تصوف کے ساتھ ساتھ پاکیزگی حسن لطافتِ ادا اور علوئے فطرت کا مظہر ہیں۔

اٹھی تھی بحرِ حسن سے اک موج بیقرار — فطرت نے اس کو پیکر انساں بنا دیا
اف کیا مزہ بلا ستم روزگار میں — کیا تم چھپے تھے پردۂ لیل و نہار میں
لاکھ گناہ گار ہوں، حسن کا راز دار ہوں — عکس کمال یار ہوں آئینہ قصور میں
جھلک ہے حسن یار کی مرے سرشک شوق میں — کہ شبنمی نقاب میں کرن ہے آفتاب کی
چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے — بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے
خزاں کے دم سے ہے رنگینیٔ جمال بہار — شباب کیا کوئی غم تھا کہ جاوداں ہوتا
اگر چلنا تو نقشِ پا بھی لغزش سے مٹا دینا — نہیں زیبا کسی کو کوئے جاناں کا پتہ دینا
تاثیر نرالی ہے میرے بھی فسانے کی — سوتی ہے مری قسمت بیدار زمانہ ہے

سہیل مرحوم کا یہ رنگ سخن اپنی لطافتوں کے اعتبار سے حسن و دلکشی کا ایک مرقع ہے، لیکن میرے خیال میں اُن کی غزلوں کا وہ حصہ زیادہ جاندار ہے جس میں عصری میلانات، رعنائی سخن کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ انھوں نے خارجی حقائق کو داخلی رنگ دیا ہے۔ اور پھر حسن تغزل کے ذریعے انھیں لطیف پیکر میں ڈھالا ہے۔ سہیل مرحوم کے کلام میں صرف جہد آزادی کے نقوش ہی نہیں ملتے، بلکہ حصول آزادی کے بعد جو حالات رونما ہوئے، ان کا عکس بھی ملتا ہے۔ ہندوستان میں "صبح نو" طلوع ہوئی

وطن کے گوشے میں مسرت کی لہر دوڑی، خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور بزم عشرت سجائی گئی، لیکن یہ خوشی عارضی تھی، فرقہ واریت کے غبار نے فضا کو مکدر بنا دیا۔ وہ کدورت جو ہندوستان کے مختلف فرقوں کے دلوں میں تھی، پہلے کی طرح باقی رہی۔ سہیل اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

بہا ڈالے ہزاروں خانماں سیل حوادث نے
دلوں میں تہ نشیں ہے پھر بھی صدیوں کا غبار اب تک

آزادی کے معنی درحقیقت مادی آسودگی کے ہیں۔ "آفتاب تازہ" کے ظہور میں آنے کے بعد بھی مطلع صاف نہ ہوا غربت باقی رہی، سرمایہ داری کا منحوس سایہ مزدوروں کا پیچھا کرتا رہا۔ بد اخلاقی بڑھتی رہی ارباب حکومت فرقہ واریت کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ اکثریت کی یہ کوشش جاری رہی کہ اقلیت کے حقوق چھین لے، اردو جو مشترکہ تہذیب کی امانت دار ہے اس کے گلے پر چھری چلانے کی تدبیریں کی گئیں۔ باہر سے جو بجلیاں آئی تھیں۔ وہ تو رخصت ہو گئیں لیکن برق چمن زاد کی تباہ کاری جاری رہی سہیل مرحوم نے اپنی بعض غزلوں میں ان تباہ کن حالات و تاثرات کا عکس بھی اتارا ہے۔

مجھ سے پوچھو نہ مزاج دل ناشاد ابھی | میرے نغموں میں ہے کچھ تلخی فریاد ابھی
بجلیاں آئیں جو باہر سے وہ رخصت بھی ہوئیں | شعلہ افگن ہے مگر برق چمن زاد ابھی
نخوت حسن کے ماتھے پہ شکن دوڑ گئی | عشق نے وا نہ کئے تھے لب فریاد ابھی
فکر تعمیر نشیمن ہو یہاں کس کو سہیل | ہوش گم کردہ ہیں مرغان نوآزاد ابھی

آئی شب غم کے بعد سحر، غمناک رہا پھر بھی منظر | وہ غنچہ و گل کا ہنس ہنس کر شبنم کو رلانا کیا کہئے
پیچھے ہیں قدم، آگے ہے نظر جاتا ہے کدھر جاتے ہیں کدھر | مبہم ہے یہاں خود سمت سفر رفتار زمانہ کیا کہئے
کیوں بزم طرب کے صدر نشیں پامیں کے بھی ہیں اہل یقیں | کل وادی غم میں ہم دونوں تھے شانہ بشانہ کیا کہئے
ہماری پستی فطرت نہ تھی یوں آشکار اب تک | کہ تھی دیوار زنداں راز دل کی پردہ دار اب تک
صبا کا رقص ابھی تا ساقی ہے آہنگ عشرت سے | گلوں کے لب پہ ہے موج تبسم مستعار اب تک

چھلک جائے اگر ساغر تو کیا الزام ساقی پر، خود اپنے ہاتھ رعب حسن سے ہیں رعشہ دار ابتک

ان مایوس کن حالات کے باوجود بھی سہیل رجائیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ انقلاب روزگار کے اداشناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ تغیر راز فطرت ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں۔

سہیل اس بجلی بھری چھاؤں سے دل گیر کیا ہوتا

یہ دنیا کروٹیں لیتی رہی ہے بار بار اب تک

سہیل کی غزلوں کا خاصہ وحدت تاثر ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے یہاں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے یہاں مخصوص تجربات ہیں، لیکن انھیں متنوع اسالیب میں وہ بیان کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یکسانیت کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسلوب کے تنوع کی وجہ سے خصوص میں عموم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ سہیل کی سیاسی اشاریت کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس میں حالی، چکبست اور حسرت وغیرہ سے آگے نکل جاتے ہیں۔ چونکہ ان کا فارسی کا ذوق بہت نکھرا ہوا ہے اس لیے حسن ادا کے اعتبار سے ان کی غزلوں میں بھرپور شاعرانہ کیف پایا جاتا ہے، رنگیں ادائی اور شگفتی بیان، ان کے کلام کا خاصہ ہے۔

سہیل مرحوم کی شاعری میں قصائد کو بھی ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ قصیدہ گوئی نہایت مفید صنف سخن ہے۔ اگر صحیح اور سچی مدح کی جائے تو قصیدہ یقیناً بہت جاندار ہوگا۔ اس صنف سخن کے ذریعہ قوم کے کارناموں کو روشن کیا جاسکتا ہے۔ عربی شاعری میں قصیدہ کے ذریعہ انقلاب فطرت کا کام لیا گیا۔ دلوں میں بلند جذبات پیدا کئے گئے اور حیات انسانی کو نشاط کار سے آشنا کیا گیا اگر قصیدہ گو صداقت اور واقعیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے تو قصیدہ کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے در اصل اس صنف سخن کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ لوگوں کے اندر اعلیٰ انسانی قدروں کا احساس پیدا کیا جائے۔ قصیدہ میں ایسے کردار پیش کیے جائیں، جن میں عظمت انسانی کے تمام پہلو پائے جاتے ہوں۔ سہیل مرحوم نے اپنے قصائد میں ایسے اشخاص کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے ملک وملت کو رفعت وعظمت کی راہوں سے آشنا کیا۔ ان کے نعتیہ قصائد کی اردو شاعری میں بڑی اہمیت ہے

ان میں جذبۂ احترام اور جوشِ عقیدت کے ساتھ ساتھ فنکارانہ حسن بھی اپنے شباب پر ہے۔ جناب رسالتمآبؐ سے اظہارِ محبت کے ساتھ ساتھ سہیل نے جابجا اعلیٰ انسانی اور اسلامی قدروں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے یہ نعتیں صرف عقیدت کا پرتو نہیں ہیں بلکہ ان میں اسلام کے مشن کے مختلف پہلو بھی ہمیں ملتے ہیں۔ نعت نہایت مشکل فن ہے۔ احتیاط و اعتدال کا احساس ہر قدم پر نعت گو کو ہونا چاہیے افراط و تفریط سے اس راہ میں بچنا نہایت ضروری ہے۔ سہیل مرحوم نے نعتیہ قصائد میں تمام آداب کا التزام رکھا ہے انھوں نے اپنے خامۂ رنگین نگار سے اس فن کو نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ وہ اپنے نعتیہ قصائد میں حالی، اقبال، امیر مینائی اور محسن کاکوروی سبھی سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں بوصیری کا جوشِ عقیدت ہے، خاقانی کی رفعتِ تخیل ہے، عرفی کے استعارات کی ندرت ہے فیضی کی نزاکتِ خیال ہے اور قاآنی کے کلام کی روانی ہے۔ ان کے قصائد میں تغزل کی بھرپور لطافتیں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ حسنِ تشبیب، ندرتِ فکر، رفعتِ خیال، نزاکتِ ادا اور منظرکشی کے اعتبار سے سہیل کے نعتیہ قصائد اردو ادب کا وہ مقدس سرمایۂ سخن ہیں جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا واقعہ نگاری کے اعتبار سے وہ قاآنی کے ہمسر ہیں۔ ایک نعتیہ قصیدہ کا حسنِ تشبیب ملاحظہ ہو۔

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیِ امکانی — رفو ہوتا نہیں ہے صبح کا چاکِ گریبانی
وہی سمجھیں گے جو واقف ہیں اسرارِ محبت سے — کہ یکساں جانگسل ہے ذوقِ وصل و دردِ ہجرانی
ادھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمتِ مشرق سے — ادھر بزمِ جہاں سے رخصتِ شمعِ شبستانی
بجا ہے صبحدم، گر چشمِ نرگس ہے خمار آگیں — چمن میں رات بھر کی ہے زرِ گل کی نگہبانی
رگِ گل نے بچھا رکھا ہے ہر سو دامِ نظارہ — عبث ہے گر کرے مرغِ نگہ سعیِ پر افشانی
نہ جانے حسن ہے یا عشق انجانے ہیں ہم — ہمیں کھینچے لیے جاتا ہے کوئی جذبِ پنہانی

سہیل مرحوم نے اپنے جادو نگار قلم سے بہت سی شخصیتوں کے کارہائے عظمت کو ابھارا ہے مسز سروجنی نائیڈو، گاندھی جی، جواہر لال، محمد علی، حسین احمد مدنی وغیرہ کا ذکر انھوں نے جوشِ عقیدت سے کیا ہے، لیکن ان کی نظموں میں محمد علی مرحوم کا مرثیہ اور مسز سروجنی نائیڈو پر مدحیہ نظم رنگینیِ سخن، نفاستِ خیال

اور شدتِ اثر کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔ نظم کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

به شب چو مهرِ خاوری بروی خود نقاب زد — زمانه تاجِ سروری، به فرقِ ماهتاب زد
یکی خرد به سنگ زد، رحیقِ لاله رنگ زد — یکی به چنگ، چنگ زد یکی دم از رباب زد
یکی چو لاله جام زد یکی چو سرو گام زد — طرب صلای عام زد که فتنه سر بخواب زد
یکی چو سروِ بوستان، به صحنِ باغ شد چمان — یکی به یادِ دوستان پیاله شراب زد
کنون به چشمِ روشنی چو جلوه زد سروِ چمن — فلک به سطحِ سوسنی بساطِ ماهتاب زد
تبسمش تکلمی تکلمش ترنمی — سزد اگر تلاطمی به جانِ شیخ و شاب زد
شکستِ رنگِ ساحری چو زد نوای شاعری — که ده سحرِ سامری اگر در خطاب زد

یہ نظم سلاستِ بیان، طرفگیٔ ادا، اور مضمون سے ہم آہنگ موسیقی کے اعتبار سے حسن و دل کشی کا مظہر ہے۔ قاآنی کے کلام کی مابہ الامتیاز خصوصیت اس کا (RHYTHMICAL ORDER) ہے ان کے قصائد میں اور خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ صفت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے

حفیظ صدیقی

غزل

جاتے ہی ان کے بزم سے رونقِ بزم بھی گئی
چاند جدھر گیا اُدھر چاند کی چاندنی گئی

ہو کے اسیر مو بہ مو دل کی قلندری گئی
زلفِ درازِ یار کی پھر بھی نہ برہمی گئی

محوِ خرامِ ناز پھر، مشقِ خرامِ ناز ہو
مل گیا لطفِ زندگی، مانا کہ زندگی گئی

وقتِ نظارۂ جمال جلوۂ حسن کی شراب
رند ہر ایک پی گیا جتنی بھی جس سے پی گئی

جنبشِ چشمِ یار ہے سجدوں کا کیا شمار ہے
حسن کے اک اشارے پر عشق کی خودسری گئی

کٹ گئی شامِ انتظار ہو گئی صبحِ ہجرِ یار
چشمِ ستارہ ساز اب بات وہ رات کی گئی

حسرتِ دید یار پر حشر کلیم سُن لیا
دل میں یہی تھی آرزو وہ بھی رہی سہی گئی

چاہیئے اتنی دلدہی، پھر بھی حفیظؔ بعد مرگ
کہہ دے کوئی کہ عشق میں جان اگر گئی گئی

انشائے لطیف اور قاضی عبدالغفار

غلام نبی (کاشمیری)

شوپنہار کا خیال تھا کہ "اگر دنیا میں حسن و عشق، فنون لطیفہ اور مذہب کا وجود نہ ہوتا تو ہمارے پاس کوئی ایسا دارو نہ تھا جس سے زندگی کی الناکیاں اور زمانے کی تلخیاں گھٹائی جا سکتیں۔" یہ حقیقت ہے کہ زندگی ایک کارزار ہے جس میں کل مخلوق سرگرمی کے ساتھ شریک ہیں۔ اور پھر اس تمام کارزار کا نتیجہ وہی ناکامی اور کفِ افسوس ملنا، بعض دفعہ یہ احساس ہم پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ ہم سراسیمہ ہوکر چلا اٹھتے ہیں ؎

آنکھیں جدھر اٹھائیے اک حشر زار ہے
لے آئی کس دیار میں عمرِ رواں مجھے

لیکن اس مصیبت سے اور اس جد و جہد کی قیامت سے نجات بھی پا سکتے ہیں اور اس کی صحت یا تو دھیان اور گیان ہے، یا شاعرانہ محویت اور جمال پرستی۔ شاعرانہ محویت ہم کو دنیا کے افکار و آلام سے چھٹکارا دلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ فنون لطیفہ ہم کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ ہم رنج و خوشی سے ایک دم بے نیاز ہو جائیں جس وقت ہم خلوص کے ساتھ کیٹس (KEATS) ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) شیلے (SHELLEY) حافظ وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو کیا اس وقت ہماری الناکیوں کی نوعیت بدل نہیں جاتی۔ فنون لطیفہ کا کام زندگی کی اصلیت کو نہیں تو کم از کم اس کی ہیئت کو بدل دینا ہے، ورنہ میر جیسے دردمند شاعر اور ہارڈی (HARDY) جیسے یاس انگیز افسانہ نویس کو پڑھنے کے بعد شاید ہی کوئی زندہ رہنے کی تاب لا سکتا۔

دنیا کی ادبیات میں ہمیں نثر و منظوم دونوں طرح کے کارنامے ملتے ہیں۔ شاعری میں تو اس شاعرانہ محویت و جمال پرستی کے نقوش شروع ہی سے ملتے ہیں، مگر رفتہ رفتہ جمال پرستی کی جھلکیاں نثری کارناموں پر بھی ملنے لگیں۔

مضمون نگاری میں دو نمایاں پہلو ملتے ہیں - جلال اور جمال - بعض لوگ جلال (SUBLIMITY) کی طرف مائل ہوتے ہیں اور بعض جمال کی طرف ——— جس میں لطافت بیان اور نزاکت خیال ہوتی ہے - جلال میں فکر کی بلندی اور جمال میں حُسن کا احساس پوری طرح ملتا ہے - جمال میں نفست خیال کے بجائے لطافت، بلند فکری کے بجائے شادابی ملتی ہے - اقبال کے اسٹائل میں ہمیں جلال کا پہلو ملتا ہے۔ وہ جلال میں ہمیشہ جمال پیش کرتے ہیں - آگے چل کر یہی جمالیاتی احساس یا احساس حُسن، اپنی رنگین لطافت، شوخی یا زندہ دلی کے ساتھ ادب لطیف کے رُوپ میں ہمارے اُردو ادب کی سرزمین پر ظاہر ہوتا ہے -

ادب لطیف سے ہمارا مفہوم وہ روحانیت ہے، جو کلاسکی رنگ سے بالکل جدا ہے کلاسکی سے تو یہ مطلب ہے کہ وہ پُرانے بنے بنائے سانچوں کے مطابق ہو - رومانیت میں کسی خاص سانچے کی مطابقت نہیں کی جا سکتی - بلکہ اس اسلوب میں ایک جدت ہوتی ہے - اس میں ماضی کے روایتی قواعد وضوابط کے خلاف بغاوت پائی جاتی ہے - لیکن ماضی کے ساتھ ایک دل بستگی اور محبت کی فراوانی بھی پائی جاتی ہے - رومانوی ادیب ماضی سے محبت رکھتا ہے اگرچہ اس کے اصولوں کے تحت کام نہیں کرتا - اس کی محبت اس کے دل میں گھٹتی نہیں - رومانیت میں جذباتی کیفیات عقلی کیفیات سے زیادہ اُجاگر پائے جاتے ہیں - رومانیت میں ہمیں احساس جمال ملتا ہے - جس کا مطلب دل نشین انداز بیان کے ساتھ کسی چیز کو بیان کرنا ہے۔ اس میں الفاظ میں رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے گویا ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں - رومانیت میں ایک خاص قسم کی رنگینی ملتی ہے جو عام طور پر لوگ سمجھتے بھی ہیں - رومانیت کا مفہوم محبت اور اس کے متعلقات سے ہے۔

کلاسکی ادب اُس زمانے کی پیداوار ہوتا ہے جب قدروں اور زندگی میں ایک نوع کا ٹھہراؤ اور استقلال موجود ہو، جب انسانی نظام فکر اچانک تبدیلی اور شکست و ریخت کا مظہر نہ ہو، جب ذہن انسانی اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی کی قدروں کو نظر جما کر دیکھ سکے - یہی وجہ ہے کہ کلاسکی ادب میں توازن، ہم آہنگی، سلامت روی اور اظہار بیان کی صحت خاص اہمیت رکھتی ہے - مشہور انگریزی نقاد ٹی - ایس - ایلیٹ (T.S.ELIOT) نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کلاسکی ادب اُس زمانے میں ظہور پذیر ہوتا ہے، جب کہ تہذیب، اطوار و زبان میں پختگی آچکی ہو اس کے برعکس رومانی ادب اُس زمانے میں نمودار ہوتا ہے - جب

اداسے ، قدریں اور خود زندگی کا تانا بانا باہم انقلاب اور انتشار سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی ثبات نہیں پایا جاتا۔ ایسے ادب میں لازمی طور پر غیر یقینی ، اضطراب ، حسنِ سامانی اور اظہار بیان میں تجرباتی انداز اور ڈھیلا پن موجود ہوتا ہے۔ اس میں تیقن کی بجائے تحیر ، اشاریت اور ایک خواب آلودہ کیفیت کا پایا جانا ضروری ہے۔" یوں تو رومانی ادب ان تمام خیالات ، تصورات ، رسومات اور اداروں کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے جو شخصیت کی آزاد نشوونما میں رکاوٹ پیدا کریں۔ اسلوب احمد انصاری کے الفاظ میں رومانی اور کلاسکی ادب کا فرق یوں ظاہر ہوتا ہے کہ "کلاسکی ادب عقل اور تسلیم شدہ نظریوں سے سروکار رکھتا ہے۔ اور رومانی ادب میں تمام تر زور احساس ، وجدان اور جذبہ پر ہوتا ہے۔"

اردو کے رومانوی نثر نگاروں میں عورت اور حواسی لذتوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ تلاشِ حسن ، مسرت کی جستجو ، احساس کی ندرت اور رنگینی رومانی فن کاروں کے خاص موضوعات رہے ہیں۔ کیٹس کا یہ قول کہ "حسن صداقت ہے اور صداقت حسن" اس کا مصداق ہے۔ عورت کی شخصیت اور اس کی پُراسرار کیفیات کی ترجمانی سے رومانی ادیبوں کی تصانیف بھری پڑی ہیں ورڈس ورتھ نے کہا ہے کہ حواس انسانی بھی علم اور ادراک کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔ ایک انگریزی ادیب نے پھول کی ساخت اور عورت کے جسم کو زندگی کے نہایت حیرت زا اسرار میں شمار کیا ہے۔ سجاد حیدر کے یہاں " اگر عورت نہ ہوتی تو آرٹ بے رنگ ، شاعری بے کیف اور ادب پھیکا ہوتا۔" سجاد حیدر کے نزدیک عورت "زندگی کی بڑی کمی پوری کرنے والی" چیز بھی ہے۔ اور "لازمۂ عمر" بھی اُن کے خیال میں عورت کا دل محبت کے لئے "آئینہ حرم" ہے۔ شوپنہار کے نزدیک زندگی کی المناکیاں اور تلخیاں ، حسن و عشق ، فنونِ لطیفہ اور مذہب کی وجہ سے کم ہوجاتی ہیں۔ لیکن سجاد حیدر کے نزدیک بغیر عورت کے کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔

مہدی کے یہاں بھی متعلقات حسن اور معاملات حسن و عشق کا بیان کافی ہے۔ وہ اپنے اس جمالیاتی احساس کو نہ صرف اپنے مضامین میں بلکہ بہت ہی بے تکلف ہوکر اپنے خطوط میں بھی لکھ جاتے ہیں۔

> "عورت جب منہ پھیر کے اُٹھنے کے لئے چل کھڑی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوڑ کر دامن پکڑ لے۔"

مہدی اکثر علمی سنجیدہ مضامین و مباحث میں بھی کسی نہ کسی طرح اس معاملات حسن وعشق کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً شبلی کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو "اپنی اُردو خاصہ" کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھ ملا سکتی ہے"۔

مہدی افادی کے مضامین "تلاش حسن اور رموز محبت کے آئینہ دار ہیں" وہ حسن نسوانی کے مشاہدہ سے عشق کی نفسیات تک پہنچتے ہیں۔ اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ اُن کے یہاں عریاں نگاری یا ہوس پرستی سے کوئی علاقہ نہیں۔ دراصل مہدی افادی حسن مطلق کے شیدائی ہیں۔ چونکہ اُن کو اس حسن مطلق کا مظہر عورت پورے طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے فکر اور احساس کو اس کی لطافتوں پر مرکوز کر دیا ہے۔ اُن کے یہاں حسن جہاں کہیں ہو، لائق پرستش ہے۔ اور عورت کا حسن اُن کے نزدیک سب سے لطیف ترین جذبات و احساسات کو متحرک کرنے والا ہوتا ہے۔

"میں اُدھار پر نقد کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور ڈنکے کی چوٹ پر خیام کا ہم خیال ہوں۔ جھونپڑوں میں محلوں کا خواب دیکھنا نہیں چاہتا، کسی سبزہ زار یا بہتے ہوئے چشمہ کے کنارے عذرا کی مخمور آنکھیں اور ایک جام شراب میری اصلی غائت زندگی ہے جس کے سوا دنیا سے کچھ نہیں چاہتا"۔

غرض مہدی افادی عورت کو صرف عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے جلوؤں پر کوئی نقاب ڈالنا نہیں چاہتے۔ اس طرح کا احساس جمال اور اس کے اظہار میں صفائی لطافت اور بے باکی اُردو نثر میں پہلی چیز ہے۔ نیاز کے برخلاف مہدی عورت کو محض عبادت کے لئے نہیں سمجھتے بلکہ بڑی حد تک اسے سماجی زندگی سے متعلق کر کے دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی اُن کا تصور حسن پرستانہ ہے اور نفاست و لطافت کی تصویریں اُن کے ہاں عورت کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں۔ لیکن یلدرم اور نیاز دونوں سے زیادہ اُن کے ہاں عورت کا زندہ اور حقیقی تصور ملتا ہے۔

"صحت میں رفیقۂ زندگی، علالت میں خوش سلیقہ دایا اور موت کے بعد ہماری خوبصورت

سوگوار ہے .... پھنسی ہوئی سیاہ چوڑیاں اور کھلے ہوئے سیاہ لمبے بال وہ علاماتِ ماتم ہیں جنھیں جیتے جی دیکھنے کو جی چاہتا ہے "۔

کسی نقاد نے لکھا ہے کہ " سدرشن، پریم چند اور خواجہ حسن نظامیؒ مصورِ فطرت ہیں لیکن سجاد حیدر اور نیاز نقاشِ فطرت "۔ نیاز کے ادبی شہ پاروں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُن میں عورت اور اس کے متعلقات کا ذکر غالب ہے ۔ اور اس کا جو جواب اُنھوں نے دیا ہے وہ ہمارے لئے قابلِ قدر چیز ہے ۔ لکھتے ہیں " جس وقت سے میں نے لکھنا شروع کیا ہے ۔ (بلا لحاظ اس کے کہ زمانہ کیا چاہتا ہے) میں نے ہمیشہ اپنی حیاتِ قلبی کی پابندی کی ہے اور نظم ہو یا نثر انھیں خیالات کے اظہار کو اپنا محبوب شغلۂ خلوت قرار دے رکھا ہے ۔ جانتا ہوں کہ میرے بہت سے احباب نے پسند کیا، بعض نے عریاں، فاحش کہہ کر شرم دلائی، بعض نے خلافِ متانت و تہذیب کے الفاظ سے میرے عزائم کو متزلزل کرنا چاہا ۔ لیکن آپ باور کیجئے کہ میں نے کبھی ان باتوں کو سمجھنا بھی نہیں چاہا، کیونکہ میرا مقصود اس سے داد لینا یا دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں ہے "۔

نیاز کے یہاں تخیلی عناصر ملتے ہیں ۔ جس سے ہمارا جمالیاتی احساس ابھر جاتا ہے ۔ ان کے یہاں یہی چیز زیادہ بہ نسبت مضمون نگاری کے پائی جاتی ہے ۔ نیاز کے نزدیک وہ عورت نہیں ہے جو پریم چند کے ہاں ۔ اُس کے یہاں اُس کا روزمرّہ زندگی کا معمول رونا ، پیٹنا ، رفیقۂ حیات کا تصور نہیں ملتا ۔ بلکہ وہ عورت کو فائز سمجھتے ہیں ۔ عورت اُن کے یہاں ایک ذریعہ ہے احساسات کو اُبھارنے کے لئے ———— جمالیاتی احساس میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔ اس کے یہاں عورت سراپا ایک حسین پیکر ہے ۔ عورت کو ماورائی حسن کا مجسمہ سمجھتے ہیں ۔ مہدی افادی لذت کے قائل ہیں لیکن نیاز ایسے نہیں ۔ وہ حسن کو دنیاوی لذت سے لطف اندوز ہونے کی خاطر نہیں چھیڑتا تھا بلکہ ایک پجاری کی حیثیت سے ہماری نظروں میں سامنے آجاتے ہیں ۔ وہ حسن سے ظاہری دلچسپی پیدا کرنا نہیں چاہتے بلکہ اسے ایک پاک حقیقت سمجھ کر پوری عقیدت خلوص کے ساتھ شیدائی ہیں ۔

سجاد انصاری نے تلاشِ حسن میں اپنی شخصیت و انفرادیت کو قائم رکھا ہے ۔ اُن کی آواز ایک نئی آواز اور تنہا آواز ہے ۔ وہ عورت کی رنگینی و لطافت کے قائل ہیں ۔ مگر اس کی ریاکاریوں سے بھی خوب واقف ہیں ۔ بقول اسلوب احمد انصاری " سجاد انصاری کے اعصاب پر بھی اقبال کے الفاظ میں

عورت سوار ہے، عورت اور حسن و عشق کی ماہیت نفسی پر انھوں نے جگہ جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ بعض امور کے سلسلے میں اُن کا مطالعہ بہت فکر انگیز ہے"۔ مہدی افادی کے یہاں تکمیل حسن سب کچھ ہے۔ سجاد انصاری حسن کے تمام پس و پیش کی توجیہ کرتے ہیں۔ وہ محبت کے جذبے کو تخلیقی سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں عورت ارتقائے انسانی کی آخری منزل ہے۔ اُن کے یہاں عورت کا تصور انبساط شباب کا ایک مجسمہ ہے جس کی ہر کشش اپنے دامن میں کائنات کے لئے ہزاروں برکتیں رکھتی ہے۔ اُن کے نزدیک عفت و عصمت کا مفہوم تو یہی ہے کہ عورت ہمیشہ اپنی نسوانیت اور اپنے شباب کی نیرنگیوں کو ملحوظ رکھے۔ انھوں نے نفسیاتی اعتبار سے عورت کی توجیہ یوں کی ہے —

"عورت کا حجاب حقیقی حجاب نہیں ہوتا۔ وہ محض ایک طلسم ہے جسے یوسفیت کا ایک انداز توڑ سکتا ہے۔ عموماً لوگ خود اپنی چاک دامانی پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس لئے عورت مطمئن ہو کر تغافل شعار بن جاتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا محبوب خود ہی دامن چاک کر دے گا، لیکن جب اُس کے سامنے کوئی یوسف آجاتا ہے اُس کا اطمینان اور اُس کا استغنا، غائب ہو جاتا ہے اس کے ساتھ اس کا حجاب و اجتناب بھی، وہ حقیقی معنوں میں عورت ہو جاتی ہے"۔

اُن کے نزدیک

"عورت کا صحیح اتقا، اور اُس کی حقیقی عفت یہ ہے کہ اس کا دل حسن کی ہر کشش کا تابع اور شباب کے ہر کرشمہ کا مطیع ہو جائے۔ البتہ اظہار محبت میں اس قدر محتاط رہے کہ اس کی نسوانیت رائگاں نہ ہو، جذبات میں وہ تلاطم نہ ہو کہ حسن شباب کا احساس ہی فنا ہو جائے"۔

سجاد انصاری تفکر و ادراک سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ اُن کے فکری اصولوں میں جمود نہیں۔ لکھتے ہیں۔

"محبت محض ایک افسون شباب ہے۔ اور عورت محض ایک فریب حیات۔ یہ دونوں طلسم زندگی کو غیر دلچسپ واقعیت سے محفوظ کر دیتے ہیں اور یہی ان کی اصلی خوبی ہے۔ ورنہ محبت بھی دھوکا ہے اور عورت بھی"۔

ادب لطیف میں قاضی عبدالغفار کا نام سب سے بعد میں آتا ہے۔ انھوں نے دو انوکھی طرز تحریر ایک نئے حسن سے آشنا کیا۔ وہ ادب میں مختلف رنگین پیکروں کے خالق ہیں۔ اگر ایک طرف "نقش فرنگ" کی تخلیق کی ہے تو دوسری طرف "لیلیٰ کے خطوط" میں صنف نازک پر ہماری معاشرت سے جو عذاب ڈھائے ہیں ان کو نہایت دردناک پیرائے میں پیش کیا ہے۔ حیوان نما انسان ہوس پرستی کی آگ بجھانے کے لئے اس کے پاس آتے ہیں مہدی الافادی اور سجاد انصاری کی طرح ان کا موضوع بھی عورت ہی ہے۔ مگر ان کے نزدیک عورت محض لذت نفس یا جمالیاتی احساس کو ابھارنے کے لئے نہیں بلکہ ایک نوادیت کی مالک ہے جس کو برقرار رکھنے کے لئے وہ مرد کی خود غرضی کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔ قاضی عبدالغفار کا مقصد عورت کے حسن اور اس کی لطافت و رعنائیوں کو اجاگر کرنا نہیں اس کے تن بسمل کو بے نقاب کرنا ہے۔ اس کی اس نسوانیت کی عکاسی کرنا ہے جسے مرد کے دیو ہوا و ہوس نے داغدار کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں -

"لیلیٰ کے قلم سے جو خطوط لکھوائے گئے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ نہ انشا پردازی کی مشق ہے نہ زور قلم کا مظاہرہ ہے۔ بلکہ ان خطوط میں جو دیکھ سکتے ہیں ان کے لئے لیلیٰ کا تبسم ایک فوارۂ خون، اس کی بذلہ سنجی ایک فریاد اور اس کی ظرافت ایک دکھی کی پکار ہے۔ اس کی شوخیوں میں اس کے دل کا درد مستور ہے۔ اس کی شرارتوں میں اس کی جراحتیں پوشیدہ ہیں۔ لیلیٰ کی زندگی کا فلسفہ اس قدر نفرت انگیز نہیں جس قدر درد انگیز ہے۔ وہ ہنس ہنس کر اپنے زخموں سے کھیلتی ہے۔ جو اس کے وجود معنوی پر ناسور بن کر رہ گئے ہیں! اپنی مختصر داستان میں وہ اپنی لاکھوں بدنصیب بہنوں کی روئداد زندگی بیان کرتی ہے جو اس ملک میں مردوں کی نفس پرستی پر قربان کی جاتی ہیں لیلیٰ کی زندگی کا ہر نقش فریادی ہے"۔

"لیلیٰ کے خطوط" کہنے کو تو ایک بازاری عورت کی داستان ہے۔ مگر در اصل اس آئینہ میں ہندوستان کی شکست خوردہ بہنوں اور ان کے کچلے ہوئے وجود کی بے چارگی نظر آتی ہے۔ ان خطوط میں قاضی عبدالغفار نے بہ یک وقت سحر اور طنز دونوں سے کام لیا ہے۔ ان میں شگفتگی اور رومانیت کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ لیلیٰ سارے سماج کی جھوٹی اخلاقی قدروں کا پردہ چاک کرتی ہے۔ اور مجرموں سے انتقام لینا چاہتی ہے اور

بیوی اور ماں بن کے بغاوت کا علم بلند کرنے کی خواہشمند ہے ۔ اسے چاہے ناول تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن اس کی سحر طرازی اور اثر آفرینی مکمل ہے ۔ یہ کہنا کہ سماجی زندگی کی یہ تفسیر خطوط کی شکل میں ہے، اس لئے ناول نہیں کہا جا سکتا، غلط ہے ۔ کیونکہ ناول کسی طرح سے لکھا جا سکتا ہے ۔ مگر وجہ یہ ہے کہ ان خطوط پر انشا پردازی کا رنگ غالب آگیا ہے جس کی وجہ سے ناول کے ضروریات پیدا نہ کر سکے ۔ اس میں اسی لئے پلاٹ، کرداروں وغیرہ کی کمی واقع ہوئی ہے ۔ قاضی صاحب کے یہاں داخلیت زیادہ ہے وہ باہر والی دنیا سے اس لئے مشاہدہ نہ کر سکے جس طرح سے ہمیں باغ و بہار یا امراؤ جان ادا میں گفتگو ملتا ہے ۔ وہ ہمیں یہاں نہیں ملتا ۔ صرف اسٹائل کے لحاظ سے "لیلیٰ کے خطوط" ایک اہم کتاب لکھی گئی ہے ۔ اسی اسٹائل نے اس کو پڑھنے کے لئے ہر شخص کو مجبور کر دیا ۔ یہی اسٹائل بذات خود اس کے حسن اور اس کی بدصورتی کا باعث ہے ۔

قاضی صاحب کی انشا پردازی، رنگینیٔ بیان کی جھلکیاں تو شروع ہی سے اپنا جلوہ دکھاتی ہیں مگر "لیلیٰ کے خطوط" میں اس کا رنگ و روپ کچھ اور ہی نظر آتا ہے ۔ رسالۂ اردو میں ایک نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

> "مصنف کی شوخیٔ تحریر کی داد نہ دینا ظلم ہے ۔ کہیں کہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قلم سے بجلیاں گر رہی ہیں ۔"

یہ بجلیاں گرانا انھیں بہت پہلے آگیا تھا ۔ "نقش فرنگ" میں بھی ہمیں تھوڑی دیر پر بجلیاں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے "طنزیات و مضحکات" میں "نقش فرنگ" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ۔

> "اُن کی طنز ایک حد تک ڈرائینگ روم کی طنز ہے، نہایت نازک، نہایت ستھری ہوئی، نہایت حسین تیز چمکتی ہوئی، جیسے کسی ماہر فن کے ہاتھ میں عمل جراحی کے لئے ایک تیز نشتر ہو ... پڑھئے اور انشا پرداز کو داد دیجئے، نہ ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی آمادگی کی حاجت ۔"

"نقش فرنگ" میں اُن کا نشتر اتنا چمکدار اور تیز نہ تھا ۔ مگر "لیلیٰ کے خطوط" میں آکر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کند نشتر پر جس پر اس سے قبل باڑھ نہیں دی گئی تھی اب سان رکھ دی گئی ہے ۔ اب

اس کی تیزی دل و جگر کو زخمی کر دیتی ہے۔

"لیلیٰ کے خطوط" میں جس موضوع کو چھیڑا گیا ہے وہ ہمارے سماج کا بہت ہی اہم اور دردناک مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر قاضی صاحب سے بیشتر بھی ہمارے ادیبوں نے خیال آرائیاں کی ہیں۔ "طلسم ہوشربا" اور "الف لیلیٰ" جیسی، قدیم اور طویل داستانوں میں بھی کسبیوں سے نفرت دلائی گئی ہے مگر ان داستانوں میں سارا زور دلچسپی قائم رکھنے پر ہے۔ اس لئے اگر ان میں کوئی اصلاحی ہوتا بھی ہے تو دھیمے سروں میں، ہلکے رنگوں میں جسے عام طور پر پڑھنے والے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اصلی معنوں میں اگر دیکھا جائے تو صاف اور واضح طور پر یہ خیال رسوا کو آیا۔ انھوں نے اپنی "کوثر و تسنیم" میں ڈھلی ہوئی زبان میں سماج کے اس گہرے زخم کو چھیڑا ہے جو کوڑھ کی طرح اس کے جسم کو رفتہ رفتہ گھن لگا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ خود رسوا نے اعتراف کیا ہے کہ "ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو باتوں پر نکتہ چینی کریں۔" ہم کو اس ادارۂ کسب کی طرف سے نفرت نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے منشی پریم چند سب سے بہتر ہیں۔ انھوں نے اس کے ہر پہلو کو واضح کیا ہے۔ "بازارِ حسن" اُن کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے اور کردار کشی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم "سمن" کو ایک غیر فانی کردار کہہ سکتے ہیں۔ اور پریم چند کے زندہ کرداروں میں گیان شنکر، سور داس وغیرہ کے ساتھ ساتھ "سمن" کا نام آنا بھی ضروری ہے۔ پریم چند ایک تو یہ کہہ کر سماج کو عبرت دلاتے ہیں کہ "سمن" فطرتاً نیک تھی مگر ایک بدمزاج شوہر نے اُسے گناہ کے غار میں ڈھکیل دیا۔ وہ کہتے ہیں۔

> "ہندوستانی عورت کے لئے صرف دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ دائمی غلامی یا دائمی گناہ۔"

دوسری طرف وہ اس پیشہ سے بھی نفرت دلانا چاہتے ہیں اور "سمن" کے منہ سے کہلواتے ہیں۔

> "مجھے کتنا دھوکا ہوا، یہ مکان دور سے کتنا دلفریب، کتنا سہانا نظر آتا تھا۔ میں نے اسے پھولوں کا باغ سمجھا، لیکن ہے کیا ایک خوفناک بیابان خونخوار درندوں اور زہریلے اثرات سے پُر۔ یہ ندی دور سے چاندی کی چادر سی بچھی ہوئی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے، پر اس کے اندر کیا کیا خوفناک دریائی جانور کا مسکن یا بدکردار رئیس زادوں کا تختۂ مشق اور جائے تفریح۔"

قاضی صاحب نے بھی "لیلیٰ کے خطوط" میں تیز نشتروں سے کام لیا ہے۔ مگر دانستہ یا نادانستہ طور پر

اُن کا زورِ قلم اندازِ بیان پر زیادہ صرف ہو گیا۔ ان کے یہاں اندازِ بیان ہی سب کچھ ہے۔ انھوں نے لیلیٰ کے حالات بھی بہت مبہم طور پر بتائے ہیں جس سے ہم پوری طور پر یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ لیلیٰ کن منزلوں سے گذر کر عصمت فروشی کے بازار میں آ گئی۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہمیں قاضی صاحب کسب کے اسباب بتائیں گے۔ اور اس کے علاج سے بھی آگاہ کریں گے لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے جاتے ہیں ہمیں معلوم ہوتا جاتا ہے کہ قاضی صاحب نے کسب کا صرف ایک سبب بتایا ہے اور وہ مردوں کی زیادتی اور خود غرضی ہے۔ چنانچہ اپنے خیال کی تشریح وہ کتاب کے مختلف حصوں میں اس طرح کرتے ہیں۔

(۱) ''عورت کو بیوہ بنا دو یا گھر کی ملکہ جو چاہے بنا دو۔ مردوں نے جیسا چاہا عورت کو ایسا بنا دیا۔ غلام بنا دیا، اپنے نفس کا خدمت گذار بنا دیا یا بازاروں میں بٹھا دیا، یا برباد کر دیا۔''

(۲) ''برسات کے زمانہ میں جو عقلمند ہوتے ہیں وہ ایک کے بجائے دو چھتریاں رکھتے ہیں ضرورت کے وقت ایک گم ہو جائے تو دوسری کام آئے۔ عقلمند مرد بھی صرف ایک ہی عورت کو اپنی خلوت کا کھلونا نہیں بناتا کئی رکھتا ہے تاکہ راتیں ضائع نہ ہوں۔''

(۳) ''کتنی عورتیں ہیں جو زندگی میں پہلی دفعہ خود مرد کی طرف گئی ہوں انھوں نے اپنا آغوش مرد کے لئے کھولا ہو۔ حتیٰ کہ وہ دوشیزہ جس نے گناہ کی چار دیواری میں پرورش پائی ہو وہ بدنصیب بھی وہ بے شرم بھی آپ کو کبھی اپنی طرف نہیں بُلاتی کہ آئیے اور میری فطرت کا گلا گھونٹ دیجئے۔ تم نے خود اس کے جسم کی قیمت مقرر کی۔ تمھارے نفس نے اس کو تاکا۔ تم نے اس کی روح کو اپنی طاقت اور اپنے سونے چاندی سے دبا دیا، کچل ڈالا۔''

متذکرہ بالا اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ صرف یک رُخی تصویر ہے جس میں مبالغہ سے رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ قاضی صاحب کا یہ کہنا کہ ادارۂ کسب کا قیام مرد اور صرف مرد کی زیادتیوں پر منحصر ہے کسی طرح قابل قبول نہیں۔ جہاں تک ادارۂ کسب کے علاج کا تعلق ہے قاضی صاحب کوئی خاطر خواہ حل نہیں بتا سکے ہیں۔ وہ جتنا آگے بڑھتے جاتے ہیں اُن کی ادبیت اُن کی مقصدیت پر غالب آتی جاتی ہے۔ یہاں تک وہ اسی ادبیت کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر

اپنی مقصدیت کو کھو بیٹھتے ہیں لیکن اس بات کا ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ جہاں تک ان کے رنگِ انشاء کا تعلق ہے چاہے وہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے واضح کرنے میں کامیاب نہ ہوئے ہوں، چاہے انھوں نے حقیقت نگاری سے بھی کام نہ لیا ہو، انھیں کردار نگاری بھی پورے طور پر نہ آتی ہو، ناول یا افسانے کی ٹکنیک TECHNIQUE سے بھی ناواقف ہوں مگر پھر بھی وہ الفاظ کے خوشنما بیل بوٹے بناتے ہیں۔ اور اپنے "گلدستے" کو ایسا رنگین اور شامہ نواز پھولوں سے آراستہ کرتے ہیں کہ اُن کا رنگ و روغن، اُن کا شباب، اُن کی خوشبو رہتی دنیا تک تر و تازہ رہے گی۔

"مجھے دیکھو میں ایک آب تند و تیز سے بھری ہوئی مینا ہوں، میرا نشہ ہے مگر میں عموماً دیر پا نہیں، میں تنہا کتنے ساغر بھرتی ہوں اور کتنے بادہ پرستوں کا خیلا کرتی ہوں تم بھی ایک چھلکتا ساغر بن کر محفلوں میں رقص کرو۔"

قاضی صاحب نے اکثر موقعوں پر اپنی "نہایت نازک، نہایت ستھری، نہایت حسین، نہایت تیز چمکتی ہوئی جیسے ماہرِ فن کے ہاتھ میں ہماری صراحی کے لئے ایک نشتر" ایسی طنز سے کام لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمارے سماج نے عورت پر بہت ظلم کئے ہیں اور مرد کے گھر میں عورت کی حیثیت ایک سونا چاندی کے ایک خوبصورت گلدان کی سی ہے۔ جو دسترخوان کی آرائش کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ گھر کے طاقوں میں سجائے جاتے ہیں۔ مرد اپنے گھر اور بستر سجانے کے لئے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خوبصورت عورتیں لاتے ہیں۔ لیلیٰ کو اس بات کا خود احساس ہے کہ مرد اس کے جسم کی لطافتوں اور نزہتوں سے لطف اندوز ہو۔ اور جب جنسی لطافتیں مفقود ہو جائیں تو پھر اپنی آنکھیں پھیر لے۔ اور کسی اور کے دامن کو داغدار کردے۔ لیلیٰ کا "ہر نقش فریادی" ہے۔ یہ فریاد ان تلخ سماجی حقیقتوں کی آواز بازگشت ہے جو حل اور اظہار کے لئے منتظر ہیں۔ ان حقیقتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ نفس پرست مرد نے اپنی شعلِ نفس کو روشن رکھنے کے لئے عورت کو تمام حقوق سے محروم کرکے اس کی شخصیت کو کالعدم کر دیا ہے لیلیٰ اس مظلومیت پر صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اور صنفِ نازک کو بغاوت کا جھنڈا گاڑنے کے لئے اُکساتی ہے۔ لیلیٰ بظاہر حیاسوز معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ مرد نے اس کے انمول رتن کو بازارِ حسن کے بالاخانوں میں

ثایا۔ یہ بغاوت، یہ بُت شکنی، یہ تندی اور یہ تیزی اس لئے ہے کہ مدت سے مرد کے چنگل میں مبتلا رہی ہے۔ اب اس میں احساس زیست جاگ رہا ہے۔

(۱) "جب میں اپنے اور تمھارے درمیان روحانی محبت کا تصور کرتی ہوں تو تم مجھے اتنی دور نظر آتے ہو جیسے آسمان پر ایک ننھا سا ٹمٹماتا ہوا تارا۔ جب میں تمھارے ساتھ ازدواجی زندگی اور اس کی پابندیوں کا خیال کرتی ہوں تو تم مجھے ایسے نظر آتے ہو جیسے ایک خونخوار بھیڑیا۔ جس کے جسم سے بدبو آرہی ہو اور جس کے دانتوں سے خون ٹپک رہا ہو۔"

(۲) "آفتاب کی ایک شعاع اور مہتاب کی ایک کرن بھی تم چاہو کہ اپنی ساری دولت دے کر خرید لو، تو نہیں خرید سکتے۔ عورت کے قلب کی گرمی اور روشنی اس سے بھی زیادہ گراں ہے۔"

(۳) "بے شبہ میں اپنی جنسیت کو اپنے پیشے پر قربان کر چکی ہوں۔ تاہم سطح کے نیچے ہنوز ایک عورت زندہ ہے۔ جو تھکے ہوئے مسافروں کی راحت، زخموں کا مرہم، زندگی کے اندھیرے میں روشنی کی ایک شعاع بن سکتی ہے۔ مرد تو شاید حیوانیت کے طوفان میں اپنی جنسیت بھی فنا کر دیتے ہیں۔ مگر عورت کسی حال میں اپنی فطرت سے بیگانہ نہیں ہوتی۔"

لیلیٰ کی انفرادیت مسلم ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن صاحب "لیلیٰ ایک رومانوی ادیب کے تخیل کی طرح انفرادیت پرست ہے" وہ ایک چابکدست سنگتراش ہے۔ تمام دنیا پر قہقہہ لگانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اپنے دُکھوں کی پرستش کرتی ہے۔ مرد کے قوانین پر سخت تنقید کرتی ہے۔ وہ ہر مستور چیز کو برہنہ دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی مظلومیت، زندگی سے بیزاری اس میں احساس کمتری پیدا نہیں کرتی بلکہ اُسے مقابلے کے لئے للکارتی ہے۔ جذبہ انتقام کی کارفرمائی ہر جگہ نظر آتی ہے۔

(۱) "بہت وہ ہیں جو زندگی بھر نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے ہیں — میں تم سب کو اسی طرح لڑتے جھگڑتے، مارتے پھرتے اُچھلتے، ڈوبتے فنا ہوتے دیکھتی ہوں اور تم لوگوں کی بدحالی سے یہ سبق لیتی ہوں کہ دنیا کو پھر ایک طوفان نوح کی ضرورت ہے؟ جو ایک ہی دفعہ زندگی کا سارا نظام درہم برہم کر دے اس طرح کہ اس کا نشان بھی باقی نہ رہے۔

ــــ پھر سطح زمین پر از سر نو زندگی کا نمو شروع ہو اور نظام قدرت کا وہ توازن جس کو تم نے تباہ کر دیا ہے۔ پھر ایک دفعہ قائم ہو جائے"۔

(۲) " انتقام کا یہ خواب میری طرح ہزاروں مظلوم عورتیں دیکھ رہی ہیں تمھارا ظلم بڑھتا جائے گا اور اس کے ساتھ باغیوں کی تعداد بھی بڑھتی جائے گی تا آنکہ ایک دن قوی و ضعیف جگہ بدل لیں گے"۔

ان بے سروپا تخیلات پر حقارت کی ہنسی ہنسو۔ ہنستے جاؤ۔ ہنس ہنس کر عورت کے کمزور وجود کو ٹھکراتے جاؤ! یہی ہنسی ایک دن موت کا پھندا بن کر تمھارے گلے کی رگوں کو کچل دے گی، قضا کی ہچکی بن کر ــ تمھارے حلقوں میں اٹک جائے گی"

قاضی عبدالغفار کے یہاں "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہ دونوں نظریے ان کی شخصیات کے سنگم پر آکر مل گئے ہیں۔ قاضی صاحب کی عبارت ایسی رنگین اور دلکش ہے کہ پڑھتے وقت "نیرنگ خیال" کے مصنف کی یاد تازہ ہو جاتی ہے لیکن ایک بات تو ضرور ہے کہ قاضی صاحب آزاد کی بلند آہنگی اور دل بستگی کو نہیں پہنچ سکے۔ قاضی صاحب اپنی داستان کی زینت محض خیالات اور مصوری پر ہی نہیں رکھتے بلکہ اس داستان کی زینت دراصل اُن کا پاک مقصد ہوتا ہے اور وہ اسی پاکیزہ مقصد کے حصول کے لئے قلم اٹھاتے ہیں۔ اور آخر تک اس خوبی سے نبھاتے جاتے ہیں کہ نہ تحریر میں واعظ کی تھکا دینے والی نصیحتیں ہوتی ہیں نہ فلسفی کی خشک موشگافیاں وہ آخر تک ایک قابل انشا پرداز رہتے ہیں۔ جس کی مثال کسی اور ادب لطیف کے لکھنے والوں میں نہیں ملتی اُن کے یہاں ایک ہی وقت میں رنگینی و رعنائی، شوخی و طنز اور تمسخر ملتے ہیں۔ ان کا سوز و گداز انسان کو اپنی اصلی حالت کے متعلق سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کی رومانیت میں سماجی اور معاشرتی احساس ملتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری کے الفاظ میں اُن کے یہاں "عقلیت اور جذبات، رومانیت اور حقیقت پسندی، سپردگی اور احتجاج کا ایک عجیب و غریب اور حسین امتزاج ملتا ہے۔ اُن کے یہاں صرف جوش و جذبہ، برہمی اور انتشار اور شکست و ریخت ہی نہیں، ٹھہراؤ، اعتدال اور تنقید و تعمیر بھی ہے"۔

قاضی صاحب کے یہاں نمایاں چیز ان کے مقصد کے حصول کی خاطر ان کے ذاتی خیالات ہیں۔ اور ذاتی خیالات کی ترتیب میں قدم قدم پر طنز ملتی ہے۔ مضامین خطوط کی صورت میں ہونے کے باعث قاضی صاحب خاص قسم کا توازن قائم نہ رکھ سکے۔ لیکن بحیثیت مجموعی مضمون نویسی کے گر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ حالانکہ ..س پردہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتے ہیں۔

سوسائٹی کے عریاں سے عریاں پہلو نمایاں کرنے کے لئے ایک طوائف ہی سب سے بہتر عورت ہوسکتی تھی۔ چونکہ شرم و حیا جو نسوانیت کا جوہر ہیں ایک فاحشہ عورت سے قریب قریب مفقود ہوجاتا ہے اور مرد کی خودغرضی اور زیادتی اس میں نمایاں طور پر کارفرما رہتی ہے۔ حتیٰ کہ یہی آخری سبب بن جاتا ہے کہ ایک عصمت پناہ عورت "بازارِ حسن" کی چوک میں آکر اپنی عصمت فروخت کر دیتی ہے۔ اسی اہم مقصد کو قاضی صاحب نے اُجاگر کرنے کی کوشش ہر صفحے میں کی ہے۔ کہ مرد کی ظالمانہ اور جارحانہ روش سے ایک پاکباز عورت کیا سے کیا بن جاتی ہے۔ جیسا کہ لکھتے ہیں۔

"یہ صفحات اپنی شرح خود ہیں۔ ایک چھوٹا سا آئینہ ہیں جو ہندوستان کے نام نہاد مصلحین قوم اور مذہبی رہنماؤں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس میں عورت کے متعلق اپنی غفلت شعاریوں کا مکروہ چہرہ دیکھ سکیں۔"

"مسجد قرطبہ" - ایک مطالعہ

اقبال احمد انصاری

دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اقبال کو دوسری بار یورپ جانے کا جو موقعہ ملا وہ اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ اس نے ایسے فکری و وجدانی تاثرات شاعر کے ذہن پر چھوڑے جن کی تحریک سے وہ نظمیں تخلیق ہوئیں جو ادب کے برگزیدہ معیار پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں اور اقبال کے فکر و فن کے لطافت و جلال کی صحیح آئینہ داری کرتی ہیں۔ "مسجد قرطبہ" کو ان نظموں کا سرتاج سمجھنا چاہیئے۔

یہ سفر ایک ایسے زمانے میں واقع ہوا جب اقبال کا تخیل مطالعۂ فکر کی تصوراتی فضا پر آفاقیت سے برسوں ہم آہنگ رہ کر ایک انسانیت گیر لے کو جہانِ سخن کا نغمۂ سرمدی بنا چکا تھا اور جب تصورات نکھر سنور کر دقیق اور نازک فلسفیانہ حقائق کے پیکر میں ڈھل چکے تھے۔ مشاہدے اور گرمی تماشہ میں حقائق کو سوزِ جگر عطا کرنے کی جو زبردست صلاحیت ہے وہ نفسیاتِ فن کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اقبال کے لیے یہ سفر نہ صرف بعض اہم ملاقاتوں کا ذریعہ بنا بلکہ انھیں ارضِ یورپ پر تہذیبِ نو کی کشاکش کو اس دور میں دیکھنے کا موقعہ ملا جو دوسری جنگ عظیم سے چند برس پہلے بہت تیز ہو گئی تھی اور جس کے نتیجے میں نئی بساطِ رزم بچھ رہی تھی۔ برگساں اور مسولینی سے ملاقات، انگلستان، فرانس وغیرہ کا سفر اور ان سب کے مقابلے میں وجدانی تاثر کے پیمانے پر کہیں زیادہ اہم اسپین کا مشاہدہ، جہاں قریب سات سو برس عرب مسلمانوں کی تہذیب آفریں صلاحیتیں جلال و جمال کے ایک حسین امتزاج کے ساتھ بروئے کار رہیں اور جن کے فیضان سے یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی تاریکیوں سے دانش و عرفان کی روشنیاں پھوٹیں اور تہذیبِ جدید کی صبح بہاریں نمودار ہوئی، یہ سارے مناظر اقبال کے مفکرانہ شعری تخیل کے لیے ایک

ایسی مہمیز بن گئے جس نے ادبی تخلیق کے لیے ایک بہت برگزیدہ سطح پر زمین ہموار کر دی۔

صدیاں گذریں کہ اسپین کی سرزمین سے مسلمان کالعدم ہو گئے اور بہ ظاہر ان کے سارے اثرات فنا ہو گئے لیکن مسلمانوں نے نظم حکومت، تہذیب کا کاروبار، معاشرت کا رکھ رکھاؤ۔ اور علم و فن کی خدمت جس حیات آفریں جذبے کے ساتھ کی تھی اور زندگی کے حسن کو جس کمال سے نکھارا تھا اس کا فیضان کسی نہ کسی انداز میں آج بھی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ چند عمارتیں جو آثار قدیمہ کے اجزا ہو کر آج بھی محفوظ ہیں انسانی تخئیل کو بُعد زمان سے آزاد کر کے اس فضا میں پہنچا دیتی ہیں جہاں حُسن حقیقت بن کر جاوداں شانِ بہار کے ساتھ جلوہ فگن رہتا ہے۔ یہی ہے وہ ذہنی پس منظر جس میں اقبال نے مسجد قرطبہ کو دیکھا اور اسی کی خیال آفریں شان اس کی شاعرانہ فکر کے لیے وجہ تحریک بن گئی۔

یہ باتیں جو شاعر کے ذہن میں پس منظر کے طور پر پہلے سے موجود تھیں پھر نئے جذبے اور نئی حرارت کے ساتھ اس وقت تازہ ہو گئیں جب اس کی نگاہیں اس مسجد پر پڑیں۔ مسجد قرطبہ ہمارے شاعر کے سامنے فن تعمیر کے ایک بے نظیر نمونے کی حیثیت میں نہیں آئی بلکہ ایک رمز آفریں علامت (SYMBOL) کی شان رکھتی ہے۔

نظم کی ابتدا ہمارے زندگی میں زمانے کی کارفرمائی پر تبصرے سے ہوتی ہے۔ اس عالم کے تمام حادثات اور خود حیات و موت زمانے کی حرکت کے مرہون منت ہیں اور زمانہ اقبالی تصور کے مطابق ایک پیکر ظہور ہے جس کے ذریعہ ذات ایزدی اپنے صفات جلال و جمال کی جلوہ گری کرتی ہے۔

سلسلۂ روز و شب تارِ حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

اقبال فلسفیوں کے اس گروہ سے پورے طور پر متفق ہیں جو حرکت زندگی میں زمان کی بنیادی اہمیت کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن ان کی فکر اس نقطے پر ٹھہر نہیں جاتی وہ زمانے کو تمام تر بے اختیار متوج نہیں سمجھتے بلکہ اسی گنت صفات الٰہی کی ایک صفت شمار کرتے ہیں اس طرح وہ مذہبی اور روحانی اساس زندگی کو

برقرار رکھتے ہوئے زندگی کے حرکتی تصور کے مبلغ بن جاتے ہیں۔

زمان کی شدید گرفت میں سب اسیر ہیں۔ ازل سے ابد تک جو سلسلہ ہے اس میں زندگی کے شب و روز بے حقیقت ہیں۔ اس کی سبک گامی کا یہ اثر ہے کہ کیا قوم و سلطنت کیا شخصیت و آرٹ اس کی دست برد سے کوئی محفوظ نہیں۔ عظیم سلطنتیں، قومیں اور فن و ہنر کے عجیب و غریب نمونے سب فنا کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات

شاد و مایوسی کی اسی لے کے درمیان شاعر کا وجدان پکار اٹھتا ہے کہ اس عالم گذراں کے فانی عناصر میں ایک بقاء دوام کا عنصر بھی ہے اور وہ "عشق" ہے۔

اقبال کے نزدیک عشق ایک ایسی فعال اور حیات آفریں وولولہ خیز قوت ہے جو افراد اور قوموں کے اندر زندگی کے اعلیٰ نصب العین کی تڑپ اور اسے حاصل کرنے کی لگن کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اس نصب العین کے فیضان سے عشق مقصد و منزل بھی بن جاتا ہے اور یہی عشق اس منزل کی طرف بڑھنے کے لیے راہ کے موانع و مزاحم سے برسر پیکار ہونے اور ان پر قابو پانے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ عشق ایک مقصد بھی ہے اور ذریعہ بھی۔ اپنی ذات کو علویت کے انتہائی مقامات تک پہنچانے کے لیے جو خودی (خودی) کو چمکانے اور ارتفاع بخشنے کی جو ضرورت ہے وہ ذات ایزدی سے عشق کی صورت میں ممکن ہے۔ یہی عشق وہ گرمی و حرارت بھی عطا کرتا ہے جو اسے بیدار رکھے اور اس کی لگن میں اضافہ ہوتا رہے اور اس کا تعلق ربانی سرچشمہ ہدایت سے قائم کر کے راستے کی رہنمائی کے لیے نور بصیرت بھی عطا کرتا ہے ع۔

عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

تصوف کی عام مروجہ اصطلاح "عشق" جو انسان کو زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشینی کی ترغیب دیتا ہے اس کا اس تصور سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ اس رزم گاہِ حیات میں

کو دیڑنے اور کائنات کی مزاحم قوتوں کو تربیتِ خودی کی راہ میں اپنے قوت بازو سے تسخیر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس عشق کے مظاہر بے شمار ہیں۔ ع۔

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق کے اسی تصور کے پیشِ نظر اقبال اسے زمانے سے بھی قوی تر سیل بتلاتے ہیں۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

وہ زمان کی گرفت اور اس کی لپیٹ میں آنے کے بجائے اس کے رمزِ حیات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور اس طرح اس کی یلغار کی حدوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ فن کے وہ نمونے جو عشق کے ایسے بلند نصب العین کا ظہور ہوتے ہیں آنی و فانی جہاں میں نقشِ ثبات بن جاتے ہیں۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

اقبال کو حرمِ قرطبہ سنگ و خشت کی نادرہ کاری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں بلکہ وہ پیکر نظر آتی ہے جس میں اسکے جذبہ عشق سے سرشار معماروں نے اپنا باطنی سوز و گداز ظاہر کیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال فن کے متعلق اپنا وہ نظریہ بیان کرتے ہیں جس کا انھوں نے بہ تکرار اظہار کیا ہے۔ ع

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اس کا اطلاق شاعری، مصوری، موسیقی، سنگ تراشی تمام فنون لطیفہ پر ہوتا ہے۔ اسی "خونِ جگر" کا ذکر ایک جگہ اور یوں ہے۔

خونِ دل و جگر سے مری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

یا

قطرۂ خونِ جگر اس کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

یہ "خونِ جگر" کیا ہے؟ فن کار کی شخصیت کے خلوص اور حقیقی جذبے کا دوسرا نام۔ فن کار اپنے فن پارے میں تخئیل کے ذریعے کسی تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس تصور کی سچائی اور اس کا حسن وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا ہو، اس پر اس کا یقین و ایمان مکمل ہو۔ تخلیق کا محرک بھی یہی حقیقی جذبہ ہوتا ہے اور اس کے اظہار میں بھی اسی خلوص و جذبے کی ضرورت ہے اس خلوص کا نتیجہ انہماک کی صورت میں رونما ہوتا ہے جو فن کے اسرار و رموز اس کے دل کی گہرائیوں میں اتار دیتا ہے اور فن کا وہ نمونہ بے پناہ تاثیر کا مالک ہو جاتا ہے۔ اسی سے نغمۂ نے میں سرور آ جاتا ہے اور اسی سے شاعر خلوت دوست میں اپنے نالوں کے ذریعہ حدیث شوق بیان کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

"معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود" کا اطلاق موسیقی، شاعری، مصوری، سنگ تراشی تمام فنون لطیفہ پر ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا دائرہ اطلاق اور بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ فنون لطیفہ ہی پر کیا منحصر زندگی کے تمام ہنگامے اور سرگرمیاں اور اس کے ایسے سارے نقوش جو "فانی" نہیں بلکہ "باقی" ہوتے ہیں اسی "خونِ جگر" کے مرہون منت ہیں۔

خطاب مسجد قرطبہ سے چل رہا ہے لیکن درمیان میں بہ طور جملۂ معترضہ کہتے ہیں کہ یہ جو میری نوا "سینہ سوز" اور "دل کشود" ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ع

شوق مری سَے میں ہے شوق مری سَئے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو مری رگ و پے میں ہے

یہ بات بھی ذہن میں ہے کہ میں خود اس خطۂ ارض سے آ رہا ہوں جو ہمیشہ کفر ہی کا گہوارہ رہا ہے۔ لیکن میرے ذوق و شوق نے مری حیاتِ گذراں کے آہنگ کو ذات احدیت کے سرودِ جاوداں سے اس قدر ہم آہنگ کر دیا ہے کہ میرے نغموں میں بھی جاودانی شان ابھر آئی ہے۔

مسجد کو مخاطب کر کے اقبال نے اپنا تصورِ "مردِ مومن" بالکل وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرا جلال و جمال ان بندگان مولا صفات کی یاد دلاتا ہے جو خود تیری ہی طرح ان دوگونہ صفات سے متصف تھے۔ کمال کا تصور اقبال کے ہاں ہمیشہ جلال و جمال کے دو اہم عناصر کی آمیزش سے ترکیب پاتا ہے۔ ان کے نزدیک خدا کی ہستی اسی لیے کامل ہے کہ وہ ایک طرف قہار و جبار قوی و قادر مطلق ہے تو دوسری طرف غفار و رحمٰن بھی۔ اپنے اسی تصور کے ماتحت وہ کسی چیز کو اس وقت تک کامل نہیں سمجھتے جب تک اس میں یہ دونوں صفات بدرجۂ اتم موجود نہ ہوں، خواہ وہ آرٹ کا کوئی نمونہ ہو خواہ انسانی کردار و شخصیت خواہ اخلاق کے اصول۔ یہی وجہ ہے کہ تاج محل کا حسن جس میں جمال تو ہے جلال نہیں ان کے نزدیک زیادہ قابلِ اعتنا نہیں اور اسی سبب سے مسجدِ قرطبہ بہ حیثیت نمونۂ فنِ تعمیر بھی انھیں زیادہ عزیز ہے۔ وہ ہر اس دلبری کو جادوگری سمجھتے ہیں جس میں قاہری کے عناصر نہ ہوں، برخلاف اس کے "دلبری با قاہری" پیغمبری بن جاتی ہے۔

"مردِ مسلماں" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں بھی وہ مردِ مومن کو انھیں دوگونہ صفات سے متصف دیکھتے ہیں۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

رسول اللہؐ کی ذات میں ان کو انسانی شخصیت کا آئیڈیل اسی لیے نظر آتا ہے کہ آپ جلال و جمال کے بہترین امتزاج کے حامل تھے۔

ان مردانِ حق کے متعلق جنھوں نے سرزمین ہسپانیہ کو اپنی جولاں گاہ بنایا، کہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ ساقی ارباب فن تھے دوسری طرف فارس میدان شوق بھی۔ ان کی بنیاد خاکی ہے لیکن صفات ملکوتی سے بھی وہ متصف تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مقاصد جلیل ہی اپنے پیش نظر رکھے تو ان کا دل اجر و انعام اور عیش سے ہمیشہ بے نیاز رہا۔ انھوں نے حکومت بھی کی تو قیصر و کسریٰ کی طرح تزئین شوکت عمارت نہیں کی بلکہ اپنے کاروبار سلطنت سے یہ ثابت کیا کہ ع

سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں

انھوں نے جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں علم و ہنر کی قندیلیں روشن کیں اور طرز معاشرت کا وہ اعلیٰ عملی نمونہ پیش کیا کہ جن کے طفیل سیکڑوں برس بعد کے بچے کھچے اثرات بھی دلفریب و دلنواز ہیں۔

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہے اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

ماضی کی ان یادوں کو تازہ کرنے کے بعد اقبال کا دل تڑپ اٹھتا ہے کہ آہ اپنی جولاں گاہوں کو چھوڑ کر عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں آج کس منزل اور کس وادی میں ہے۔

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

لیکن اقبال کا دل جو ہمیشہ امید و رجا کا مسکن بنا رہا مایوس نہیں ہوتا وہ اس ملت کے مستقبل سے پر امید ہیں۔ دنیا کے حالات کے پیش نظر عموماً اور ملت اسلامیہ کی بیداری کو دیکھ کر خصوصاً اسے یقین ہے کہ گنبد نیلوفری رنگ بدلے گا اور اس بحر مضطرب کی تہ سے کوئی گہر نمودار ہوگا۔ اپنے اس یقین کو دوسروں کے دل نشین کرنے کے لیے وہ ان انقلابات کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے یورپ کی دنیا ہی بدل ڈالی جرمنی کی تحریک اصلاح دین، انقلاب فرانس، اور حریت فکر کی تحریک نے ایسے تہلکات کو جنم دیا

جس سے یورپ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا حتیٰ کہ "ملت رومی نژاد"، جو روایتی طور پر وارفتۂ قدامت رہی ہے لذت تجدید سے پھر جوان ہوگئی۔ شاعر روح مسلماں میں بھی آج ایک ایسا ہی اضطراب محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یورپ اپنی زندگی میں ایسے تغیرات دیکھ سکتا ہے اور جبکہ انقلاب آئیں دہر ٹھہرا تو کیا وجہ ہے کہ وہ ملت اسلامیہ جو جدید ترین ملت ہے اور جو "سترِ کلیم و خلیل" کی حامل ہے اس میں پھر روح تازہ نہ دوڑ جائے اور وہ بیدار ہو کر ایک نئے انقلاب کی داعی بنے۔

نظم ایک پیشنگوئی اور پیغام کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ وہ جذب و کیف کے عالم میں اپنی فکر و بصیرت اور شاعرانہ وجدان کے وسیلے سے اس عالم نو کو بے حجاب دیکھتا ہے جو ابھی پردۂ تقدیر میں ہے۔ لیکن جس کا نمودار ہونا حالات کی روشنی میں مقدر ہو چکا ہے۔ اپنے مستقبل کے خواب کی طرف وہ اشارہ ہی کرتا ہے اس کی تعبیر نہیں بیان کرتا کیونکہ اسے یقین ہے کہ اہل مغرب جو عقل و خرد کے مارے ہوئے ہیں۔ اور جن کی ہاتھ میں دنیا کی قیادت کی باگ ڈور ہے عقلیت کے فریب اور نشۂ اقتدار میں اس کی باتوں کو مجذوبانہ بڑ تصور کریں گے اور شاید فرزانگی کے یہ دیوانے فرزانۂ جنوں کی تاب سخن نہ لاسکیں گے۔

نظم کے فنی محاسن کا تذکرہ کئے بغیر یہ مطالعہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر یوسف حسین نے بہت صحیح کہا ہے کہ "مسجد قرطبہ" جدید اردو ادب کا شاہکار ہے۔ انھیں کے الفاظ میں "اس میں شاعر نے ایمائی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے۔ اس میں آرٹ، تاریخ اور فلسفہ ایسے خوش اسلوبی سے سموئے گئے ہیں کہ انسانی ذہن لطف اندوز ہوتا ہے اور داد دیتا ہے۔"

نظم کی وحدت پر غور کیا جائے تو ہر بند اور ہر ہر شعر موتی کی طرح ایک لڑی میں پرویا نظر آتا ہے کوئی شعر ایسا نہیں کہ خارج کر دینے یا جگہ بدل دینے سے پوری نظم کی وحدت و سالمیت متاثر نہ ہو۔ پھر ابتدا سے انتہا تک جو تدریج ہے اور جس طرح بند قائم کیے گئے ہیں وہ موسیقی کے فطری زیر و بم اور ابتدا و انتہا معلوم ہوتے ہیں۔

یورپ کی صدیوں کی تاریخ پر چند اشعار میں جو اشارے ہیں وہ بہت سی داستانوں پر بھی بھاری ہیں

ایجاز و اختصار اور اثر آفرینی کے کمال کی مثال شاید اس سے بہتر نہ مل سکے۔

آخر کے اشعار میں جو منظر کشی ہے اور اپنی پیشگوئی کے لیے جو ماحول تیار کیا ہے۔ وہ قاری کو تھوڑی دیر کے لیے اسی فضا میں پہنچا دیتا ہے اور اس پر ایسا جادو چل جاتا ہے کہ اپنے دل کو انھیں کیفیات و واردات سے معمور پاتا ہے جو شاعر پر گذرے ہیں۔ منظر کشی کے لیے جس وقت کا انتخاب کیا ہے اور جن عناصر کا ذکر ہے وہ صرف برائے حسنِ منظر کشی نہیں بلکہ نگاہ ذوق کو ان میں بھی گہرے معنوی اشارے ملتے ہیں۔

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

اختر انصاری

قطعات

یہ زمیں

زہرہ وش، مہ جبین رقاصہ — دہر کی بہترین رقاصہ
سحر ہے، برق ہے، قیامت ہے — یہ زمیں، یہ حسین رقاصہ

جذبۂ و فکر

دل میں جذبات تند و تیز کی رَو — جیسے پُر شور و شر کوئی دھارا
پسِ منظر میں فکر کی چھم چھم — رقص میں جیسے کوئی مہ پارا

کشتۂ تیغِ کرم

کسی نے ڈال دیا کاسۂ مقدر میں — غمِ حیات بہ قدرِ خزانۂ قاروں
میں لطفِ زیست کے دو لمحوں کا بھکاری تھا — کرم نے مار مجھے، کیا کروں، کہاں جاؤں

محرومیٔ تام

ہوئے نہ ہم تو کبھی زیرِ بارِ منتِ چرخ — وہ بے کسی ہے کہ اکثر عدو بھی روتے ہیں
رہی وہ اک نگۂ لطف اُس پری رو کی — تو اُس کے بدلے میں برسوں لہو بھی روتے ہیں

جہاں بر دوش

گدازِ عشق کو پہلو میں ہوں بسائے ہوئے — غمِ حیات کو سینے سے ہوں لگائے ہوئے
کہاں کی ناکسی اور کیسی فارغ البالی — میں اپنے دوش پہ دنیا کو ہوں اٹھائے ہوئے

کیٹس کے خطوط فینی برانی کے نام

شاہد مہدی

"کیٹس اپنی موت کے وقت اپنی نسل کا سب سے بڑا شاعر ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا اس کی شاعری کی محض سو سطریں اُسے بڑے سے بڑے شاعروں کی صف میں لا بٹھاتی ہیں۔ اس کی مشکل زبان کے باوجود ہر قوم کے بڑے فن کاروں نے اس کی عظیم الشان مثال کے مقناطیسی اثر کو محسوس کیا ہے"——
کزامیان، کیٹس پر اپنے تنقیدی بیان کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔ ابتدائی سالوں میں جب کیٹس صحت مند تھا جب اس کے سارے احساسات بیدار اور حوصلے جوان تھے، تو اُسے خود اپنے جینئس ہونے کا احساس تھا، اس نے اپنے ایک خط میں نہایت انکسار کے ساتھ لکھا ہے کہ "میرا خیال ہے کہ مرنے کے بعد میرا شمار بھی انگریزی شعراء میں ہوگا" اور آج اس کی موت کو تقریباً سوا سو سال گذر جانے کے بعد بھی ہم دیکھتے ہیں دیکھا کہ اس کا یہ دعویٰ محض شاعرانہ تعلّی نہیں تھا۔ اور میتھو آرنلڈ نے اس خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے "یقیناً اُس کا شمار انگریزی کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے! اس کا شمار شیکسپیر کے ساتھ ہوتا ہے" یہ درست ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں جب وہ لمحہ بہ لمحہ موت کے بھیانک غار کی طرف بڑھتا جارہا تھا، اس کی ساری ادھوری نظمیں، اور تحریریں، اور وہ ساری تخلیقات کہ جنھوں نے ابھی دن کی روشنی بھی نہیں دیکھی تھی، بار بار اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں آسیب کی طرح آتی تھیں،۔ نا مکمل شہکار اور بن لکھے فن پارے ایک بے بس فن کار کے دل میں جو گہرے گھاؤ بناتے چلے جاتے ہیں، اس کا احساس کچھ فن کار ہی کر سکتا ہے۔ ایسے لمحات میں فن کار کو ساری کائنات ڈوبتی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہے

ان وردناک خیالوں کا اظہار کیٹس کے اکثر خطوط میں ملتا ہے۔ (   ) اور غالباً اسی قنوطیت کے غلبے میں اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات کے ساتھی سیورن سے اٹلی میں کہا تھا کہ اس کی قبر کے کتبے پر اس کا نام نہ لکھا جائے صرف یہ تحریر لکھ دی جائے۔

یہاں وہ شخص آرام کر رہا ہے

جس کا نام پانی پر لکھا گیا تھا

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک کیٹس پر اس منحوس بیماری کا سایہ نہیں پڑا تھا، وہ اپنی جینئس اور فن میں انتہائی پروقار اعتماد رکھتا تھا۔ اس نے جس بے تعلقی اور سکون کے ساتھ انڈائمین (ENDYMION) پر، معاصر اخباروں کے بے جا اعتراضات، اور جگر زاش تیروں کا مقابلہ کیا۔ وہ اس اعتماد اور یقین کا غماض ہے۔ اور آنے والی نسلوں نے کیٹس کو، جو بذات خود ایک نامکمل شاہکار تھا، اس کے کارناموں کی بنا پر نہ سہی لیکن کم از کم اس کے امکانات کی بنا پر انگریزی کے عظیم شعراء کی صف میں جگہ دی۔

ظاہر ہے شاعری کی دنیا میں، جس جواں مرگ شاعر کی اس قدر اہمیت ہو، اس کے خطوط کی اہمیت کو جو یقیناً اس کی زندگی کے آئینہ دار ہیں، اور جو اس کے کردار اور شخصیت کے سمجھنے کے لیے سب سے زیادہ معتبر ذریعہ ہیں، کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیٹس کے خطوط کی اشاعت سے نہ صرف انگریزی خطوط کے خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ ہوا، بلکہ کیٹس کی شخصیت پر بھی کافی روشنی پڑی۔ لیکن حیرت ہے کہ میتھو آرنلڈ جیسا نقاد کیٹس کے ان خطوط کی اشاعت کے بارے میں جو فینی براؤن کے نام لکھے گئے ہیں، یہ الفاظ کہتا ہے۔ کیٹس کے ان خطوط کی اشاعت ناقابل معافی جرم ہے۔ ان خطوط کو ہرگز شائع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ وہ یہ پیش کرتا ہے کہ بلند کرداری اور تہذیب نفس جو ہر قسم کی عظمت کے لیے ضروری ہیں اور ایک فنکار کے لیے بھی لازمی ہیں، فینی براؤن کے نام ان خطوط میں مفقود ہیں۔ اس کے بعد اس نے ایک خط کا حوالہ دیا ہے اور کہتا ہے کہ اس خط میں، دوسرے خطوط کی طرح

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ایسا آدمی بول رہا ہو جو سراسر جذبات کا غلام ہو، جسے وقار اور تہذیب نفس سے کوئی سروکار نہ ہو۔" میں یہاں پر میتھو آرنلڈ کی ان سطور کو نقل نہیں کروں گا، جن میں اُس نے ان خطوط کو بیہودہ، غیر مہذب، اور فحش ثابت کرنے میں سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اس آدمی کی نیت کیا تھی، جو ان خطوط کی اشاعت کا ذمے دار ہوا۔ ان خطوط کی اشاعت کی ساری ذمے داری ہیری بکسٹن فارمین کے سر جاتی ہے۔ ان کے فرزند مارس بکسٹن فارمین کا بیان ہے کہ "میرے باپ کا مرتے دم تک یہی عقیدہ تھا کہ وہ ان خطوط کو شائع کر کے کیٹس کے ساتھ پورا پورا انصاف کر رہے ہیں ان کا خیال تھا کہ ان خطوط کے بغیر کیٹس کی شخصیت کی ہر تصویر نامکمل ہوگی! کیٹس کے خطوط، بغیر فینی کے نام لکھے ہوئے خطوط کے ایسے ہی ہوں گے جیسے "ڈنمارک کے شہزادے کے بغیر شیکسپیر کا ہملیٹ" اس کے علاوہ مڈلٹن میری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "جو لوگ کیٹس کے عشق کو نہیں سمجھ سکتے، وہ اس کی شاعری کو نہیں سمجھ سکتے، کیوں کہ ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے"، اور کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص، بغیر ان خطوط کو پڑھے ہوئے کیٹس کے عشق کو سمجھ جائے۔

کیٹس نے فینی براؤنی کے نام جتنے خطوط لکھے ان میں سے صرف ۳۹ دستیاب ہیں۔ پہلا خط ۳ر جولائی ۱۸۱۹ء کو لکھا گیا ہے اور آخری خط اگست ۱۸۲۰ء میں لکھا گیا ہے، آخری خط کی تاریخ نہیں معلوم ہو سکی ہے، ان خطوط کو آسانی کے لیے موٹے طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے میں وہ خطوط آتے ہیں جو ۳ر جولائی ۱۸۱۹ء اور ۱۹ر اکتوبر ۱۸۱۹ء کے درمیان، لکھے گئے ہیں ان میں سے کچھ جزیرۂ وائٹ سے، ایک ونچسٹر سے، اور باقی لندن سے لکھے گئے ہیں دوسرے میں وہ خطوط آتے ہیں، جنھیں رقعے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ ۲۱ رقعے فروری مارچ ۱۸۲۰ء میں لکھے گئے ہیں جب کہ کیٹس بیمار پڑا تھا، اور ہیمپسٹیڈ میں اپنے دوست براؤن کے یہاں اس کا قیام تھا اور فینی براؤنی بھی قریب ہی اپنی ماں کے ساتھ رہ رہی تھی، آخیر میں وہ خطوط آتے ہیں جو کیٹس نے کنٹش ٹاؤن سے لکھے ہیں جب کہ وہ لی ہنٹ کے یہاں مقیم تھا۔ یہ خطوط مئی ۱۸۲۰ء اور اگست ۱۸۲۰ء کے درمیان لکھے گئے ہیں

میں نے یہاں خطوط کا ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جن میں سے ۲ پہلے دور کے ۴ دوسرے دور کے اور ۳ آخری دور کے خطوط ہیں، ان خطوط کو پڑھنے کے بعد چاہے آپ میتھو آرنلڈ کی رائے سے متفق ہو بھی جائیں (اوّل تو کوئی معقول شخص ایسا کرہی نہیں سکتا) جب بھی آپ کو ان کی اہمیت کا اعتراف کرنا پڑے گا ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو کچھ ناامیدی بھی ہو کیوں کہ ان خطوط میں نہ عہدِ متاخری کے خطوط کی شعوری رنگینی ہے، اور نہ عام عاشقانہ خطوط کا تصنع ہے۔ بہرحال سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان خطوط کو پوری طرح سمجھا جائے۔ اور ان کو سمجھنے کے لیے ایک پس منظر کی ضرورت ہے۔ داستان شاید طولانی ہو لیکن بہت دل چسپ اور بہت دردناک ہے، اسی لیے شاید بہت زیادہ صبر آزما نہ ہو۔

اپنے چھوٹے بھائی جارج کیٹس اور اس کی نئی نویلی دلھن کو امریکہ کے لمبے سفر پر رخصت کرنے کے بعد کیٹس اور اس کے دوست براؤن نے واکنگ ٹور، کا پروگرام بنایا، تقریباً سارا لیک ڈسٹرکٹ پیدل طے کر کے وہ اسکاٹ لینڈ پہنچے۔ لیکن اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کیٹس کو اسکاٹ لینڈ کا ٹور ادھورا چھوڑنا پڑا دوسری بات یہ کہ اس کے چھوٹے بھائی ٹام کیٹس کی طبیعت بھی جو دق میں مبتلا تھا ایک بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی مجبوراً کیٹس واپس ہیمپسٹیڈ پہنچا (اگست ۱۸۱۸) ٹام کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ اور کیٹس انتہائی بے بسی کے عالم میں اُسے لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پہلی دسمبر کو ٹام کا انتقال ہوگیا، دوسری صبح جب براؤن کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ کیٹس اسے بڑی خاموشی سے جگا رہا ہے، کیٹس اپنے بھائی کی موت کی اطلاع دینے آیا تھا۔ دونوں دیر تک خاموش رہے۔ اس کے بعد براؤن بولا، "اب تم اُس مکان میں بالکل مت رہو، اکیلے بھی مت رہو، کیا میرے ساتھ رہنا بہتر نہیں ہوگا؟"

"میرے خیال میں یہی سب سے زیادہ بہتر ہے!" کیٹس نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا"

کیٹس براؤن کے ساتھ ونٹ ورتھ پیلیس میں رہنے لگا۔ اسی مکان کے ایک حصّے میں مسز براؤنی مع اپنے بچوں کے رہتی تھیں، کیٹس اور فینی براؤنی کی پہلی ملاقات، ڈلکے کے بیان کے مطابق اکتوبر ۱۸۱۸ میں

ہو گئی تھی۔ براؤن اس وقت ۱۸ سال کی تھی اس کی آنکھیں نیلی تھیں، اس کے بال بھورے نسلے رنگ کے تھے اور ان میں جب وہ سرخ ربن باندھ لیتی تھی تو آنکھوں کی نیلاہٹ اور زیادہ کھل اٹھتی تھی۔ فینی بے حد دلکش لڑکی تھی۔ ظاہر ہے کہ کیٹس کو بہت سے رقیبوں سے سابقہ پڑا ہو گا۔ وہ بے حد عمدہ ناچتی تھی اور کیٹس ناچنا نہیں جانتا تھا۔ مس براؤن فرنچ بڑی روانی سے بولتی تھیں یہ اس زمانے میں بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی، کیٹس بھی اچھی خاصی فرنچ جانتا تھا، مگر اس کا علم کتابی تھا۔ فینی سوسائٹی میں کافی مقبول تھی اور کیٹس کو اس کی اس مقبولیت کی وجہ سے کافی اذیت پہنچتی تھی۔ ڈلکے کا بیان ہے کہ کیٹس کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی مس براؤن کی طرف دیکھ بھی لے۔

فینی کی محبت نے کیٹس کو بہت سے شاہکار تخلیق کرنے پر اکسایا۔ جنوری سے مئی تک اس نے کئی بلند پایہ نظمیں لکھیں۔ جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

ON THE EVE OF ST. AGNES (جنوری ۱۸۱۸ء)

ON THE EVE OF ST. MARK (فروری ۱۸۱۸ء)

LABELLE DAME SANS MERCI (اپریل ۱۸۱۸ء)

ODE TO NIGHTINGLE. (مئی ۱۸۱۸ء)

مئی میں ڈلکے شہر چلا گیا، اور مسز براؤن ہمپسٹیڈ ورنٹ ورتھ پلیس میں آگئیں کیٹس کی منگنی براؤن سے ہو چکی تھی، اور اُس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق دونوں کا ایک ہی مکان میں رہنا معیوب تھا، مگر کیٹس نے کوئی پروا نہیں کی۔ لیکن کیٹس اور براؤن بہت دنوں تک ایک مکان میں نہ رہ سکے۔ اس کی دو وجہیں تھیں اوّل یہ کہ کیٹس براؤن کے اتنے قریب رہ کر کوئی کام نہیں کر پاتا تھا دوسرے یہ کہ براؤن ہر گرمی میں اپنا پورا مکان کرائے پر اٹھا کر جہاں گردی پر نکل جاتا تھا۔ چنانچہ عارضی طور پر ونٹ ورتھ پلیس چھوڑنا ضروری ہو گیا۔ بڑی رد و کد کے بعد آخر کار کیٹس پہلی جولائی کو شانکلن، جزیرہ وائٹ پہنچ ہی گیا۔ یہیں سے اس نے فینی کو پہلا خط لکھا ہے (۱۳۴)

دوران سفر میں اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی، دوسری بات یہ کہ اس کا بیمار دوست رائس بھی

اس کے ساتھ تھا۔ ایک تو اُس کی بیماری دوسرے فینی کی جدائی، ان دونوں چیزوں کا اس کے مزاج پر بڑا اثر پڑ رہا تھا۔ پھر یہ بھی طے نہیں تھا کہ وہ دوبارہ فینی سے مل بھی سکے گا یا نہیں، کیوں اُس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک قسمت کا پانسہ نہیں پلٹے گا۔ وہ واپس نہیں لوٹے گا (۱۳۴)

فینی نے اپنے جواب میں اس کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا ہوگا۔ اس نے لکھا ہوگا کہ "کیا ہماری ملاقات کا انحصار ان دہشت ناک لوگوں پر ہے؟" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خاندان کے کچھ دور اندیش دوست اس کی محبت کے سارے لطف کو روپے پیسے کا ذکر کر کے خاک میں ملا رہے تھے۔ اور وہ سمجھنے لگی کہ کیٹس پر ایسے لوگوں کا اثر ضرورت سے زیادہ ہو رہا ہے کیٹس نے فینی کے اس احتجاج کا جواب بڑے نرم لہجے میں دیا ہے (۱۳۶) فینی نے یہ بھی لکھا ہوگا کہ، وہ اس کے حسن کے بارے میں کیوں اتنا لکھتا ہے۔ کیٹس نے اس کا جواب بھی بڑے جذباتی انداز میں دیا ہے (۱۳۶)

جولائی کے آخیر میں براؤن بھی آگیا، براؤن فینی کی ناسازی طبیعت کی خبر لایا، جس سے کیٹس کافی پریشان ہوا۔ کیٹس کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ کافی خوب صورت ہے کیٹس نے لکھا ہے کہ وہ سراہے جانے کی چیز ہی نہیں۔ اس خط کا اختتام بھی قابل غور ہے (۱۳۹)

کیٹس نے فینی کو بھلانے کی کافی کوشش کی، وہ ہمہ تن کام میں مصروف ہوگیا۔ وہ مطالعہ میں غرق رہنے کے علاوہ LAMIA اور غالباً HYPERION پر بھی کام کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ونچسٹر آگیا، کیٹس نے صحافت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ اکتوبر ۱۸۱۹ میں وہ لندن گیا اور ۲۵ کالج اسٹریٹ میں رہنے لگا۔ مگر یہاں سے فینی بہت قریب تھی، اس کے جذبات میں تلاطم رہنے لگا، جو سکون اس نے ونچسٹر میں رہ کر حاصل کیا تھا، وہ مفقود ہو چکا تھا۔ کیٹس کی صحت بھی خراب تھی، آخر کار اُس سے ضبط نہ ہوا اور وہ فینی سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔ اس عرصے کے خطوط (۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۲) اس زمانے کی کیفیات کے غماز ہیں۔ یہ سب لندن سے لکھے گئے ہیں۔ اس سارے عرصے میں کیٹس کی صحت خراب رہی وہ اب اپنی صحت کی طرف سے لاپروا رہنے لگا اور

افیون کا شوق بھی استعمال کرنے لگا دوسری طرف اسے مالی معاملات میں پیہم ناکامی ہو رہی تھی۔ اس کی تحریروں میں تھکن نمایاں ہونے لگی۔ CAPE BELL اس کی آئینہ دار ہے۔ اس کا ڈرامہ OTHO, THE GREAT ناکامیاب رہا۔ ان ناکامیوں کا اثر اس کے خطوط پر بھی ہونے لگا۔ جنوری ۱۸۱۹ء میں اس نے لندن سے چلے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن بہر حال وہ اس مہینے کے آخیر تک ہیمپسٹیڈ میں رہا اور ۳ فروری کو یکایک بیمار پڑ گیا۔

سردی بے حد غضب کی پڑ رہی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ کیٹس کسی کام سے لندن گیا، اور واپسی میں بری طرح بھیگ گیا۔ جب وہ براؤن کے یہاں پہنچا تو اسے شدید بخار تھا۔ براؤن نے اسے فوراً بستر میں گھس جانے کو کہا۔ سونے کا کمرہ کبھی ٹھنڈا تھا، نہ براؤن نے اسے گرم کرنے کا خیال کیا اور نہ کیٹس نے۔ کیٹس کے منہ سے پہلی بار خون آیا۔ براؤن جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، اس نے براؤن سے کہا "یہ خون میرے منہ سے گرا ہے"۔ براؤن نے چادر پر خون کا دھبہ دیکھا۔ پھر کیٹس نے شمع منگائی اور دیر تک بڑے غور سے خون کے دھبے کو دیکھتا رہا۔ "میں خون کا رنگ پہچانتا ہوں۔ خون کا یہ قطرہ میری موت کا پروانہ ہے۔ میں اب نہیں بچوں گا"۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ براؤن صبح پانچ بجے تک کیٹس کے سرہانے بیٹھا رہا جب کیٹس سو گیا تو وہ وہاں سے اٹھا۔

جس وقت کیٹس کے منہ سے خون آیا اس وقت بھی شاید وہ فینی ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا (۱۷۶)۔ بیماری کے ابتدائی ایام میں بھی فینی کا خیال اسے پریشان کرتا رہتا تھا۔ اس واقعہ کی دوسری صبح کو اس نے فینی کے نام ایک رقعہ لکھا (۱۷۳)

یہ خط ذرا سا گنجلک معلوم ہوتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کیٹس کو شانت رکھنے کے لیے براؤن نے اس سے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ فینی برانی گھر پر نہیں ہے، کیٹس دن بھر کھڑکی میں سے برانی کی گاڑی آنے کا انتظار دیکھتا رہا۔ پھر اسے شک ہوا کہ کہیں براؤن چرکا تو نہیں دے رہا تھا براؤن نے دوسرا جھوٹ بولا، ممکن ہے فینی لوٹ کر گھر آگئی ہو، لیکن یہاں آنے کے لیے اپنی ماں کا انتظار کر رہی ہو آخر میں براؤن نے قبول لیا کہ فینی دن بھر گھر پر تھی، اور اس نے جھوٹ کہا تھا کیٹس نے اپنے خط کو اس طرح ختم کیا ہے:

"اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں اتنا شانت تھوڑی رہتا"

اب فینی برابر اُسے دیکھنے کے لیے آتی تھی۔ خطوط کا تبادلہ برابر ہو رہا تھا۔ فینی اُسے تحریر کی شب بخیر لکھ کر بھیجتی تھی۔ فینی کے رقعے شگفتہ اور بہت زیادہ رجائی ہوتے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کیٹس کو دل ہی دل میں اپنی موت کا یقین ہو چکا ہے۔

کیٹس کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی، اس نے منگنی توڑنے کا بھی خیال ظاہر کیا مگر فینی کو یہ گوارا نہ ہوا۔ موسم بہت خراب تھا۔ مسلسل بارش ہو رہی تھی کیٹس کو طرح طرح کے خیالات پریشان کر رہے تھے۔ اس نے فینی کو لکھا ہے کہ وہ ان لمحات میں اپنے بارے میں اور اپنے کارناموں کے بارے میں کیا سوچتا رہتا ہے (۱۸۶)

بیچ میں کیٹس کچھ ٹھیک ہو گیا، اس کے خطوط کا لہجہ پھر شگفتہ ہو گیا، لیکن ۸ رمارچ کو دل کا دورہ پڑا۔ غذا کی کمی کی وجہ سے اس کا دل بہت کمزور ہو گیا تھا براؤن بڑی لگن سے اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔ مگر براؤن بیمار کیٹس کی ذہنیت کو نہ سمجھ سکا؛ وہ فینی سے مذاق کرتا تھا، فینی بھی اپنا غم چھپانے کے لیے خوب زور زور سے ہنستی تھی، اور کیٹس فینی کو ہنستا دیکھ کر جلا کرتا تھا۔ اس نے ایک خط میں۔ (۱۹۳) میں فینی کو منع کر دیا کہ جب براؤن گھر میں رہے تو وہ اسے دیکھنے کے لیے نہ آیا کرے لیکن کیٹس کے دل میں رشک و حسد کا جذبہ بڑھتا ہی گیا اگر اس نے فینی کو ادھر اُدھر آنے جانے کی اجازت دے رکھی تھی، مگر وہ اس کی نقل و حرکت پر شبہ کرتا اور دل ہی دل میں کڑھتا۔

گرمیوں میں کیٹس کنٹش ٹاؤن چلا آیا، اور اپنے پرانے دوست لی ہنٹ کے ساتھ رہنے لگا۔ یہاں اسے کافی سکون ملا، مگر اس کی صحت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، کیٹس کو اپنی صحت کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی، وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی بہت مختصر رہ گئی ہے، بیماری نے اسے حد سے زیادہ شکی، حاسد اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ ہر وقت فینی براؤنی کی تصویریں اس کے ذہن میں گھومتی رہتی تھیں، اور وہ حسد کی آگ میں جلتا رہتا تھا۔ یہیں سے اس نے اپنے بے رحمانہ خطوط میں سے پہلا خط لکھا تھا (۲۰۲) یہ خطوط اس نے اپنے آپے میں نہیں لکھے تھے، فینی نے بھی اُسے ان خطوط کے لیے

معاف کر دیا تھا۔

کنٹش ٹاؤن سے اس نے آخری خط اگست ۱۸۲۰ء میں لکھا تھا (۲۲۴)، اور یہ خط فینی برانی کے نام اس کا آخری خط تھا۔ اس خط کو تحریر کرنے کے چند دن بعد وہ لی ہنٹ سے ایک ناخوشگوار واقعے کی وجہ سے برہم ہو کر واپس ہیمپسٹیڈ آگیا۔ یہاں اسے فینی برانی کی قربت نصیب ہوئی اور اس قربت کا نتیجہ ہے کہ اس عرصے میں اس نے فینی کے نام کوئی خط نہیں لکھا۔

۱۳۴ فینی براؤن کے نام - جمعرات ۸ جولائی ۱۸۱۹ء

پتہ - مس براؤن | ونٹ ورتھ پلیس | ہیمپسٹیڈ | مڈلکس

مہر - نیوپورٹ ۱ اور ۳ جولائی ۱۸۱۹ء

شانکلن

آئل آف وائٹ، جمعرات

مائی ڈیریسٹ لیڈی،

اچھا ہی ہوا کہ مجھے اس خط کے بھیجنے کا موقع نہ مل سکا، جو میں نے منگل کی رات کو تم کو لکھا تھا یہ خط روسو کی ہلائسے (HELOISE) کے خطوط سے بہت ملتا جلتا تھا۔ آج صبح میں زیادہ معقول ہوں ایک ایسی لڑکی کو خط لکھنے کے لیے جسے میں اتنا زیادہ پیار کرتا ہوں، میرے لیے صبح ہی کا وقت سب سے زیادہ مناسب ہے، کیوں کہ رات کو، جب کہ اکیلا دن ختم ہو جاتا ہے، اور جب کہ اکیلا، خاموش، اور سنسان کمرہ قبر کی طرح مجھے نگل لینے کے لیے منتظر ہوتا ہے، تو یقین جانو، میرے جذبات میں حشر بپا ہو جاتا ہے میں تمھیں وہ ہذیانی خطوط نہیں دیکھنے دوں گا جو ایسے لمحات میں میں نے لکھے ہیں، جن کا لکھنا کبھی میں ناممکن سمجھتا تھا، اور جہاں کہیں ایسی تحریر دیکھتا تھا مذاق اڑاتا تھا۔ میں یہ خطوط تمھیں اس لیے نہیں دکھاؤں گا کہ کہیں تم یہ نہ سمجھنے لگو کہ میں بہت زیادہ افسردہ ہوں، یا پاگل ہو گیا ہوں۔ میں اس وقت ایک کاشانے کے بے حد خوشگوار دریچے میں بیٹھا ہوا ہوں، دریچے سے خوب صورت پہاڑی منظر دکھائی دے رہا ہے، سمندر کی بھی ایک جھلک نظر آ رہی ہے، صبح بہت سہانی ہے، میں نہیں جانتا کہ میری روح کس قدر ہوتی، میں یہاں رہتے ہیں، اور غزالوں کی طرح اس حسین ساحل پر آوارہ گردی میں کس قدر حظ محسوس کرتا، اگر تمھاری یاد میری روح پر اتنا بھاری بوجھ نہ ہوتی۔ اِدھر بہت عرصے سے مجھے کوئی حقیقی مسرت نہیں نصیب ہوئی، کسی کی بیماری۔ کسی کی موت، ہمیشہ میرے لمحات کو تباہ کرتی رہی ہے —— اور اب جب کہ اس قسم کی کوئی چیز مجھے پریشان نہیں کر رہی ہے تو تم کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ، ایک دوسرے قسم کا درد مجھے کس قدر اذیت پہنچا رہا ہے۔ میری پیاری خود اپنے دل سے پوچھو

کیا تم نے مجھے اپنے دام میں گرفتار نہیں کر لیا ہے کیا تم نے میری ساری آزادی نہیں چھین لی ہے، اور کیا یہ ظلم کچھ کم ہے۔ تم اپنے جواب میں ان سب باتوں کا اعتراف کر لو نا! اور حتی الامکان میری تسلی کے لیے جو کچھ ہو سکے کرنا ——— اس خط کو پاپی کے پھولوں کا ایک ایسا گھونٹ بنا دو جو مجھے مخمور کر کے رکھ دے۔ نرم ترین الفاظ لکھنا اور انھیں چوم لینا تاکہ کم از کم میں اس مقام کو اپنے ہونٹوں سے مس کر سکوں جہاں تمھارے ہونٹ تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان ایسی خوب صورت لڑکی سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں، مجھے روشن سے بھی زیادہ روشن تر لفظ کی ضرورت ہے، مجھے حسین سے بھی زیادہ حسین لفظ کی ضرورت ہے۔ میں کبھی کبھی یہ تمنا کرنے لگتا ہوں کہ کاش ہم دو تتلیاں ہوتے، چاہے ہمیں موسم گرما کی صرف تین ہی دن کی زندگی نصیب ہوتی ——— تمھاری قربت کے ان تین دنوں کو میں بے پایاں مسرتوں سے بھر دیتا! اتنی بے پایاں مسرتوں سے کہ جو پچاس معمولی سالوں میں بھی نہ سما سکے۔ (اس طرح سے سوچنا خود غرضی ہے نا!) لیکن میں چاہے کتنی ہی خود غرضی کی باتیں سوچوں میں کبھی خود غرضی کر نہیں سکتا، جیسا کہ میں نے ہیمپسٹیڈ چھوڑنے سے دو ایک روز پہلے کہا تھا اگر میری قسمت کا پانسہ پلٹا تو میں ہرگز لندن واپس نہیں آؤں گا؛ چاہے میں اپنی ساری خوشیاں تمھاری ہی ذات میں مرکوز کر دوں، لیکن میں تم سے یہ امید نہیں کر سکتا کہ تم مکمل طور پر میری ہو سکو گی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر میں محسوس کرنے لگوں جتنی محبت اس وقت میں تمھارے لیے محسوس کر رہا ہوں، اتنی ہی محبت تم بھی میرے لیے محسوس کر رہی ہو تو شاید کل ہی تم سے ملنے کے لیے روانہ ہو جاؤں تاکہ تمھاری ہم آغوشی کی لذت سے سیراب ہو سکوں لیکن نہیں ——— مجھے امید اور قسمت کے سہارے دن گذارنے ہیں۔ چاہے بڑی سے بڑی آفت آئے، میری محبت میں فرق نہیں آئے گا ——— کچھ دن ہوئے میں نے چند سطریں پڑھی تھیں جو اب میرے کان میں گھنٹی کی طرح بج رہی ہیں۔

TO SEE THOSE EYES I PRIZE ABOVE MY OWN.

DART FAVOUR ON ANOTHER ———

AND THOSE SWEET LIPS (YIELDING IMMORTAL NECTAR)

BE GENTLY PRESSED BY ANY BUT MYSFLF ——

THINK, THINK FRAN CESED, WHAT ACURSEDHINC

IT WERE BEYOND EXPRESSION (1)

فوراً جواب دو۔ اس مقام سے کوئی ڈاک نہیں ہے، اس لیے تم پر پتہ لکھنا پوسٹ آفس، نیوپورٹ جزیرہ وانٹ۔ میں خود جانتا ہوں کہ رات ہونے کے قبل ہی میں تم کو اتنا سرو خط لکھنے پر اپنے آپ کو لعنت ملامت کروں گا! لیکن جہاں تک میرے حواس میرا ساتھ دیں، یہی کرنا زیادہ بہتر ہے یہ فاصلہ جتنی بھی اجازت دے، مجھ پر مہربان رہو۔

تمھارا سچے کیٹس۔

اپنی ماں کو میرا اسلام کہنا، مارگریٹ کو پیار اور اپنے بھائی کو میری طرف سے یاد کر لینا ——
اگر تم چاہو تو (۲)

---

(۱) یہ سطور PHILIP MASSINGER کی DUKE OF MILAN کے پہلے ایکیٹ تیسرے سین میں SFORZA کی زبان سے ادا کیا گیا ہے۔

(۲) فینی کے باپ مسٹر سیموئل براؤن ایک آزاد پیشہ شخص تھے۔ فینی ابھی بچی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور پھر مسز براؤن اپنے تینوں بچوں، فینی، مارگریٹ اور سیموئیل کے ساتھ ہیمپسٹیڈ میں رہنے لگیں۔ سیموئیل فینی کے بعد تھا، اور ۱۸۱۹ میں اسکول میں پڑھتا تھا مارگریٹ اس وقت بچی تھی۔

۱۳۶ فینی براؤن کے نام۔ جمعرات ۸ جولائی ۱۸۱۹ء

پتہ۔ مس براؤن | ونٹ ورتھ پلیس | ہیمپسٹیڈ | مڈلکس۔

مہر۔ نیوپورٹ اور ۱۰ر جولائی ۱۸۱۹ء

آٹھویں جولائی

مائی سویٹ گرل،

تمھارے خط سے مجھے بے انتہا مسرت پہنچی۔ اتنی مسرت کہ دنیا کی کوئی چیز، سوائے تمھارے نہیں پہنچا سکتی، میں تو حیران ہوں کہ ایک شخص جو میرے سامنے نہیں ہے، بھلا کیسے میرے ہوش حواس پر اس قدر شدت سے تسلط جما سکتا ہے، چاہے تمھارے بارے میں کچھ سوچوں یا نہ سوچوں، تمھارا سایہ مجھ پر پڑتا رہتا ہے، اور انجانے نرم جذبات دبے پاؤں دل میں داخل ہوتے رہتے ہیں میرے سارے تفکرات، میرا انتہائی ناخوشگوار شب و روز، بھی میرے اس شدید عشق کا علاج نہ کر سکے جو مجھے حسن سے ہے بلکہ ان سب باتوں نے تو اس عشق کو اور شدید بنا دیا ہے اور اب میں انتہائی بے چینی محسوس کر رہا ہوں کہ تم میرے پاس نہیں ہو۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں صبر کی ان منزلوں سے گزر رہا ہوں جب زندگی زندگی نہیں رہ جاتی۔ میں اس کے پہلے جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ محبت، جسے تم نے بیدار کیا ہے، کیا شے ہوتی ہے میں ایسی شدید محبت میں یقین ہی نہیں رکھتا تھا، میرا تخیل ہی اس سے گریزاں رہتا تھا کہ کہیں یہ مجھے جلا کر نہ رکھ دے۔ لیکن اگر تم مجھ سے بھرپور پیار کرتی ہو، تو اگرچہ کچھ نہ کچھ آگ تو ضرور پیدا ہوگی، لیکن ہم اسے مسرتوں کی شبنم سے کم کر دیں گے، اور یہ آگ قابل برداشت ہو جائے گی۔ تم نے بھیانک لوگوں کا ذکر کیا ہے اور پوچھا ہے کہ کیا ہماری دوبارہ ملاقات کا انحصار ان ہی لوگوں پر ہے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، میری پیاری، اس معاملے میں۔ تم میرے دل و دماغ پر اس طرح چھائی ہوئی ہو کہ، جب میں یہ دیکھنے لگتا ہوں کہ اس سے مجھے کوئی نقصان پہنچنے والا ہے، تو میں اپنا ناصح آپ ہی بن جاتا ہوں۔ میں تمھاری آنکھوں میں سوائے مسرت کے تمھارے ہونٹوں پر سوائے محبت کے اور تمھارے خرام میں سوائے خوشی کے اور کوئی چیز نہیں دیکھ سکتا ہوں تمھیں ان تفریحات میں گھرا دیکھنا چاہتا ہوں جو تمھارے مزاج اور رجحان کے مطابق ہوں

تاکہ ہماری محبت، رنج و تفکرات کا سرچشمہ بننے کے بجائے، خوشبوؤں کے گہوارے میں ایک مسرت خیز چیز بن سکے۔ (یہ سب ٹھیک ہے) مگر مجھے شک ہے کہ جب بدترین حالات آئیں گے تو پتہ نہیں میں اتنا فلسفی رہ بھی پاؤں گا یا نہیں کہ آپ اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی پیروی کر سکوں میں کیوں نہ تمہارے حسن کی باتیں کروں؟ کیوں بغیر اس کے میں تم سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا اس شدید عشق کا منبع جو مجھے تم سے ہے میری رائے میں صرف حسن ہی ہو سکتا ہے۔ ایک اور قسم کا بھی عشق ہو سکتا ہے، اور میں اس قسم کے عشق پر ناک بھوں نہیں چڑھاتا، بلکہ اس کے لیے بھی میرے دل میں بڑی عزت ہے، اور میں دوسروں کے اس قسم کے عشق کو سراہنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ لیکن اس عشق میں وہ فراوانی کہاں، وہ شگفتگی کہاں، وہ جادو کہاں جو میرے عشق میں ہے۔ لہذا مجھے اپنے جمال کی باتیں کرنے دو، چاہے اس میں خود مجھے خطرہ ہی کیوں نہ ہو کہ کہیں تم اس حسن کا جادو دوسروں پر نہ آزمانے لگو۔ تم لکھتی ہو کہ کہیں میں یہ نہ سمجھوں کہ تم مجھ سے عشق نہیں کرتیں ــــــ یہ کہہ کر تم نے اپنے پاس آنے کی خواہش اور زیادہ بھڑکا دی، میں یہاں اپنی صلاحیتوں کا استعمال بڑی محنت سے کر رہا ہوں، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ کچھ آزاد نظم کچھ پابند نظم نہ گھسیٹتا ہوں۔ اور یہاں مجھے اعتراف کر لینا چاہیئے (کیوں بات میں بات نکل آئی ہے) کہ میں تم سے اس لیے اور بھی زیادہ محبت کرتا ہوں کہ تم مجھ سے صرف میری خاطر عشق کرتی ہو میری کسی اور چیز کے خاطر نہیں۔ میں ایسی عورتوں سے بھی ملا ہوں۔ نظم سے شادی کرنا اور ناول کے عوض بک جانا گوارہ کر لیتی ہیں' ہاں وہ شہاب ثاقب میں نے دیکھا، کاش یہ اس بات کا شگون ہو کہ رائس شفایاب ہو جانے گا۔ اس کی بیماری نے اسے اور اداس سا تھی بنا دیا ہے، اور وہ اپنے محسوسات پر قابو پانے کے لیے اور انھیں مجھ سے چھپانے کیلیے زبردستی کی لطیفے بازی کرتا رہتا ہے میں نے تمہاری ساری تحریر پر بوسے دیے اس امید میں کہ تمھارے لمس کا شہد اب بھی اس پر ہوگا ــــ تمھارا خواب کیا تھا؟ تم مجھے خواب بتاؤ، میں تعبیر تفسیر بتاؤں گا۔

میری پیاری! ہمیشہ تمھارا جان کیٹس۔

تاخیر کا الزام مجھے مت دو ــــ یہاں ہر روز خط بھیجنے کی سہولت نہیں حاصل ہے۔ فوراً جواب دو۔

۱۳۹ فینی براؤنی کے نام۔ اتوار ۲۵ جولائی ۱۸۱۹ء

پتہ۔ مس براؤنی | ونٹ ورتھ پلیس | ہیمپسٹیڈ | مڈلکس۔

مہر۔ ۲۷ جولائی ۱۸۱۹ء

اتوار کی رات۔

مائی سویٹ گرل۔

تم نے التجا کی تھی کہ میں سنیچر کو تمھیں خط لکھوں۔ امید ہے تم نے مجھے اس حکم عدولی کے لیے معاف کر دیا ہوگا اس چھوٹے سے کمرے میں ہم چاروں صبح سے شام تک تاش کھیلتے رہتے ہیں، خط لکھنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ اب راکس اور مارٹن کہیں چلے گئے ہیں، اب میں بالکل آزاد ہوں۔ تم نے اپنی صحت کے بارے میں مجھے جو کچھ لکھا، براؤن نے اس کی تصدیق کر کے مجھے اور اداس کر دیا ہے؛ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں اس وقت تمھارے پاس آنے کے لیے میرا دل کتنا تڑپ رہا ہے اس ایک گھنٹے پر زندگی قربان ہے —— کیا رکھا ہے اس دنیا میں؟ میں کہتا ہوں تم تصور ہی نہیں کر سکتیں، یہ ناممکن ہے کہ میں جس نظر سے تم کو دیکھتا ہوں اسی نظر سے تم بھی مجھ کو دیکھو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا اگر آج شام میں ذرا ادھر ادھر گھوم لوں تو تم مجھے معاف کر دوگی نا! کیوں کہ دن بھر میں ایک انتہائی بجر و قسم کی نظم پر کام کرتا رہا ہوں، دوسری بات میں تمھاری محبت میں بری طرح گرفتار ہوں —— یہ دونوں عذر کافی ہوں گے یقین جانو، تمھیں اپنے دل میں جگہ دینے میں مجھے کچھ زیادہ دن نہیں لگے۔ اسی ہفتے میں، جب کہ پہلی بار میں نے تم کو دیکھا تھا، میں نے اپنے آپ کو تمھارا تابعدار لکھ دیا تھا۔ لیکن وہ خط میں نے جلا دیا تھا، کیوں کہ دوسرے ہی دن جب میں تم سے ملا تو میں نے محسوس کیا تم مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں کر رہی ہو۔ اگر تم پہلی نظر میں کسی شخص کے لیے وہ جذبہ محسوس کرنے لگو جو میں نے تمھیں دیکھ کر محسوس کیا تھا، تب تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ خیر چلو میں تم سے اس کے لیے جھگڑوں گا نہیں، بلکہ اگر اس قسم کی کوئی بات ہوئی تو خود اپنے ہی سے نفرت کرنے لگوں گا —— لیکن اس وقت میں ضرور پڑوں گا۔ اگر وہ آدمی تمھارے اتنا خوب صورت نہ ہوا۔ شاید میں بہت زیادہ جھگڑالو ہوا جا رہا ہوں اچھا اگر یہ بات ہے تو مجھے اپنے سامنے دوزانو سمجھو، خاص طور سے اس لیے بھی کہ اب میں تمھارے خط کے

اس جملے کا ذکر کروں گا جس سے مجھے دکھ پہنچا ہے، تم مسٹر سیورن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہو۔ لیکن غالباً تم یہ جان کر مطمئن ہو جاؤ کہ میں نے تم کو تمھارے دوست سیورن سے کچھ زیادہ ہی سراہا تھا۔ پیاری مجھے تو یقین نہیں آتا کہ مجھ میں کوئی ایسی چیز تھی یا ہے جسے سراہا جا سکے۔ کم از کم جہاں تک نظر جاتی ہے ——— مجھے سراہا جا ہی نہیں سکتا میں سراہے جانے کی چیز ہی نہیں ہوں۔ لیکن تم ہو۔ میں تم سے عشق کرتا ہوں، اور میں تمھیں تمھارے حسن کی بے پناہ قصیدہ خوانی کے علاوہ اور دے ہی کیا سکتا ہوں۔ مردوں میں میری حیثیت وہی ہے جو بیٹھی ناک والی، اور ملی ہوئی بھوؤں والی ..... کی ہوتی ——— میں ان کو بالکل گھاس سمجھتا ہوں ——— تاوقتیکہ ان میں سے کسی کے دل میں وہی آگ فروزاں ہو جو میرے دل میں ہے۔ اپنی چہل قدمی کے دوران میں دو ہی باتیں ہیں جن کے متعلق میں پیہم سوچتا رہتا ہوں، ایک تمھاری رعنائی اور دوسری اپنی موت کا وقت۔ کاش کہ یہ دونوں بیک وقت میرے قبضے میں ہوتیں میں دنیا سے نفرت کرتا ہوں۔ دنیا میری خود ارادیت کے شہپروں کو ضرورت سے زیادہ سنگسار کرتی ہے کاش کہ مجھے تمھارے ہونٹوں سے ایسا زہر ملتا کہ میں اس دنیا سے باہر پہنچ جاتا۔ کسی اور کے ہونٹوں سے یہ زہر میں نہیں لوں گا مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کیسے میں سارے حسن سے ماسوا تمھارے حسن کے، بے نیاز ہو گیا ہوں ——— اور ایک وہ دن تھا کہ معمولی سی بھی میرے لیے دل چسپی کی ایک دنیا رکھتی تھی۔ اب اس کے آگے تمھیں اور نرم الفاظ کیا لکھوں ——— تم نے آگے خط میں کیا لکھا ہے میں نہیں پڑھوں گا ——— اور نہ اب یہاں کچھ اور کہوں گا اگر تمھاری ذکر کی ہوئی کوئی اور بات جواب کے قابل ہوئی تو اس کا جواب بعد میں تحریر کروں گا۔ کیوں سیکڑوں خیالات کی وجہ سے میری توجہ ہٹ ہٹ جا رہی ہے۔ آج رات میں تمھیں وینس تصور کروں گا اور تمھارے ستارے کی پوجا کروں گا، پوجا کروں گا، پوجا کروں گا بالکل کافروں کی طرح۔

میری انجم، ہمیشہ تمھارا

جان کیٹس

۳۷۔ فینی براؤن کے نام۔ (جمعہ ۴ر فروری ۱۸۲۰ء)

پتہ۔ مس براؤن۔

مہر۔ کوئی نہیں۔

ڈیرسٹ فینی، جس وقت تم واپس آؤگی اسی وقت میں یہ رقعہ تمھیں بھیج دوں گا۔ لوگ کہتے ہیں کہ کچھ عرصے کے لیے مجھے اس کمرے میں قید رہنا پڑے گا۔ یہ احساس کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو، اس مکان کو جو تمھارے مکان کے بغل میں ہے، ایک بہت پیارا قید خانہ بنا دے گا۔ تم کو برابر آکے مجھے دیکھ جانا چاہیئے۔ آج شام کو بھی۔ بالکل ـــ اور ہاں تم میرے دھیمی آواز میں بات کرنے کا خیال مت کرنا۔ کیوں مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اگرچہ میں بول سکتا ہوں۔

ہمیشہ تمھارا۔

سوئیٹ کو۔

جے کیٹس۔

الٹو

غالباً تمھاری ماں گھر پر نہیں ہیں، اور تم کو

آج شام کو تم آؤ، اور اپنے کل آنے کا مژدہ بھی مجھے سناؤ۔

براؤن کہہ رہا تھا کہ تم بالکل باہر رہیں، دن بھر گاڑی کے آنے کا انتظار کرتا رہا، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں دن بھر شانت تھوڑی رہتا۔

۶۷ افلینی برائن کے نام ۔ (جمعرات ۱۰ر فروری ۱۸۲۰ء)

پتہ ۔ مس برائن ۔
مہر ۔ کوئی نہیں ۔

مائی ڈیرسٹ گرل ۔

اگر بیماری تمھاری آنکھوں میں ایسی پیاری تبدیلی پیدا کر سکتی ہے، تب تو میں یہ خواہش کرنے لگوں گا کہ کچھ دن اور بیمار رہوں ۔ کاش کہ کل رات تمھارے باہر جانے سے پہلے مجھے تمھارا پرچہ مل گیا ہوتا، تو میں تمھیں یقین دلاتا کہ میں تمھاری سرد مہری کے شبہے سے کتنا دور ہوں ۔ تم کو اس شخص سے تھوڑی سی خاموشی برتنے کا بالکل حق حاصل ہے جو تم سے اتنی صفائی سے گفتگو کرتا ہے ۔ تمھیں یقین رکھنا چاہیئے تم یقین کرو گی، تمھیں یقین کرنا پڑے گا ——— کہ میں تمھارے متعلق کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا، کوئی ایسی بات نہیں کر سکتا، کوئی ایسا خیال نہیں رکھ سکتا، جس کا سرچشمہ میری محبت نہ ہو، وہ محبت جو اتنے عرصے سے مجھے مسرت اور اذیت پہنچا رہی ہے ۔ رات کو، پھر دورہ پڑا تھا ——— اس وقت کاسنی خون کا ایک دھارا اس بری طرح سے میری حلق میں آیا، کہ میرا دم گھٹ کے رہ گیا ——— میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں سمجھنے لگا کہ اب میں نہیں بچوں گا، اور اس لمحے میں بھی میں سوائے تمھارے اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا اور جب میں نے براؤن سے کہا کہ یہ بڑی مہلک علامت ہے، جب بھی میں تمھارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا، یہ صحیح ہے کہ دو تین دن اور باتیں بھی ذہن میں داخل ہو رہی ہیں ——— خیر میرا اپنی صحت بہار، اور تمھارے ساتھ پرانی چہل قدمیوں کا آسرا لگائے ہوئے ہوں ۔

تم سے محبت کرنے والا
جے ۔ کے ۔

۱۸۱ فینی براؤن کے نام - (فروری ۱۸۲۰)

پتہ - مس براؤن

کوئی مہر نہیں -

مائی ڈیر فینی

تم اپنی ماں سے کہو کہ تم جو رات کو مجھ کو خط لکھتی ہو تو اس سے میری صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ پتہ نہیں کیوں تمہارے کل والے پرچے میں وہ پچھلی بات نہیں تھی۔ تم کو خوش اور ہنستا بولتا دیکھنے سے مجھے بڑی تسکین ہوتی ہے —— لیکن مجھے یہ یقین کرنے دو کہ تم جتنا میری شفایابی کے بعد خوش ہوگی آج کل اس کی آدھی بھی خوش نہیں ہو۔ میری پیاری، جب میں ماضی پر نظر کرتا ہوں، اور ان اذیتوں اور تکلیفوں کو دیکھتا ہوں، جو میں جزیرہ وائٹ جانے کے دن سے اب تک برداشت کر رہا ہوں، اور ان مسرتوں کا جائزہ لیتا ہوں، جو کسی کسی دن میرے حصے میں آئیں، لیکن بدلے میں پھر وہی پریشانیاں لائیں، تو میں اس حسن پر حیرت کرنے لگتا ہوں جس نے مسلسل اتنے عرصے تک مجھے مسحور رکھا ہے! یہ خط بھیجتے وقت میں سامنے والی نشستگاہ میں رہوں گا، اور تمہیں ایک منٹ کے لیے باغ میں دیکھنے کے لیے انتظار کروں گا۔ میرے تمہارے درمیان بیماری کتنی بڑی دیوار بن گئی ہے! اب جو راتیں آنکھوں میں کٹنے لگی ہیں اور طرح طرح کے فکروں نے آگھیرا ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ دوسرے خیالات بھی ذہن میں آرہے ہیں "اگر میں مر گیا" میں خود سے کہتا ہوں، تو میں کوئی امر کارنامہ اپنے پیچھے نہیں چھوڑ کر مروں گا —— کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑ کر مروں گا جسے یاد کرکے میرے احباب نازاں ہوں —— مگر میں نے ہر شے میں حسن کے اصول سے محبت کی ہے، اور اگر مجھے وقت ملتا تو میں اپنے آپ کو امر بنا سکتا تھا۔ جب میں صحت مند تھا تو اس قسم کے خیالات کی رو بے حد کمزور ہوا کرتی، اور میری ہر نبض صرف تمہارے لیے دھڑکا کرتی تھی۔

خدا تم پر رحمت کرے

جان کیٹس

۲۲۰. فینی برانی کے نام۔ بدھ (۵ جولائی ؟) ۱۸۲۰ء

نہ کوئی پتہ اور نہ مہر

بدھ۔ صبح

مائی ڈیرسٹ گرل

میں آج صبح سے ہاتھ میں کتاب لیے اِدھراُدھر گھوم رہا ہوں، لیکن حسب معمول میں صرف تمھارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کاش کہ یہ بات ذرا میں خوشگوار طور پر کہہ پاتا۔ مجھے دن رات اذیت پہنچ رہی ہے لوگ میرے اٹلی جانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اتنے طویل عرصے کے لیے تم سے جدا رکھا گیا تو میں ہرگز اچھا نہیں ہو سکتا، لیکن اس ساری عقیدت کے باوجود جو مجھے تم سے ہے، میں خود کو تم پر اعتماد کرنے پر تیار نہیں کر پاتا جب تمھاری ماں یہاں آئیں گی تو میں بڑی صفائی سے اُن سے پوچھ لوں گا کہ تم مسز ڈلکے کے یہاں گئی تھیں یا نہیں، کیوں وہ مجھے تسکین دینے کے لیے کہہ دیں گی نہیں، میں واقعی اب گور ہو گیا ہوں اور اب موت ہی میں میری نجات ہے؛ جو کچھ بیت چکا ہے میں اُسے ہرگز نہیں بھول سکتا۔ خیر جہاں تک ہو سکے گا میں اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ جب تم براؤن کے ساتھ چہل کرتی تھیں، تو کیا تمھارے دل کو اس کی آدھی اذیت بھی پہنچی تھی جتنی کہ میرے دل کو پہنچی تھی۔ براؤں بہت اچھا آدمی ہے — مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ لمحہ بہ لمحہ وہ مجھے موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔ اور اب میں اس ایک ایک لمحے کا زخم اپنے پہلو میں محسوس کر رہا ہوں، اور اسی وجہ سے، حالانکہ اس نے میری بڑی خدمت کی ہے حالانکہ میں اس کی دوستی اور محبت سے واقف ہوں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی مدد کے بغیر میں ایک ایک پیسے کو محتاج ہوتا، لیکن نہ اب میں اس سے ملوں گا۔ اور نہ اس سے بات کروں گا۔ میرے دل کو اگر فٹ بال سمجھا جاتا ہے تو میں یقیناً اس کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کروں گا۔ تم لکھو گی کہ یہ پاگل پن ہے۔ میں نے تمھاری ہی زبانی سنا ہے کہ چند سالوں کا انتظار (شادی سے قبل) کوئی ایسی بات نہیں — کیونکہ ہو تمھارے لیے سیکڑوں تفریحات ہیں۔ — تمھارا ذہن مجھ سے دور رہتا ہے — تم میری طرح کسی ایک خیال کی اسیر نہیں ہو — اور ایسا ہو بھی تو کیوں کر؟ تم میری تمناؤں کا معراج ہو — میرے لیے

اس کرے کی ہوا غیر صحت مند ہے جس میں تم نہ ہو۔ لیکن میں تو ایسا تمہارے لیے نہیں ہوتا ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ تم انتظار کر ہی نہیں سکتیں ۔۔۔ تمہاری ہزاروں مصروفیات ہیں ۔۔۔ تم تو میرے بغیر بھی خوش رہ سکتی ہو کوئی پارٹی ہو، کوئی اور چیز ہو، تمہارے یہ دن بھر کے لیے کافی ہے۔ یہ مہینہ کیا گزرا؟ کس کس سے مسکرا کر ملیں؟ ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ میں وحشی ہوں۔ تم اُس طرح سے نہیں محسوس کرتیں جیسے کہ میں کرتا ہوں ۔۔۔ تم جانتی ہی نہیں کہ محبت کرتے کس طرح ہیں ۔۔۔ ممکن ہے کہ کبھی جان جاؤ ۔۔۔ مگر تمہارا وقت نہیں آئے گا، ذرا اپنے دل سے پوچھو کہ کیٹس کی وجہ سے اپنی تنہائی میں تم کبھی اداس بھی رہیں؟ جہاں تک میرا تعلق ہے، اس سارے عرصے میں، میری حالت ایک قتیل ایک شہید کی رہی ہے، اور اسی وجہ سے میں یہ کہہ بھی رہا ہوں، اذیتوں نے یہ سب اعترافات مجھ سے کرا لیے ہیں۔ میں تمھیں اس مسیح کی قسم دیتا ہوں جس میں تم یقین رکھتی ہو، کہ اگر تم نے اس مہینے بھر میں کوئی ایسا کام کیا، جسے دیکھ کر مجھے اذیت ہوئی، تو تم ہرگز ہرگز اس خط کا جواب مت دینا۔ ممکن ہے تم بدل گئی ہو ۔۔۔ اگر تم نہیں بدلی ہو ۔۔۔ اگر تم رقص گاہوں میں اب بھی وہی برتاؤ کرتی ہو جس طرح کہ میں نے تم کو دیکھا تھا ۔۔۔ تو میں زندہ نہیں رہنا چاہتا ۔۔۔ اگر تم نے وہی کچھ کیا ہے تو خدا سے میری دعا ہے کہ یہ رات میری آخری رات ہو۔ میں تمہارے بغیر نہیں زندہ رہ سکتا مجھے صرف "تم" نہیں چاہئے۔ مقدس "تم" چاہیئے "پاکیزہ" "تم" چاہیئے۔ سورج نکلتا ہے۔ اور ڈوب جاتا ہے، دن گزرتا ہے، اور تم اپنے معمول و مزاج کے مطابق زندگی گزار رہی ہو ۔۔۔ مگر تم کیا جانو صرف ایک دن میں مجھ پر کیا کیا گزر جاتی ہے ۔۔۔ سنجیدہ بنو، محبت کھلونا نہیں ہے ۔۔۔ اور ہاں اگر تم آئینے کی طرف شفاف ضمیر سے جواب نہیں دے سکتیں تو جواب مت دو ۔۔۔ میں تمہارے بغیر مر سکتا ہوں لیکن ۔۔۔

ہمیشہ تمہارا
جے کیٹس

۲۲۳ فینی برانی کے نام (جولائی ۱۸۲۰ء)

پتہ۔ مسز برانی۔

کوئی مہر نہیں۔

مائی ڈیر فینی

آج صبح ہی سے میرا دماغ سخت الجھن میں ہے، ہزاروں باتیں ذہن میں آرہی ہیں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ خیر یہ تو یقینی ہے کہ کسی اور چیز سے محظوظ ہونے کے بجائے، آج تمھیں خط ہی لکھوں گا، حالانکہ اس کام سے رنج و افسوس ہی ہوگا۔ میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے تم سے انتہائی حدوں تک محبت کی ہے۔ کاش کہ تم محسوس کر پاتیں کہ میں تمھارے خط و خال تمھاری چال ڈھال اور تمھارے لباس کے متعلق ہر ہر پہلو سے، کتنے سوز و گداز کے ساتھ مسلسل سوچتا رہتا ہوں، میں دیکھتا ہوں، تم صبح ہی صبح چلی آرہی ہو، میں دیکھتا ہوں کہ تم دریچے پر مجھ سے ملاقات کر رہی ہو ——— میں ہر ہر بات، ہر ہر چیز کو دیکھتا رہتا ہوں لامختم طور پر۔ اگر کوئی خوشگوار بات یاد آتی ہے تو خوشگوار قسم کی تکلیف ہوتی ہے، اگر کوئی ناگوار بات یاد آتی ہے تو ناخوشگوار قسم کی۔ تم شکایت کرتی ہو کہ میں نے قول فعل ہر طرح سے تمھارے ساتھ برا سلوک کیا ہے ——— مجھے افسوس ہے ——— کبھی کبھی مجھے انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے تم کو کیوں ناراض کیا ——— میرا عذر یہ ہے کہ یہ الفاظ میرے شدت جذبات نے اگلوائے تھے۔ اب میں ضرور نادم ہوتا، اپنے سارے شبہات کو رد کر ڈالتا، اور اپنی دل و جان کو تمھارے سپرد کر دیتا، اگر تمھارے خط کے کچھ حصے اس میں مانع نہ ہوتے۔ کیا تم یہ ممکن سمجھتی ہو کہ میں تم کو کبھی چھوڑ سکتا ہوں؟ تم جانتی ہو کہ میں تمھارے اور اپنے بارے میں کیا سوچتا رہتا ہوں۔ میرے دوست تم پر ہنستے ہیں، میں ان میں سے کچھ کو جانتا ہوں، جس دن باقی سبھوں سے واقف ہو جاؤں گا، تو میں ان کے بارے میں دوست یا آشنا کی حیثیت سے سوچنا ہی چھوڑ دوں گا۔ میرے سارے دوستوں نے ہر معاملے میں میرے ساتھ بہتر سلوک کیا، سوائے ایک معاملے کے اور اس معاملے میں وہ سب میرے کردار کے متعلق جستجو کرنے لگے، میرے وہ راز جاننے کی کوشش

کرنے لگے، جنھیں میں مر جاؤں تو بھی کسی سے بیان نہ کروں۔ اسی وجہ سے میں ان لوگوں کے متعلق اچھے خیالات نہیں رکھ سکتا۔ اب تو میں اُن میں سے کسی سے ملنے تک کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر موضوعِ سخن خود میری ہی ذات ہو تو میں کیسے اُن غیبتوں کا دوست ہو سکتا ہوں۔ خدایا کتنی شرم کی بات ہے ہماری محبت کو خوردبین کے نیچے کھینچا جا رہا ہے۔ اُن کے تمسخر کا تم پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے (کسی دن میں تمھیں بتاؤں گا یہ لوگ کیوں تمسخر اڑاتے ہیں۔ کیوں کہ مجھے شک ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دوستی صرف جتاتے ہیں، اور میں اس مکر کو بھی جانتا ہوں) یہ وہی لوگ ہیں جو تمھیں پسند نہیں کرتے جو تم سے تمھارے حسن کی وجہ سے رشک کرتے ہیں، جو مجھے تم سے جدا کرنا چاہتے ہیں، جو مسلسل تمھارے سلسلے میں میری حوصلہ شکنی کرتے رہتے ہیں۔ لوگ تو بدلہ لینے پر آمادہ ہوتے ہیں —— اُن کی، کوئی پرواہ مت کرو —— تم کچھ مت کرو، صرف مجھ سے محبت کرتی رہو۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ زندگی خوشگوار ہو گی اور موت تکلیف دہ نہیں ہو گی، تو میں حیاتِ جاودانی میں یقین رکھنے کی خواہش کرتا، میں تمھیں ہمیشہ کے لیے ہرگز الوداع نہیں کہہ سکتا۔ کہیں میری قسمت میں یہ ہو کہ میں اس دنیا میں تمھارے ساتھ خوشی کی گھڑیاں گزاروں —— تو لمبی سے لمبی زندگی بھی کتنی مختصر معلوم ہو گی۔ نہیں میں حیاتِ جاودانی میں یقین رکھنا چاہتا ہوں —— میں چاہتا ہوں کہ میں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہوں۔ اُن نامعقولوں سے اپنی گفتگو میں میرا نام نہ آنے دینا؛ مانا کہ میں کچھ بھی نہیں، لیکن تمھارا چاہنے والا تو ہوں، یہی وجہ کافی ہے کہ تم میرے نام کی تقدیس کا لحاظ رکھو اور ایسی صحبت میں اس کا ذکر نہ کرو۔ اگر میں نے ستم کیے ہیں۔ بے انصافیاں کی ہیں، تو میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرا عشق اس ستم سے بہت زیادہ عظیم ہے؛ یہ زیادتی تو ایک پل کی تھی مگر میری محبت تو ہمیشہ، قائم رہے گی۔ تمھارا نام کبھی میرے ہونٹوں پر نہیں آتا —— میرا نام بھی اپنے لب پر نہ آنے دینا، —— وہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے کم از کم میرا خط پڑھنے کے بعد مجھے دیکھنے کا ارادہ کر لینا، میں چل پھر تو سکتا ہوں —— مگر ہمت نہیں ہوتی۔ تم سے دو بارہ جدا ہونے میں کتنی تکلیف ہو گی۔ میری پیاری میں تمھیں دیکھنے سے ڈرتا ہوں؛ مجھ میں طاقت ہے مگر تمھیں دیکھنے کی تاب نہیں ہے

کیا میرے بازو پھر تمہارے گرد حمائل نہ ہو سکیں گے۔ میری پیاری ہم جب تمہارے پہلے خط کا خیال کرتا ہوں تو کتنا مسرور ہو جاتا ہوں۔ بس مجھے یقین دلادو کہ تم دل وجان سے میری ہو، اور میں آرام سے مر جاؤں گا ورنہ زندگی بھی عذاب ہو جائے گی اگر تم مجھے بے رحم سمجھتی ہو — اگر تم سمجھتی ہو کہ میں نے تم پر ستم توڑے ہیں — تو خدارا پھر غور کرو میرے دل کے اندر جھانکو — میں ایک بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں کیسے تمہارے ساتھ زیادتی کر سکتا ہوں ؟ کیسے تمہیں چھوڑ دینے کی دھمکی دے سکتا ہوں ؟ اگر دھمکی دی بھی ہوگی تو دھمکی کی نیت سے نہیں، یہ میری بیماری اور آزار کا قصور ہوگا — میری حسین ترین، میری فرشتہ فطرت، خدا کے لیے مجھے اس قدر بیہودہ آدمی نہ سمجھو۔ میں جہاں تک ہو سکے گا اس بیماری میں صبر کروں گا اور اپنی محبت میں یقین رکھوں گا۔

مائی ڈیرسٹ

ہمیشہ تمہارا

جان کیٹس

۲۲۴- فینی براؤنی کے نام (اگست ۱۸۲۰ء؟)

نہ پتہ نہ مہر

میں نے یہ آخر تک نہیں لکھا تھا،

کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ (۱)

مائی ڈیرسٹ گرل

کاش کہ تم کوئی ایسی راہ نکالتیں کہ میں تم سے ملے بغیر ذرہ برابر بھی خوش رہ سکتا۔ اب تو لحظہ بہ لحظہ میں تمہاری طرف اور زیادہ کھنچا چلا آرہا ہوں اس کے علاوہ ہر چیز کا ذائقہ ایسا لگتا ہے جیسے بھوسی! میں اب اٹلی جانا تقریباً ناممکن سمجھتا ہوں ـــــ بات دراصل یہ ہے کہ میں تم سے جدا نہیں ہو سکتا اور اب مجھے اُس وقت تک پل بھر کے لیے بھی چین نہیں مل سکتا جب تک کہ تقدیر ہم دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ ملا دے۔ مگر اب میں اس طرح نہیں مل سکتا۔ ایک شخص جو کہ صحت مند ہے، جیسی کہ تم ہو۔ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ مجھ جیسے آدمی کے اعصاب و مزاج کن کٹھن مرحلوں سے گزر رہے ہیں تمہارے دوست کس جزیرے پر آرام کرنے کی صلاح دے رہے ہیں؟ میں وہاں تمہارے ساتھ اگر اکیلا گیا تب تو خوش رہ سکتا ہوں۔ اگر ساتھی سنگی کا جھگڑا ہے تو مجھے اعتراض ہے۔ ان نوآبادوں کی صحبت، جن کا غیبت و رشک و حسد کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں ہے، ناقابل برداشت ہوتی ہے مسٹر ڈلکے مجھے کل دیکھنے آئے اور بجائے آرام کے بے انتہا دکھ پہنچا گئے۔ اب میں ان لوگوں کی صحبت ہرگز نہیں برداشت کر سکتا جو ایم کالج اور ونٹ ورتھ پلیس پر مجھے ملا کرتے تھے اگر میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا

---

(۱) ایسا لگتا ہے کہ "مائی ڈیرسٹ گرل" سارا خط لکھ لینے کے بعد لکھا گیا ہے کہ کہیں اس کے پاس آنے والے کی نگاہ نہ پڑ جائے اتفاق سے۔ قیاس غالب ہے کہ فینی براؤنی کے نام کیٹس کا یہ آخری خط ہے سیلورن کا بیان ہے کہ دوران سفر میں اور اٹلی کے پہنچنے کے بعد بھی کیٹس فینی کو کوئی خط نہ لکھ سکا، بس ایک خط اس کی ماں کے نام ضرور لکھا تھا، جس میں نہایت دردناک انداز میں اس نے فینی کو الوداع کہا ہے۔

تو میں اکیلا ہی رہوں گا۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ تم سے دور رہ کر مجھے کوئی خاص افاقہ ہوگا۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ تمھارے دیدار کا کوندا چند لمحوں کے لیے مجھے چکا چوندھ کر کے پھر تاریکی میں ڈھکیل دے؛ میں اس وقت اتنا افسردہ نہیں اگر میں کل تم سے ملا ہوتا تو اور زیادہ اداس ہوتا۔ تمھاری قربت سے مسرور ہوتا اب ایک ناممکن سی بات معلوم ہونے لگی ہے، اس کے لیے اور زیادہ خوش قسمت ستارے کی ضرورت ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تمھارے خط کا ایک ٹکڑا ابھی بھیج رہا ہوں، ہو سکے تو اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دو، میری خواہش ہے کہ جو کچھ تم نے کہا ہے ذرا اور کم سرد مہری کے انداز میں کہہ دو؛ اگر میری صحت اس قابل ہوتی تو میں ایک نظم لکھتا جو اس وقت میرے ذہن میں ہے میری حالت میں جو لوگ ہوتے ہیں ان کے لیے ایسی تخلیق تسکین دہ ثابت ہوتی ہے، میں ایک ایسے آدمی کو محبت میں گرفتار دکھاتا جیسا کہ میں ہوں اور وہ آدمی اس سے محبت کرتا جو تمھاری طرح آزاد ہے۔ شیکسپیئر اس قسم کے معاملات کو ہمیشہ بڑے پُرشکوہ انداز میں اور بڑے ایجاز کے ساتھ ادا کر دیتا ہے جو حالت میرے دل کی پریشانیوں کی ہے، وہی ہملیٹ کی بھی تھی جب وہ اوفیلیا سے کہتا ہے "کسی خانقاہ --- میں چلی جاؤ --- جاؤ جاؤ"۔ دراصل میں اس معاملے کو ختم کر دینا چاہتا ہوں ——— میں مرجانا چاہتا ہوں۔ میں اس وحشی دنیا سے تنگ آچکا ہوں، جس کے ساتھ مل کر تم مسکرا رہی ہو ——— مجھے اب مردوں اور عورتوں سے اور زیادہ نفرت ہوتی جا رہی ہے اب مجھے مستقبل میں سوائے کانٹوں کے اور کچھ نہیں سجھائی دیتا ——— چاہے میں اگلے جاڑوں میں اٹلی میں رہوں چاہے کہیں بھی نہ رہوں، براؤن تمھارے پاس رہے گا، اپنی ساری بیہودگیوں کے ساتھ ——— مجھے تو اب چین سکون ملنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ فرض کرو میں روم میں ہوں ——— وہاں بھی تم کو جادو کے شیشے میں ہر وقت بازار آتا جاتا دیکھتا رہوں گا ——— کاش کہ تم میرے دل میں فطرت انسانی کے لیے تھوڑا سا اعتماد پیدا کر سکتیں ——— میں تو اعتماد مجتمع کر نہیں پاتا ——— میرے لیے تو دنیا انتہائی وحشیانہ ہے ——— میں قبر جیسی جگہ میں زیادہ خوش رہ سکتا ہوں ——— اور

مجھے یقین ہے کہ جب تک میں وہاں پہنچ نہیں جاؤں گا مجھے چین نہیں نصیب ہو گا۔ بہرحال اب میں ہرگز براؤن، ڈسلے، یا ان کے کسی بھی دوست سے نہیں ملوں گا۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ یا تو میں تمہارے بازوؤں میں رہوں، بھرپور اعتماد کے ساتھ، یا آسمان سے بجلی گرے اور مجھے راکھ کر ڈالے۔

خدا تم پر رحمت کرے

جے۔ کے۔۔۔۔

وامق جونپوری

مسلم یونیورسٹی کی آواز

اے وطن تیرے لئے باعثِ توقیر ہیں ہم
خوابِ سرسیدِ مرحوم کی تعبیر ہیں ہم

جس کا خاکہ لئے پھرتا تھا مصور کا خیال
آج صد رنگ بہ منظر وہی تصویر ہیں ہم

بخش دیتا ہے جو گلشن کو حیاتِ جاوید
ایسے اک پھول سے مہکی ہوئی تعمیر ہیں ہم

جس کی جھنکار ہے ویرانوں سے ایوانوں تک
حلقہ ہائے فن و دانش کی وہ زنجیر ہیں ہم

جو من المہد الی اللحد دکھائے رہِ علم
آیۂ شوق کی وہ معنوی تفسیر ہیں ہم

خواجگیٔ فکر کی دی حالی و شبلی نے ہمیں
کیسے کیسے مہ و خورشید کی تنویر ہیں ہم

شاہ وارث کی نظر تک ہو رسائی جس کی
آج اک ایسے ہی مُرشد کے لئے ہیر ہیں ہم

جس زباں کو نہیں ملتی کہیں اب جاء پناہ
اب بھی پہلے کی طرح اُس سے بغل گیر ہیں ہم

جنگِ انسانیت و ظلم کے ہر میداں میں
سینۂ ظلم پہ چلتی ہوئی شمشیر ہیں ہم

رنگ اور نسل کا ہر فرق مٹانے کے لئے
رزم گاہِ حق و باطل میں عناں گیر ہیں ہم

اپنی آزادی آئین و نظر کی خاطر
چشمِ بدبیں میں کھٹکتا ہوا اک تیر ہیں ہم

قوم کے قصۂ فردا کا جو عنواں ہے وہ
وقت کے ماتھے پہ لکھی ہوئی تحریر ہیں ہم

(یوم سرسید پر پڑھی گئی)

یہ مونچھیں

رشید الظفر لکھنوی

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ مونچھ مرد کی زینت اور داڑھی اس کی عزت تھی۔ مونچھ اور داڑھی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ لیکن چرخ گردوں کو یہ یکجائی نہ بھائی اور زمانے کی رفتار نے ان کو لبِ رخسار سے مٹا کر ہی دم لیا۔

مونچھ راجپوتوں کی آن اور مغلوں کی شان تھی۔ ہندوستانیوں کی عظمت و عزت اسی سے تھی۔ داڑھی کا لازمی احترام اور منڈوانا حرام خیال کیا جاتا تھا۔ کلنک کا ٹیکہ لگنے اور ناک کٹنے سے بچنے کی طرح سفید داڑھی کے مالک اس کو کالک لگنے سے بچاتے اور حتی الامکان اس پر جان چھڑکتے تھے۔۔ اچھے کے ساتھ برے بھی ہوتے ہیں۔ اکثر خانہ خراب کالا خضاب لگاتے اور ناہنجار بدکار، داڑھی عظمت آثار کی آڑ میں شکار کھیلتے اور اس کا وقار کھوتے۔ لیکن چونکہ اس وقت موضوعِ دقیق زیرِ تحقیق صرف مونچھ ہے اس لئے داڑھی پر روشنی ڈالنے سے گریز اور اس پر قلم اٹھانے سے پرہیز کرتا ہوں۔

مختلف دوروں میں انواع و اقسام کی مونچھیں عالم وجود میں آئیں اور مفقود ہو گئیں۔ سب کا ذکر اس مختصر مضمون میں کرنا کوزہ میں دریا کو لانا ہے۔ لیکن بہرحال اپنی کوشش بھی آزمانا ہے۔ قصہ مختصر یوں سمجھئے جس طرح دو آدمی ایک شکل کے نہیں ہوتے اسی طرح دو مونچھیں کبھی یکساں نہیں ہوئیں۔ ہر مرد کی مونچھ بلا کسی موازنہ ایک نمونہ ہوتی اور ہر مرد بلا کسی فرق و امتیاز اپنی مونچھ پر ناز کرتا۔ کیا امیر کیا فقیر، ہر ایک اپنی اپنی مونچھ میں مست تھا۔

ایران توران، چین اور جاپان، دنیا کے ہر ملک، ہر مذہب، ہر قوم اور ہر فرقہ میں مرد کے چہرہ پر مونچھیں پائی گئی ہیں۔ کسی جگہ زیادتی سے تو کسی جگہ کمی سے۔

بانکے ترچھے، رنگیلے چھبیلے، موٹے دبلے، چھوٹے بڑے، جوان بوڑھے، غرضکہ ہر مرد کے چہرے پر مونچھ تھی اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں مونچھ کی پوچھ تھی۔

مونچھ کی موٹی موٹی قسمیں یہ ہیں۔ بل دار، کس دار، پیچ دار، تاؤ دار، خمدار، کمان دار، تلوار، کٹار والی مونچھیں۔ دوسری قسمیں مثلاً راجاؤں، نوابوں، منتری، سنتری، زمیندار، تھانیدار، چوکیدار، جمعدار والی مونچھیں۔ ان کے علاوہ اور قسمیں بھی ہیں گھنی، چھتری، چھوٹی بڑی، اونچی نیچی، الٹی سیدھی، گنی چھٹی، آدھی پونی، غرضکہ جیومیٹری کے تمام زاویوں اور حساب کے تمام قاعدوں کی رو سے انواع و اقسام کی مونچھیں مختلف وضع قطع سے مرد کے چہرے کی زیبائش و نمائش بنی ہیں۔ مونچھوں کی علاقائی قسمیں بھی ہیں مثلاً پنجابی، رامپوری، الوری، اجمیری، جودھپوری اور پشاوری وغیرہ۔

شاعر مونچھ کو مسیں بھیگنا اور سبزہ اگنا سے تشبیہ دیتے ہیں اس لئے ہم بھی بطور فصاحت وضاحت مونچھ کو سبزہ زار اور مرغزار سے تشبیہ دے کر مونچھ کی تشبیہ بیان کرتے ہیں۔

پہلی قسم ہے چل چلاؤ والی مونچھ۔ بڑی لمبی چوڑی مونچھیں بغیر قینچی کے کام اور بغیر لگام کے بیل کی طرح مونڈھے چڑھتی ہیں۔ یہ مونچھیں خود رو ہوتی ہیں اور چہرہ کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ برسات آئی ہوئی ہے اور ہریالی چھائی ہوئی ہے۔

دوسری قسم ہے رکھ رکھاؤ والی مونچھ۔ جس طرح مالی ڈالی کی کاٹ چھانٹ کرتا ہے اسی طرح مونچھ کی تراش خراش ہوتی ہے۔ چہرہ دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ ایک سجی دھجی کیاری ہے جس میں نہر جاری ہے۔

تیسری قسم ہے دیکھ دکھاؤ والی مونچھ۔ سبزہ اگنے کی طرح جہیں جہیں اور کہیں کہیں مونچھ نمودار ہوتی ہے استرے کے کمال سے مختلف اشکال بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ چہرہ دیکھکر معلوم

ہوتا ہے کہ ایک آراستہ پیراستہ گلدستہ ہے جو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ جس طرح مصور کا برش پردہ پر طرح طرح کے پھول بناتا ہے حجام کا استرہ چہرہ پر طرح طرح کے گل کھلاتا ہے۔ اور مصور کے (ARTISTIC TOUCHES) کی طرح حجام بھی (FINISHING TOUCHES) دیتا ہے اور ایسا کمال دکھاتا ہے کہ آئینہ میں اپنا جمال دیکھکر دھوکا ہوتا ہے۔ اس قسم کی مونچھیں ایکٹروں اور طلبا میں رائج ہیں۔

چوتھی قسم ہے کھینچ کھینچاؤ والی اونچی نیچی مونچھ جس کو دیکھکر گھڑی کی سوئیوں کا گمان اور وقت کا دھیان ہوتا ہے۔ اونچی مونچھیں دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ ۹ بجنے میں ۱۰ منٹ ہیں۔ ہموار اور سیدھی مونچھ دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ ۳ بجنے میں ۱۵ منٹ ہیں اور نیچی مونچھ دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ ۴ بجنے میں ۲۰ منٹ ہیں۔

مونچھ انسان اور حیوان میں بلاشبہ رعب و دبدبہ کی شے ہے۔ شیر کو دیکھئے اس کی مونچھ ہوتی ہے اور وہ جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ مونچھ ہی کی بدولت بابر نے شیر ببر کی طرح حکومت کی۔ مونچھ ہی کی بدولت اکبر نے سب زیر و زبر کر ڈالا۔ مونچھ کے بل پر ہی جہانگیر کو عالمگیر شہرت و حکومت نصیب ہوئی۔ اس کے علاوہ مونچھوں سے پرانے زمانے کا وکٹوریہ کراس اور دور حاضر کا ویرچکر کی طرح کا خاص امتیازی رتبہ و درجہ حاصل ہوتا تھا۔ زمیندار کی چوکیدار پر فوقیت اس کی مونچھوں سے تھی۔ زمیندار کی کاشتکار سے زیادہ عزت اس کی مونچھوں سے تھی۔ بعد خاتمہ زمینداری اب اگر زمیندار کی مونچھ تاؤدار کہیں آثار قدیمہ کی طرح دکھائی دے جاتی ہے تو بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے کہ رسی جل گئی پر بل نہیں گیا ؎

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

ہمیں مورخین سے شکایت ہے کہ انھوں نے قدیم واقعات کو روایات اور حکایات

سمجھ کر اپنے صفحات میں جگہ نہیں دی۔ لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں صاف انکشاف ہوتا ہے کہ مونچھ کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ سکندر کے حملے اور پورس کے حملے کا ذکر تمام تاریخی کتابوں میں ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ سکندر نے کیا کہا اور پورس نے کیا جواب دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پورس کے برتاؤ اور اس کی مونچھ کے تاؤ سے سکندر مرعوب ہو گیا تھا اور مغلوب کو رہا کر دیا تھا۔ دہلی میں نادر شاہ کا قتل و غارت پر حقارت کون نہیں جانتا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ یہ لٹیرا سنہری مسجد میں بیٹھا تھا۔ ادھر شمشیر تھی بے نیام ادھر جاری تھا قتل عام ؎ اور ادھر شمشیر ہوئی در نیام ادھر ہوا قتل تمام ؎ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کے کیا اسباب تھے اور کیا اثرات ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لٹیرا سنہری مسجد میں بیٹھا تھا۔ اور غصہ میں مونچھ پر تاؤ دیتا رہا اور ادھر تلوار کا گھاؤ لگتا رہا۔ لیکن جب اس کا غضب کم ہو گیا تو یہ جذبہ خود نمائی میں فوج کی رہنمائی بھول کر بس مونچھ پر تاؤ دیتا چلا گیا۔ آخر میں ادھر اس نے مونچھ پر سے ہاتھ ہٹایا اُدھر فوج نے تلوار پر سے ہاتھ اٹھایا۔ کاش یہ لٹیرا مونچھ پر اتنا تاؤ نہ دیتا اور فوج کا یہ برتاؤ نہ رہتا۔

مونچھوں کا مان پان سب سے زیادہ راجپوتوں میں تھا اور راجپوتوں کی آن بان مونچھوں سے تھی۔ راجپوت اپنے راج و تاج کی طرح مونچھ کی لاج کے لئے اپنی جان کی بازی راضی خوشی لگا دیتے تھے۔ ہر راجپوت کی عزت و فوقیت، ہمت و شجاعت مونچھ ہی سے تھی۔ راجپوت جب کسی مہم کا عزم مصمم کرتے یا کوئی بیڑہ اٹھاتے تو برہنہ تلوار اور مونچھ تاؤ دار پر ہاتھ رکھ کر ایسے عہد کرتے کہ اَجل سے پہلے نہ ٹل پاتے۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ مونچھوں کا خاص لحاظ و پاس اسی وقت سے ہوتا آیا ہے۔ اور اب تک بہت سی باتیں ضرب المثل میں مثلاً مونچھوں پر تاؤ دکھانا۔ مونچھیں نیچی کر دینا، مونچھ مونڈا دینا وغیرہ۔ یوں سمجھئے جب راجپوت کی مونچھ تاؤ پر ہوتی وہ گویا علم بردار ہوتا۔ جب تک بیڑا اٹھائے ہے علم لہرا رہا ہے اور مونچھ پر تاؤ دکھا رہا ہے۔ ناکامی کی صورت میں

علم نیچے ہوگیا اور مونچھ بھی نیچی ہوگئی۔ شکست فاش کی صورت میں مرمٹا یا صورت دکھانے کے قابل نہ رہا اور مونچھ مونڈھ گئی۔ لیکن جب تک تن میں جان اور من میں دھیان ہے علم بلند رہتا اور تاج کی طرح مونچھ کی بھی لاج رکھتا۔ غرضکہ تاریخ میں راجپوتوں کا دور دورہ مونچھوں کا سنہرہ زمانہ تھا۔

عہد گذشتہ میں موسیقی حقیقی یعنی آواز و ساز کے استاد جو اس فن میں آفتاب عالمتاب بن کر چمکے لمبی چوڑی مونچھوں کی دولت لازوال سے مالا مال تھے اور گویا سُر و تال سے مونچھ کے بال کو مناسبت تھی۔ بڑے استاد راگ چھیڑتے اور مونچھ پر ہاتھ پھیرتے۔ ساز پر مضراب کی چوٹ کے ساتھ مونچھوں میں اضطراب ہوتا۔ استاد جب عالم کیف و سرور میں بڑے دھوم سے جھوم اٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ مونچھ میں ساز کی جھنکار کے ساتھ انتشار ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ پہلے استادوں کی مونچھیں بڑی تھیں علم موسیقی کمال پر تھا۔ اب مونچھیں چھوٹی ہوگئی ہیں اس علم کا زوال شروع ہوگیا ہے۔ آج کل کے فلمی گانوں کو ایکٹروں کی مونچھوں سے مناسبت ہے اور اسی لئے یہ عجیب و غریب، نئی وضع قطع کی مونچھیں ایسے الٹے سیدھے گانوں کا باعث ہوئیں کہ کانوں میں انگلی رکھنے کا جی چاہتا ہے۔

حکومت اور سیاست کو بھی مونچھ کے تاؤ اور بناؤ سے خاص لگاؤ ہے۔ ہندوستان کے مندرجہ بالا تاریخی واقعات عہد گذشتہ اور عمر رفتہ کی یادیں ہیں۔ اب آئیے ذرا موجودہ دور پر روشنی ڈالیں۔

دوسری جنگ عظیم میں مسولینی، ٹوجو، ہٹلر اور اسٹالن میدان کارزار میں خم ٹھوک کر جم گئے تھے۔ مسولینی اور ٹوجو کی مونچھیں نہ تھیں۔ وہ بری طرح ہارے اور مارے گئے۔ ہٹلر کی آدھی مونچھیں تھیں۔ یورپ کے کئی ممالک ہٹلر کے پہلے ہی وار پر ہار مان گئے تھے۔ تمام یورپ میں ہٹلر کا دور دورہ لیکن آخر میں ہٹلر کے قدم اکھڑ گئے اور وہ اپنی تاریخی مونچھ سمیت نیست و نابود ہوگیا۔ کاش مسولینی اور ٹوجو تاریخ کا مطالعہ کرلیتے اور مونچھ کا تقاضہ

جان لیتے۔ اور کاش ہٹلر بھی انڈین ہسٹری پڑھ لیتا اور آدھی پوری مونچھ کی تھیوری (THEORY) سمجھ لیتا تو جنگ کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔ لیکن خیر۔ اسٹالن میدان کارزار میں مانند دیو کھڑا رہا۔ اس کی لمبی چوڑی مونچھیں آڑے وقت پہ کام آئیں۔ اور ان کی آب و تاب کے سامنے ہٹلر بھی کامیاب نہ ہوا۔ اور جلد ہی اسٹالن نے مونچھوں کے بل پہ جنگ و جدل کا نقشہ بدل ڈالا۔

مونچھوں میں جاذبیت بھی ہے۔ پرانے زمانے میں سوئمبر میں، اسکا ن دامیدوار محفل میں ایسے رنگ ڈھنگ، سج دھج اور ایسے نورٌ علیٰ نور چشم بدور بن کر بیٹھتے تھے کہ انتخاب کرنا اور جواب ڈھونڈھنا امر ہزار دشوار ہوتا۔ ایک طرف یہ چندے آفتاب چندے ماہتاب بڑے چاؤ سے مونچھ پر تاؤ دیتے ہنسنے کے جوہر دکھاتے تو دوسری طرف پری پیکر رشک قمر سب کے رخ روشن کا درشن کرتی اور کسی ایک کے مونچھ کے تاؤ اور دکھاؤ سے گھائل و مائل ہو کر ایک ہار بڑے پیار سے اپنے منظور نظر کے گلے میں ڈال دیتی

مونچھوں میں مناسب رومانیت بھی ہے۔ جس طرح عورت ہمہ صفت کا تصور بغیر گیسوئے پیچ دار، پیچ و بیکار ہے اسی طرح بغیر مونچھ کے مرد کا تخیل بالکل خارج العقل ہے مرد کے مونچھ نہ ہونا دراصل عورت کی نقل ہے۔ پرانے زمانے میں عورتیں الفت و محبت کے گانے و ترانے گاتیں کہ "مونچھ پیا کی دیکھکر جیا ڈول گیا رے"۔ بالم پردیسی جیسی مونچھ والے مرد سے ہر عورت بلا حیل و حجت محبت کرتی اور جان چھڑکتی۔ مرد ایک طرف عورت کے گیسوئے بل دار کے دام میں گرفتار ہوتے تو دوسری طرف مونچھ تاؤ دار سے رام کر لیتے۔ المختصر مونچھ وجیہ و شکیل ہونے کی دلیل تھی اور عورت کی عصمت کی طرح مونچھ کی بیش بہا قیمت تھی۔ لیکن پھر آپ پوچھیں گے کہ عورت بغیر مونچھ والے مرد سے کیوں محبت کرتی ہے۔ تو اس کے جواب میں دراصل وہی مثل یاد آتی ہے کہ دل لگا پونچھ سے تو مونچھ کیا چیز ہے۔ خیر۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کسی کی حکایت اور کسی کی شکایت بیان کریں۔

لیکن ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ مونچھ کا اقتدار زیادہ دن برقرار نہ رہا۔ حسن کی نمائش و زیبائش کا زمانہ شروع ہوا۔ مونچھ والے آزمائش میں مبتلا ہو گئے اور بہت جلد عورت کی فرمائش پر مونچھ غائب ہونے لگی۔

نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے
ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے

مونچھ کیا غائب ہوئی چہرہ کا نور دور اور دل کا سرور کافور ہو گیا۔ اب نہ پہلی سی الفت ہے نہ اگلی سی محبت اور اگر محبت ہے بھی تو پہلا سا جوش و خروش فراموش ہو چکا ہے۔ قیس ولبنیٰ، لیلیٰ و مجنوں اور شیریں فرہاد کے واقعات اب صرف پرانے زمانے کے فسانے بن کر رہ گئے ہیں۔

خلیل الرحمن اعظمی

غزل

نشۂ مے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں
کچھ بہانے مرے جینے کے لئے اور بھی ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی سی مگر غم سے ہے بھرپور ہوا
کئی بادل مری آنکھوں سے پرے اور بھی ہیں
عشقِ رسوا! ترے ہر داغِ فروزاں کی قسم
میرے سینے میں کئی زخم ہرے اور بھی ہیں
زندگی آج تلک جیسے گزاری ہے نہ پوچھ
زندگی ہے تو ابھی کتنے مزے اور بھی ہیں
ہجر تو ہجر تھا اب دیکھئے کیا بیتے گی
اُس کی قربت میں کئی درد نئے اور بھی ہیں
رات تو خیر کسی طرح سے کٹ جائے گی
رات کے بعد کئی کوس کڑے اور بھی ہیں
غمِ دوراں! مرے بازوئے شکستہ سے نہ کھیل
مشغلے میری جوانی کے لئے اور بھی ہیں
وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

بُلا

صالحہ عابد حسین

وہ اپنے مخصوص، کچھ پہاڑی کچھ میدانی لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ اس بڑے پہاڑی مرکز پر بستے رہتے اُسے بہت سے موٹے موٹے لفظ بھی آگئے تھے جس زبان میں وہ گفتگو کرتا تھا اُسے میں سمجھ تو خوب رہی تھی مگر بالکل انھیں لفظوں میں بیان کرنا دشوار ہے۔ یوں سمجھیے کہ باتیں اس کی ہیں اور زبان کچھ اس کی کچھ میری وہ پالتھی مارے میرے سامنے برآمدے کے لکڑی کے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے بوسیدہ میلے کپڑوں سے ہوا کے جھونکے کے ساتھ بو کا بھپکا آجاتا تھا اور کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے اس کی چھوٹی چھوٹی میل اور چیکٹ سے بھری آنکھوں میں جذبات کی شدت سے پانی آجاتا تو وہ اپنے میلے انگوچھے سے انھیں پونچھ لیتا تھا۔ کبھی کسی کے تصوّر سے یہ چندھی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں اور اس کی بھدی کرخت آواز میں محبت کی نرمی اور لچک پیدا ہو جاتی تھی۔

"بی بی جی تم آج کی میری صورت سے، یہ سوکھا ماڑا بدن دیکھ کر کیا سمجھو گی کہ میں کبھی بڑا تگڑا اور بڑا سندر گبرو تھا۔ ان ہاتھوں میں لوہے کی سی طاقت تھی۔ ان ٹانگوں میں چیڑ کے تنے جیسا بل تھا بی بی جی۔ منھ پر سرخی تھی بالوں میں کالک تھی اور صورت پر چکنا چیڑاپن اور وں کی تو میں کہتا نہیں مگر میری استری ــــ وہ مجھے بہت سندر، بڑا سجیلا جوان سمجھتی تھی۔ مجھ سے بڑا پیار کرتی اور بڑی سیوا کرتی تھی مجھے بھی اس سے بڑا پریم تھا۔ اُسے میں نے پایا بھی تو کتنی کٹھنائی کے بعد تھا۔ پانچ ہزار ٹکے پانچ ہزار خرچ کرنے پڑے تھے میرے باپ کو میرے بیاہ پر تم ہماری طرف کی ریت رسم نہیں جانتی ہو بی بی جی جب تک ہزاروں روپے لڑکی کے باپ کو نہ دیا جائے کسی کا بیاہ نہیں ہو سکتا چاہے وہ دیر تک!

غریب کسان ہی کیوں نہ ہو جس کے پاس ذرا سی پہاڑی زمین اور ایک دو گائیں ہوں۔ پیسہ نہ ہونے کے کارن بہت جوان ہونے پر میرا بیاہ ہوا۔ میرے باپ نے گاؤں کے برہمن مہاراج سے جو ہمارے پنڈت بھی ہیں اور ساہوکار بھی، جن کی سرکار دربار میں پوچھ ہے جو سرکاری افسروں کو ڈالیاں اور نذرانے دیتے رہتے ہیں، خوشامد کی تو انھوں نے اُسے روپیہ قرض دیا مگر اتنا کڑا سود لگایا۔ اتنا کڑا سود کہ آج بارہ برس بعد بھی میں خالی سود بھی ادا نہیں کر سکتا پانچسو تو انھوں نے پہلے ہی کاٹ لیئے اور ساڑھے چار ہزار ہمیں دیے۔ پھر چار پانچسو دان دکشنا کے نام سے ہتھیا لیے ... تین ہزار روپے لڑکی کے باپ کو دینے پڑے ہزار روپے میں زیور کپڑا اور کھانا پینا کیا۔ تم نے تو بی بی جی ہماری طرف کی عورت کو دیکھا ہو گا نا۔ وہ تم لوگوں کی طرح چھوٹا چھوٹا زیور نہیں پہنتی۔ ایک ایک استری کے سر منہ اور بدن پر پانچ سیر چاندی نہ ہو تو اُسے چین نہیں آتا۔ اور تم جانو بس بیاہ پر ہی تو زیور ملتا ہے پھر سود اور قرضے کا چکر اس کا موقع ہی نہیں آنے دیتا کہ اس کے لیے کوئی اور زیور گھڑوایا جا سکے۔ اس سمے پانچ ہزار کا قرضہ کرتے زمین گروی رکھنے اور سود کا پہاڑ سر پر لادنے کے باوجود اپنے کو بڑا قسمت والا سمجھتا تھا۔ اتنا خوش تھا کہ مانو ساری دنیا کی دولت مجھے مل گئی۔ ایسی سندر ایسی دیالو، پریم کرنے والی استری جسے مل جائے اُسے اور کیا چاہیئے۔ میں اپنے کھیت سے آتا تو وہ مجھے گرم گرم روٹی مزے دار سبزی اور گاڑھا گاڑھا سوندھا سوندھا دودھ دہی کھانے کو دیتی۔ میرے بدن کی مالش کرتی۔ میرے پیر دباتی۔ زندگی میں اس سے رس ہی رس مٹھاس ہی مٹھاس تھا میرا بچہ جب میرے کندھے پر اُچکتا یا جب میری سندرتا کی دیوی میری گود میں اپنا سر ڈال دیتی تو مجھے ایسا لگتا کہ سارے جگ کی دولت مجھے مل گئی۔ میں یوں بھی بڑا خوش نصیب تھا کہ میرے اور کوئی بھائی نہ تھا۔۔ میری بیوی میرے اکیلے کی تھی ۔۔۔ تم شاید اسے نہ سمجھو گی بی بی جی ۔۔ ہماری طرف ایسے بیاہ بھی ہوتے ہیں۔۔ ایک استری کئی بھائیوں کی استری ہوتی ہے پر میں تو اکیلا اپنی استری کے پریم کا مالک تھا۔۔"

میں عجب بیوقوف بنی اس کی باتیں سن رہی تھی۔ مگر اس کے ہاں کچھ اس قدر سادگی سچائی اور خلوص تھا کہ عشق و محبت کے اس بیان کو سننے سے جھجک یا شرمندگی کا احساس پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ

باتیں کرتے کرتے تصور میں کھو گیا۔ اور میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھنے کے لئے سوال کیا" تو کیا اب تمھاری بیوی ۔۔" میں کہتے کہتے رک سی گئی۔

"نہیں بی بی جی وہ مری نہیں زندہ ہے ۔۔ اور اپنے گاؤں میں۔ میری یاد میں برہا کے گیت گایا کرتی ہے ۔۔۔ پر میرے لیے تو مری برابر سمجھو ۔۔ برسوں گذر گئے ہیں، اسے نہیں دیکھا لوگ کہتے ہیں رام چندر جی کو بن باس ملا تھا پر اس میں سیتا جی تو ان کے ساتھ تھیں پھر وہ بن باس کیا ہوا؟ وہ تو ان کے لیے سورگ ہوا ۔۔۔ پر میرے۔ مجھ کو دھوا کہلا کے دیئے تو ۔ بن باس سچا بن باس ہے ۔۔۔ بنا نہ مسوری میں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ یہاں بولتی گاتی تصویریں ہیں۔ ناچ رنگ ہے۔ ہوٹلوں میں محل ہیں۔ سجی سجائی دکانیں ہیں مٹھائیاں میوے۔ پھل اور طرح طرح کے کھانوں کی دکانیں ہیں۔ مگر یہ سب تو دھنوانوں کے لیے ہیں جو اپنی گڑیوں کی طرح سجی بنی چھل بل کرتی استریوں کو بغل میں لیے مال سڑک پر پھرتے رہتے ہیں کہیں تماشے دیکھتے ہیں، خوب کھاتے ہیں، ناچتے کودتے ہیں اور ۔ اور ۔۔" میرے لحاظ سے اگلا جملہ اس نے نگل لیا اور پھر کھنکار کر آگے چلا " پر ہم جیسے غریب مزدوروں کے لیے تو یہ شہر بھی بن ہی ہے۔ ہمارا بن باس سچا بن باس ہے جسے نہ رام چندر جی جان سکتے تھے اور نہ ان کے پجاری ودوان اور دھنوان لوگ۔ سوچو کتنے برس ہو گئے میں نے اپنے بچوں کو پیار نہیں کیا ۔۔ اپنی پتنی کو دیکھا تک نہیں ۔۔۔ اپنے کھیتوں کے درشن سے آنکھیں ٹھنڈی نہیں کیں ۔۔۔ اپنی گایوں کو چارا نہیں کھلایا۔ بھگوان جانے یہ شبھ گھڑی کب آئے گی ۔۔۔ اور آئے گی بھی یا نہیں "

میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں کیوں اس کے ناسوروں کو چھیڑ رہی ہوں؟ پھر بھی افسانہ نگار کا تجسس غالب آیا۔" پھر تم اپنے گاؤں جاتے کیوں نہیں؟ تمھارے بہت سے ساتھی جاڑے میں اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں ۔۔"

جا سکتا تو ضرور جاتا بی بی جی ۔۔ ضرور جاتا ۔۔ مگر برہمن مہاراج کا قرضہ جو سر پر ہے اور پھر ان سے جھگڑ کر بھاگا ہوں ۔۔ تم لوگ ہماری طرف کی حالت نہیں جانتے ۔۔۔ وہاں

بہت بُرا حال ہے - بہت بُرا --- آج سے بارہ برس پہلے میں سمجھتا تھا کہ سب جگہ ایسا ہوگا اور یوں ہی ہوتا ہے --- بھگوان نے چھوٹے بڑے، امیر غریب، ذات پات کا بھید بھاؤ بنایا ہے اور ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے --- پر اب --- اب برسوں یہاں رہتے رہتے - دنیا کو دیکھکر، بہت کچھ سن کر مجھے بھی --- مجھ گنوار، ان پڑھ جاہل کو بھی --- یہ پتہ چل گیا ہے کہ ایسا نہیں --- ہم بہت گرے ہیں - بہت غریب ہیں - ان پڑھ ہیں - انجان ہیں اس لیے کچھ تھوڑے سے لوگ جن کے پاس پیسہ ہے بدھی ہے اور بل ہے ہمیں لوٹ رہے ہیں - ہمیں نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں - ہمارا حق چھین رہے ہیں ہمیں قرضہ دیا جاتا ہے تو ہم ساری عمر کما کما کر مر جاتے ہیں سینکڑوں روپیہ دیتے ہیں مگر خالی سود تک ادا نہیں ہوتا اور قرضہ سر پر جوں کا توں لدا رہتا ہے - ہماری بیویاں مر مر کر گائے بھینس پالتی ہیں اور افسر و حاکم اور پنڈت ان کو چھین لے جاتے ہیں - اگر انکار کرو تو کوڑے کھاؤ جیل کی کوٹھری میں سڑو یا پھر میری طرح گھر سے بھاگ کر بن باس لو"

میں نے بات کاٹی "پہلے تمھارے ہاں راجہ راج کرتا تھا - اس کے زمانے میں ظلم ہوتے تھے مگر اب تو ریاست ختم ہوگئی --- اب تو وہ آزاد ہندوستان کا ایک حصہ ہے - اب تو وہاں یہ ظلم اور زیادتیاں نہیں ہونی چاہییں ---"

ہوگا بی بی جی --- پر میں نہیں جانتا کہ آزادی، غلامی میں کیا بھید بھاؤ ہے - وہاں کی تو بات ہی کیا ہے --- یہاں - اس بڑے شہر میں بھی وہی زبردستی ہے انیائے ہے جس کا جی چاہتا ہے دس آنے کی جگہ چھ آنے --- چار آنے پکڑا دیتا ہے اور اوپر سے دس بُری بھلی باتیں سناتا ہے --- دو دو اور چار چار گنا بوجھ ہم پر لاد دیا جاتا ہے اور مزدوری دیتے سمے ہمارا حق کاٹا جاتا ہے --- جو کماتے ہیں اس میں بنیے کا حصہ ہے، سپاہی کا حصہ ہے جمعدار ٹھیکیدار کا حصہ ہے --- اور ہمارا حصہ کیا ہے، بیجھڑ کی موٹی روٹی اور سڑی بسی سبزی اور ایک کال کوٹھری جس میں دس دس قلی سوتے ہیں -

" مگر یہاں اور وہاں دونوں جگہ تم لوگ اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکتے ہیں ظلم اور رشوت خوار افسروں کے خلاف شکایت کر سکتے ہو سنگٹھ کر سکتے ہو اور تمھیں کرنا چاہیے -

جب تک تم لوگ خود اپنے حق کے لیے نہ لڑو گے تمھارے حق تمھیں نہیں مل سکتے ؟"

" مگر بی بی جی لڑے کون ؟ اور ان کی سنے کون ! سب یہ جاہل ، پچھلے ہوئے ۔ یہ بھینسوں اور جانوروں کی طرح بس محنت کرتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے کہ کیا ہو رہا ہے دنیا میں اور ان کا کیا حال ہے ۔۔۔ تم جو تم نے یہ دردوا تو ان کی سی باتیں بتا رہا ہوں ۔۔۔ یہی باتیں باتیں اگر مقابلے کا وقت آئے تو پیچھے کھسک جائیں گا ۔۔۔ پھر میرے جیسے بھی ہم لوگوں میں کہاں ہیں ۔ ہمارے لوگوں کو کسی پر بھروسہ نہیں ہوتا ۔ کوئی ان کی بھلائی کا کام بھی کرنا چاہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمیں کسی نئے جال میں پھنسا رہا ہے ۔۔۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گئی ۔ دراصل سینکڑوں ہزاروں برسوں کے کچلے ہوئے ظلم وستم کا شکار یہ جاہل ، ان جان اور دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے پہاڑی نئی چیزوں کو آسانی سے سمجھ نہیں سکتے ۔ قبول نہیں کر سکتے ۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ یہ نئی باتیں ان کی بھلائی کے لیے ہوں گی ؟ وہ سمجھتے ہوں گے کہ نیا شکاری نے نئے پھندے بنا کر لایا ہے اور اس میں ان کو پھانسنا چاہتا ہے ۔ میں نے اس سے کہا " مگر تم جیسے سمجھدار لوگوں کو تو اپنے ساتھیوں کو سمجھانا اور جگانا چاہیے ان میں آزادی کا ، اپنے حقوق کا احساس پیدا کراؤ تاکہ ان کی حالت سنورے اور وہ دنیا میں بہتر زندگی بسر کر سکیں ۔۔۔"

جاڑوں میں ڈیرہ دون ، سہارن پور اور آس پاس کے شہروں میں جا کر مزدوری کرتا ہوں اور اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر پیسہ پیسہ جوڑ کر ہر سال کئی کئی سو روپے گاؤں بھیجتا ہوں ۔۔۔ نہیں نہیں بی بی جی ۔۔۔ یہ روپے میری بیوی بچوں کے کام نہیں آتے ۔۔۔ انھیں تو دس بیس روپے بھی کبھی دیکھنے کو نہیں ملتے ۔۔۔ یہ سب تو ساہوکار کے قرضے کے سود میں چلے جاتے ہیں ۔ آج سات آٹھ برس سے اسی طرح روپیہ بھیج رہا ہوں پھر پورا بیاج بھی ادا نہیں کر پایا ۔۔۔ شاید جنم بھر نہ ادا کر سکوں گا ۔ اور جب تک اس کا قرضہ نہ چکے گا گاؤں کیسے جاؤں ؟ وہ پکڑ کر کسی نہ کسی بہانے جیل میں ڈلوا دے گا ۔

اس کی آنکھوں میں حسرت چھا گئی ارے بی بی جی جانے تم نے مجھے کیا سمجھ لیا ——— میں تو ایک غریب مصیبت کا مارا بِلا ہوں جسے دو وقت روٹی کھانے کو نہیں ملتی ——— جسے اپنے گاؤں جانا نصیب نہیں ہوتا ——— بی بی جی آج سے برسوں پہلے میں اسی آشا کے ساتھ سوری آیا تھا کہ یہاں بہت سی کمائی کروں گا اور پھر گاؤں واپس جاکر مزے سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہوں گا ——— کبھی کبھی تو سیزن میں میں صبح آٹھ بجے سے رات کے دس بجے تک مزدوری کرتا رہتا ہوں کتنے چکر وکنگ ایٹ سے کتاب گھر کے، سوائے کے، ایکمن کے، کلٹری کے اور میلوں دور "شال ویل" اور "نئی دہلی" سے لگاتا ہوں اور جو ملتا ہے اُسے جوڑ جوڑ کر رکھتا ہوں تا کہ دیس کے برہمن مہاراج کا قرضہ چک جائے۔ میں پیٹ بھر کھانا تک نہیں کھاتا ہوں کہ پیسہ جوڑ کر گھر بھیجوں پھر ایسے دن بھی آتے ہیں جب کئی کئی دن مزدوری نہیں ملتی اور مجھے بھوکا ہی سونا پڑتا ہے ——— پیٹ بھر کر کھانا ——— بی بی جی میں نے برسوں سے نہیں کھایا۔ دن بھر کی یہ کڑی محنت اور بھوک کو کاٹنے والی یہ ہوا ——— پیٹ میں آگ جلتی رہی ہے۔ مگر میں تو جنم جنم سے بھوکا ہوں ——— بھوکا رہوں گا ——— پیٹ کی بھوک۔ من کی بھوک۔ دیس کی بھوک آرام کی بھوک ——" اس کی آواز دردناک حد تک بھیانک ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر جیسے موٹا موٹا لفظ بھوک جلی حرفوں میں لکھا ہوا نظر آ رہا تھا ——— میں بے سوچے سمجھے اندر گئی اور رات کا بچا روٹی سالن ایک تھالی میں رکھ کر اس کے سامنے لا رکھا اس نے حیرت سے مجھے دیکھا شاید کبھی کسی نے اُسے آدر سے کھانا کھلانے کی زحمت ہی نہ کی تھی مانگنے پر اُسے روٹی یا آٹا یا پیسہ ملا بھی تو نفرت، حقارت اور رحم کے جذبے کے ساتھ۔ ہمارا اونچا طبقہ جو ایسے لوگوں سے دور دور ہی رہنا پسند کرتا ہے ——— جو رکشا میں بیٹھنے سے اس لیے گھبراتا ہے کہ قلیوں کے کپڑوں کی بدبو سے اس کا دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے ——— ان کے قریب کھڑے ہو کر اس لیے بات نہیں کرتا کہ ان کے منہ سے آنے والے بھبکے اس کی نفاست پسند طبیعت پر بار گزرتے ہیں۔ وہ بھلا سمجھ ہی کیا سکتے ہیں کہ ان غریبوں پر کیا بیت رہی ہے۔

پہلی بار میں نے اسکی آنکھوں میں نمی دیکھی تو بے اختیار میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں اس نے

میری جانب سے پیٹھ موڑ لی اور اس ذوق و شوق سے یہ باسی روٹی کھانے لگا گویا من و سلویٰ کا خوان اس کے سامنے چنا ہوا ہے۔

جس دن میں مسوری پہنچی اسی دن میری اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ابھی پہاڑ پر لوگ بہت کم آ رہے تھے اور جیسے ہی کوئی موٹر یا بس رکتی قلی اس کی طرف ایسے دوڑتے جیسے بھوکے گدھ مردار کی طرف۔ میرا سامان بہت سے قلیوں میں تتر بتر ہو گیا۔ کوئی بستر لے کر بھاگا کوئی بکس، کسی نے ٹوکری پر قبضہ کیا کسی نے بالٹی اور یہ ہی تپائی وہ سب سے کمزور تھا مگر سب سے زیادہ چیخ رہا تھا دوسرے قلی جو نسبتاً اس سے مضبوط تھے سامان پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور وہ خالی ہاتھ کھڑا اپنی پہاڑی بولی میں مسلسل بکے جا رہا تھا اور دوسرے قلی اس پر ہنس رہے تھے۔ مجھ سے اس کا یہ حال نہ دیکھا گیا اور اپنا اٹیچی کیس، جسے میں اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی اسے تھما دیا اور یونہی پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟" "نام؟" اس نے بڑی حیرانی سے کہا۔ گویا اس جیسے بے حقیقت آدمی کا بھی کوئی نام ہو سکتا ہے بھلا؟ "ہاں ہاں آخر تمہارا کچھ نام تو ہوگا نا؟"

"جی ہم لوگ بُلا کہلاتے ہیں۔ یا پھر کچھ لوگ ہمیں فاٹو کہتے ہیں"

"تمہارے ماں باپ نے بھی تو تمہارا کچھ نام رکھا ہوگا نا! اس نام سے میرا مطلب ہے"

"ہوں" اس نے بڑی حیرانی سے کہا "میرا نام گووند ہے بی بی جی — پر تم جیسے بڑے لوگوں کو میرے 'نام' سے کیا مطلب — تم سب تو ہمیں بُلا ہی کہتے ہو"

اور مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ عام قلیوں جیسا بالکل بے حس اور لدو جانور ہی نہیں بلکہ اس میں احساسِ خودی اور اپنے حقوق کا کچھ پاس بھی ہے۔ راستے بھر یہ لدو بھینسے کی طرح ہانپتے ہوئے قلی میرے ضمیر پر مسلط رہے اپنی کاٹیج پر پہنچ کر میں نے ان کو معمول سے کچھ زیادہ پیسہ دیے تو ان قلیوں نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا اور حسبِ عادت بخشش بھی نہیں مانگی۔ مجھے وہ لوگ یاد آئے جو کہتے ہیں کہ ان "کمینوں" کو تو جھگڑا کرنے کی عادت ہوتی ہے "کتنا" ہی دیدو ضرور لڑیں گے اور زیادہ مانگیں گے۔ یہ سیر و سفر کرنے والے سیاح، عیش پسند رئیس، آرام طلب صاحبانِ علم و فن

جو پہاڑوں پر آکر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے اور لطف اُٹھاتے ہیں، جب محنت کش کی مزدوری دینے کا وقت آتا ہے تو دو دو چار چار آنے پر جھگڑتے، بگڑتے، ان فاقہ زدہ پھٹے حال قلیوں کو ڈانٹتے پھٹکارتے اور دوسرے قلی بلانے کی دھمکی دیتے ہیں جو اکثر کارگر ہو جاتی ہے۔ اور یہ حضرات چند پیسے بچا کر اپنے خوش ہوتے اس قدر فخریہ مسکراتے ہیں گویا جونک کی طرح غریب کا خون چوس کر بہادری کا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اور سب قلی پیسے لے کر پلٹ گئے۔ یہ جاتے جاتے رکا۔ میری طرف دیکھا اور بولا "بی بی جی کوئی کام ہو تو ہمیں بلانا ۔۔۔ ہم رکشا بھی چلاتا ہے ۔ ہم حاضر ہے تمھارا کام کرنے کو ۔۔ جب بلائے گا آئے گا ۔۔۔" اور جب کبھی میری کاٹج کے سامنے سے گزرتا۔ تو ضرور سلام کر کے پوچھ لیتا تھا کہ کوئی کام تو نہیں ۔۔۔ اور اسی طرح میری اور اس کی دوستی شروع ہوئی تھی۔

آج وہ میری کاٹج کے نیچے کے حصے میں کچھ لوگوں کا سامان لے کر آیا تھا۔ یہ بہت سے فنکار تھے۔ جو مسوری کے مشہور ہوٹلوں میں اپنے رقص و موسیقی کے کمالات دکھانے کے لیے آئے تھے ان میں بنگالی، پنجابی، اور یو پی والے۔ مرد اور عورتیں کوئی پندرہ آدمی تھے۔ سب کے سب جوان تندرست خوش حال اور رنگین ۔۔۔ لیکن جب ان اپٹو ڈیٹ فن کاروں نے جن میں سے بعض عورتیں پچاس ساٹھ کی ساڑھی اور مرد سو کا سوٹ پہنے تھے۔ ان قلیوں سے دو دو آنے کے لیے لڑنا شروع کیا اور لڑتے ہی چلے گئے ۔۔۔ نہیں ہم تمھیں آٹھ آنے سے ایک پیسہ زیادہ نہیں دیں گے ۔۔۔ کیوں اتنا سامان اٹھایا ۔۔ ہم نے کب کہا تھا ۔۔۔ ریٹ سے ایک دمڑی زیادہ نہیں ملے گی" تو میں حیرانی سے ان کو دیکھتی رہ گئی؟ یہ ہیں ہمارے نئے دور کے فن کار؟ آرٹ کے دلدادہ، فن کے خادم فنکار تو بڑا احساس بڑا درد مند بڑا ہمدرد ہوتا ہے؟ ایسا نہ ہوتا تو اس کا فن بلندی کی چوٹی کو نہیں چھو سکتا ۔۔ پھر یہ کیسے فن کار ہیں جو غریب قلیوں کے دو دو آنے مار کر خوش ہو رہے ہیں۔

جب قلی بڑبڑاتے بگڑتے واپس جا رہے تھے تو گووند و میرے دروازے کے سامنے رکا اور سلام جھاڑ کر بولا "دیکھا بی بی جی؟" میں غصے سے یونہی ابل رہی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ ساتھ مجھے

ان قلیوں پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ میں نے کہا کیوں تم لوگ پہلے سے طے کر کے سامان نہیں اٹھایا کرتے تاکہ یہ لوگ تمہارا حق نہ مارا کریں۔ جب تک تمہیں پوری مزدوری نہ ملے ہرگز سامان نہ اٹھاؤ۔ جھک مار کر دیں گے نہیں تو اٹھائیں خود بوجھ تو انھیں پتہ چلے۔ اور یہ سن کر وہ میرے سامنے پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اپنا اور اپنے بھائیوں کا حال سنانا شروع کر دیا کہ مزدور کتنے بہت سے ہیں اور ہر سال بڑھ رہے ہیں مزدوریاں کم ہیں اس لیے کتنے کم پیسے ملیں تب بھی ہم چھوڑ نہیں سکتے۔ وغیرہ وغیرہ اور باتیں کرتے کرتے وہ اپنی بیوی، بیاہ، سود بیاج گاؤں گھر اور بچوں کی باتیں سنانے لگا اور اب سب کچھ بھول کر ذوق و شوق سے کھانا کھا رہا تھا۔ روٹی کھانے کے بعد اس نے اپنے میلے انگوچھے سے اپنا منھ پونچھا اور پھر اس انداز سے پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا جیسے اس کا اٹھنے کو جی نہ چاہتا ہو۔ میری افسانہ نگاری کی آگ بھڑک رہی تھی میں نے دوبارہ بات شروع کرنے کی خاطر پوچھا "تمہاری بیوی کچھ چٹھی پتر بھیجتی ہے؟"

"چٹھی پتر بچاری کہاں سے بھیجے گی۔ گاؤں میں لکھنا آتا ہی کسے ہے؟" جب کوئی قرضے کا مارا بھوک کا ستایا جوان ادھر آتا ہے — انہیں آشاؤں کے ساتھ جو میں لے کر آیا تھا تو اس سے خیر خبر مل جاتی ہے اور میرے دل کی آگ پھر سے بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ آگ جسے دن بھر محنت میں اور تمباکو میں بجھاتا رہتا ہوں۔ مگر یہ یاد نہیں بھولتا۔ نہیں بھولتا بی بی جی۔ جب یہاں کی چمکتی سجی دکانیں دیکھتا ہوں تو میرا کیسا کیسا جی چاہتا ہے کہ اس میں سے ایک — بس ایک دھوتی خرید لوں اور اپنی بیوی کو لے جا کر پہناؤں۔ جب یہاں آیا تو سنا تھی کہ بہت سے پیسے کماؤں گا۔ اور اس کے لیے جھلمل جھلمل کرتے کپڑے اور سونے اور روپے کے زیور — نئی نئی وضع کے خرید کر لے جاؤں گا۔ اور ہونٹوں کی لالی اور گالوں کی بھی لالی اونچی اونچی جوتیاں اور بہت سی چیزیں اس کے لیے لے کر جاؤں گا تو وہ کتنی خوش ہوگی۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے سجاؤں گا — اسی طرح جیسے یہ رکشا میں بیٹھ کر آنے والی ہوٹلوں میں مردوں کے ساتھ ناچ کرنے والی استریاں کرتی ہیں، یا بولتی گاتی تصویریں کرتی ہیں — بی بی جی سنیما کی یہ پتلیاں کتنی سندر ہوتی ہیں — پر — پر میں اپنی استری کو ننگا نہیں پھراؤں گا — بی بی جی تمہارے دیس میں عورت کیسے کپڑے پہنتی ہے۔ آدھی سے ادھک ننگی — بھگوان نہ کرے

ہم گڑھوالیوں کی عورتیں ایسی بے شرم ہو جائیں ——"

شاید اس نے مجھے ان فیشن پرست تتلیوں سے کچھ مختلف دیکھ کر یہ سب کہنے کی جرأت کی تھی مگر میں اس کی باتیں سن کر شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ مہذب تعلیم یافتہ عورت کی فیشن پرستی پر اور نئے زمانے کی مغربی تہذیب پر جان دینے والی عورت کی بے حیائی پر —— یہ جاہل، گنوار، غیر متمدن قلی تک اس کی حرکتوں کو باعث شرم سمجھتا ہے جسے وہ اتنی بھی اہمیت نہیں دیتی جتنی اپنے پالتو کتے یا بلی کو دیتی ہے! لیکن گوویندو میرے احساسات سے بے خبر اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔

"بی بی جی جب میں رات کو آدھے پیٹ کھانا کھا کر، اپنے دوسرے ساتھیوں، دس اور قلیوں کے ساتھ پیٹ میں گھٹنے دے کر اور بازو سر کے نیچے رکھ کر لیٹتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری عورت بالکل میرے پاس —— بہت پاس ہو —— کبھی کبھی تو اس کا گرم گرم سانس تک محسوس ہونے لگتا ہے۔ ویسے ہی سندر کپڑے پہنے، ہونٹوں پر لالی لگائے، زیوروں سے سجی اونچا اونچا چٹلا (جوڑا) باندھے —— اس سمے مجھے وہ سندرتا کی اس رانی سے کہیں ادھک سندر لگتی ہے جو بیگم اور سونے بریر سال سر پر تاج رکھ اور ہاتھ میں چاندی کا پیالہ تھا کے "مس مسوری" بنائی جاتی ہے —— جب کبھی یہ "مس مسوری" میری رکشا پر بیٹھتی ہے تو میں یہی سوچا کرتا ہوں کہ اگر میری رانی کو بھی یہی کپڑے زیور پہنا دیے جائیں اور وہ بھی ایسا ہی سنگار کرے تو اس سے کہیں اچھی لگے اور پھر دن بھر کی تکان مجھے بہت جلدی سلا دیتی ہے نیند کی دیوی ہم جیسے غریبوں پر بہت مہربان ہے۔ بربائی اور پیٹ کی آگ ہوتے ہوئے بھی وہ جلدی سے ہمیں اپنے سایہ میں لے لیتی ہے اور سپنوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں میری استری بانہیں پھیلائے میری طرف دوڑتی ہے، بچے میری گود میں آکر بیٹھ جاتے ہیں اور میں سپنے میں اپنے سورگ کے درشن کر لیتا ہوں۔ پھر سویرے ہی مرغے کی بانگ کوے کی آواز اور پیٹ کی بھوک جگا دیتی ہے تو یہ ماننے کو دل نہیں چاہتا کہ من کی دنیا سونی ہے اور یہ سب مجھ سے ہزاروں کوس دور ہیں (اس کو گنتی کا اور فاصلہ کا کوئی احساس نہیں وہ سینکڑوں ہزاروں بے تکلف بولتا ہے) میں سوچتا ہوں میری استری اس وقت پنگھٹ پر پانی

بھر رہی ہو گی اور برہا کا وہ گیت گا رہی ہو گی جو گڑھوالی عورت ہمیشہ سے گاتی آئی ہے۔ اس گیت کا رس اور مٹھاس، اس کا درد اور دُکھ تم دیسی لوگ کیا سمجھ سکو گے ـــ اسے تو صرف وہ عورت جان سکتی ہے جس کا پتی۔ اس سے سینکڑوں برسوں سے دور ہو (دہی گنتی ست بے خبری ـــ یا شاید وہ فراق کی شدت کو ہزار اور سینکڑوں کہہ کر ظاہر کرنا چاہتا ہو) غربت اور مصیبت کی ماری ہو اور زمیندار، برہمن اور افسروں کی جھڑکیاں کھائی اور بیگار کرتی ہو۔ دُکھ بھتی اور انتظار کرتی رہی ہو۔

ـــــــــــ

یہ کہانی سننے میں کیسی ہی بے کیف اور بے ربط معلوم ہو اس کے انداز بیان کی سادگی اور خلوص نے اُسے میرے لیے دلچسپ سے دلچسپ ناول اور حسین سے حسین رومان سے زیادہ پُرکشش بنا دیا تھا ـــ اگر ہنڈیا جلنے کی بو نے مجھے بیدار نہ کیا ہوتا تو جانے کب تک میں یونہی بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہتی ـــ گوشت جل کر کباب ہو چکا تھا ـــ شاید فراق کی آگ نے اسی طرح گووندو کی بیوی کی جوانی اور روپ کو بھسم کر ڈالا ہو ـــ غربت اور مصیبت کی لپٹ میں اس کی خوب صورتی اور خوش مزاجی جھلس گئی ہو؟ مگر کیا ـــ کیا اس کا پریم ایسا ہی اٹل ہے یا مفلسی اور دوری نے اُسے بھی جلا ڈالا ہو گا؟ ایسا تو نہیں کہ اس "بلاگی" "با وفا" بیوی کسی اور کے دل کی آگ بجھا رہی ہو گی؟ سانپ کی طرح رینگ کر یہ زہریلا خیال میرے ذہن میں گھس آیا۔ اگر ـــ اگر ایسا ہوا ہو گا تو اس بدنصیب کی یہ مسرت ـــ جس کے بل پر وہ یہ ساری کٹھنائیاں جھیل رہا ہے خاک میں مل جائیگی اس کا ناتوان دل اس صدمہ کو سہار بھی سکے گا؟

اور جب میں نے واپس آ کر اس سے اپنے شبہ کا ڈرتے ڈرتے اظہار کیا تو اس کی آنکھیں غصے اور جوش سے چمکنے لگیں، جھریوں بھرا چہرہ تن گیا اور اس نے گڑھوالی عورت کی محبت اور وفا کی داستان سنانی شروع کر دی اور باتیں کرتے کرتے وہ اپنی بھٹی اور بے سُری آواز میں ایک گڑھوالی گیت گانے لگا ـــ یہ برہا کا وہ گیت تھا جو گڑھوالی حسینہ اپنے محبوب اور پتی کے فراق میں گایا کرتی ہے۔

تابچلی کے تاچ - گاؤد دھائی لا ندو رُسوا دھارو دیندی باچ
جھنگورا کو بوسٹ - کیوڑی کو موڑ و مرے ہوئی گے اور ا لو ٹ
چول بھری پاتھی - کیکاسرِدانی، اُلیں چیوڑو بھری پا تھی
میں پھانس کھانی سوا تیری نتھلی ادند ہنسر کی گو ند
کتری تو پیاز سو کا رد کا موڑا میرے جیون کی بڑے بیا تْ
دلی جالی دالا ناک کی نتھلی دیویو نہ جبا سو ا ما ل

او سانورے ہیتم جانے تو کہاں ہے ؟ میں تو تجھے گہری ندیوں میں آوازیں دے کر ڈھونڈرہی ہوں میری کلائیوں پر رنگین چوڑیاں ہیں مگر ان کا کیا فائدہ - اب تو ہی بتا میں ان کو کس کی سیج کا سرا ہنا بناؤں ؟ بھگوان کرے ساہوکار کا بیٹا مرجائے کیونکہ اس کا بیاج بڑھ گیا اور تم چلے گئے ہو مگر یہ بتا دوں کہ اب کے بھی تم نہ آئے تو میں نتھلی پر پھانسی لے کر مرجاؤں گی ۔"

اس کی آواز میں نہ رس تھا نہ ترنم مگر کچھ ایسا سوز تھا جو اس سے بھی بڑھ کر ہر اثر ہوتا ہے وہ گاتے گاتے رک گیا اور ایک دم کھڑا ہو گیا ۔" ارے بی بی جی بڑا نقصان ہو گیا - ڈوگیٹ کا وقت نکل گیا تم سے باتوں میں ۔۔۔ اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پہاڑی سے پگڈنڈی سے نیچے کنک ریک کی طرف بھاگا جا رہا تھا - اور جہاں وہ بیٹھا تھا اس جگہ میل اور گندگی کا ایک چکتا پڑا تھا اور بدبو ابھی تک آ رہی تھی یہ تعفن ۔۔۔ یہ داغ ۔۔۔ کیا آزاد ہندوستان کے ماتھے پر ایک داغ نہیں ؟

ایک دن میں ٹہلتے ٹہلتے کلٹری بازار سے ہوتی یونہی ایک گلی میں گھس گئی - شاید دیکھنا چاہتی تھی کہ ان چوڑی چوڑی پر رونق سڑکوں کے پہلو کی گلیاں کیسی ہیں ۔۔۔ گلی در گلی اور ہر طرف گندگی بدبو، نیلا، کیچڑ، گھوڑے کے ڈھیر ۔۔۔ مکھیاں اور گندے بیمار بچے جو اسی کیچڑ اور گھوڑے کے درمیان کھیل رہے تھے ۔۔۔ پل رہے تھے ۔۔۔ یہ بچے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے جیسے سوچ رہے ہیں کہ یہ کون جانور یہاں آ گیا ۔۔۔ کچھ دور ایک چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی جس پر بھنی لونگ پھلی

اور گڑ کے سیو رکھے تھے مگر ان بچوں کی نظریں کہہ رہی تھیں "یہ نعمتیں ابھی ان کی پہنچ سے بہت دور ہیں" میں گھبرا کر یہاں سے واپس جانے کو مڑی ہی تھی کہ سامنے سے گوبند آتا دکھائی دیا۔ ایک ہاتھ میں آٹے کی پوٹلی اور دوسرے میں کچھ سبزی مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر پہلے استعجاب کے آثار ظاہر ہوئے اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ "بی بی جی تم یہاں کہاں ---- اچھا اس دن تم نے کہا تھا تمہاری کوٹھری دیکھوں گی ---- آؤ بی بی جی تمہیں اپنا محل دکھا دوں ---- اور دو تین گلیوں کا پھیر دے کر وہ کوٹھریوں کی ایک لائن کے سامنے رک گیا اور ایک کوٹھری کے زنگ زدہ کواڑ جس کے رخنے ٹین کے ٹکڑوں سے بند کئے گئے تھے۔ آہستہ سے کھول دیئے ---- تعفن کا ایسا بھبکا آیا کہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گئی مگر فوراً ہی شرمندہ ہو کر آگے بڑھی مشکل سے بارہ فٹ مربع کوٹھری تھی جس کے کونوں میں چند چیتھڑے نما کمبل اور لحاف پڑے تھے اور ایک طرف کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن اور مٹی کے گھڑے رکھے تھے

"ہاں ہاں بی بی جی ---- میں اور میرے ساتھی ---- دس ساتھی ---- سب یہیں رہتے ہیں"

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں "تم دس آدمی اس کوٹھری میں رہتے ہو ---- اس میں تو دس جانور بھی نہیں بندھ سکتے ---- دس انسان ---- دس جاندار ---- کیسے اس میں رہتے ہو ---؟"

وہ ہنسا ---- زہرخند ہنسی "تم لوگ ---- کوٹھیوں کے رہنے والے ---- نہیں جان سکتے ---- میں بھی جب بھاری بھاری بکس اور بستر پیٹھ پر لاد کر ہوٹلوں اور کوٹھیوں کے بڑے بڑے شاندار کمروں میں سامان رکھنے جایا کرتا ہوں تو سچ مانو مجھے بھی بڑا اچنبھا ہوتا ہے ---- اتنے بڑے بڑے محلوں میں ایسے اونچے اونچے کمروں میں تم ایک ایک یا دو آدمی کیسے رہتے ہو ---- جب ---- جب جہاں اگر ہم جیسے سینکڑوں ہزاروں بھی سوئیں تو جگہ بچ جائے ---- اور ہمارا جی گھبرا جائے اتنی بڑی جگہ سے"

میں نے تصور میں دیکھا کہ دس انسان ---- جن کو انسان کہنا انسانیت کا منہ چڑانا معلوم ہوتا ہے ---- جانوروں سے بدتر حالت میں ساری رات کے ایک دوسرے سے اسی طرح جڑے ہوئے پڑے ہیں کہ کروٹ نہیں بدل سکتے ---- ٹانگیں نہیں پھیلا سکتے ---- ان کے جسموں کی بو ایک دوسرے کی ناک کی توضع

گر رہی ہے۔ ایک کے خراٹے دوسرے کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ مچھر، کھٹمل اور پسو اور سفید و سیاہ جوئیں ایک کے بستر سے دوسرے کے "بستر" کی طرف رینگ رہی ہیں تاکہ ان کا خون چوس سکیں جس کی سرخی پہلے ہی حاکم، افسر، ساہوکار اور زمیندار چوس چکے ہیں اور اب ان کی رگوں میں خالی پانی ہے ۔ وہ بھی خالص نہیں گدلا میلا پانی۔ ۔ یہ دس انسان ۔۔۔ اور ان جیسے اور دسیوں ہزار اپنے پھٹے کمبلوں میں خوخواب ہیں ۔۔۔ دن بھر کی محنت شاقہ نے انھیں تھپک تھپک کر سلا دیا ہے ۔۔۔ سرمایہ داری اور عیش پسندی کی کالی ماتا۔ تہذیب و تمدن، علم و آرٹ، شعر و ادب کی دیوی سیاست کے ٹھیکے دار، حکومت کے ارباب حل و عقد کھڑے اس حسین نظارے سے لطف اٹھا رہے ہیں ۔۔۔ ہنس رہے ہیں ۔۔۔ ان انسانوں کی بہیمیت پر ۔۔۔ اور اس قہقہے کی خوفناک آواز برمے کی طرح میرے کان میں چبھی ۔۔۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ جیسے سوتے سے جاگ اٹھی۔ یہ قہقہہ ۔۔۔ اس جانور نما انسان ۔۔۔ یا انسان نما جانور ۔۔۔ کا تھا ۔۔۔ جس کا نام گووِندو تھا۔ جو بڑا کہہ کر بلایا جاتا تھا ۔۔۔ جانے وہ کیوں ہنس رہا تھا۔ اس مہذب دنیا کی انسان دوستی پر یا مہذب انسانوں کی بہیمیت پر۔ یا اپنی حالت پر ۔۔۔

واپسی میں رستہ میں میں نے اس سے کہا ۔۔۔ گووندو ۔۔۔ کچھ اور حال سناؤ اپنے ہاں کا تو اس نے کچھ عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور گردن جھکالی ۔۔۔ یہ نظریں کہتی معلوم ہو رہی تھیں کہ تم آخر اور کیا پوچھنا چاہتی ہو ۔۔۔ ہماری زندگی میں کونسی ایسی بات ہے جو تمھارے لیے کشش ہوگی۔ بیچاری عورت محبت کے الاؤ اور فراق کی آگ میں جلا کرتی ہے۔ اس کو تم شہر کی عورت کیا سمجھو گی اس سے اور کیا لطف لوگی! تم خیالی دنیائیں بساؤ، رنگین کہانیاں لکھو اور رومانی افسانے سناؤ ۔۔۔ تم کیا جانو تمھارے دیس کے لاکھوں باسی اب تک کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ مفلسی، جہالت، گندگی، بھوک، محنت اور ذلت کے بھنور میں پڑے ہیں، سسک رہے ہیں۔ نہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں ۔۔۔ سود در سود کا چکر، رشوت کی گرم بازاری، خود ساختہ رہنماؤں کی بے دیانتی، قوم کے خیر خواہوں کی بے عملی یا سہل انگاری کی چکی انھیں پیس رہی ہے پیسے جا رہی ہے ۔۔۔ جن کا ماضی تاریک تھا ۔۔۔ جن کا حال تاریک ہے

اور جن کا مستقبل — کون جانے — ؟

وہ اور میں دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق چپ چاپ، چلے جا رہے تھے — شام کا دھندلکا سیاہی میں بدل رہا تھا — نیچے دور ڈیرہ دون کی لاکھوں روشنیاں چمک رہی تھیں اور آسمان پر دور دور ستارے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے امید کے ننھے دیوں کی طرح یہ روشنیاں کبھی ابھرتی تھیں کبھی ڈوب جاتی تھیں میرے ذہن کے روشن مستقبل کے لیے آشا کی ایک کرن [illegible] بلا میرا گھر آنے پر سلام کر کے خاموش واپس جانے لگا اور چند سیکنڈ بعد اس نے ایک پہاڑی گیت زور شور سے گانا شروع کر دیا — سارنگ مست جھمیلو

تو کولڑی آئی نے ہے جھمیلو — ائی گوری پچھو ہے جھمیلو
پھول گئیں بنوں ہے جھمیلو — گوہراں برنس ہے جھمیلو
چھینتالی ڈالیوں ہے جھمیلو — گوگنگتی گھوری ہے جھمیلو
گوری نگد بنو ہے جھمیلو — میلوڑی باسلو ہے جھمیلو

نئی رت چکر کاٹ کر پھر لوٹ آئی ہے — جنگل میں چاروں طرف خاک آلود درازوں میں گوہراں اور برانس کے رنگ برنگے پھول نکل آئے ہیں۔ درختوں کی جھومتی ہوئی شاخوں پر گھگھی سریلا راگ گا رہی ہے وادی کے دوسری طرف گہری ندیوں ادھر ہلوری بھی ہجر و وصال کے دکھ بھرے نغمے گا رہی ہے — اس کی آواز دھیرے دھیرے دھیمی پڑتی گئی اور آخر فضا میں ڈوب گئی —

صابر حسین صابر

غزل

میرے عرضِ شوق بے حد پر وہ شرماتے رہے
عشق کی رندانہ سرمستی سے گھبراتے رہے

میں رہینِ انتظارِ دیدِ جاناں اور وہ
آئینے خانے میں اپنی زلف سلجھاتے رہے

جن میں کی تھی میں نے تشکیلِ حیاتِ جاوداں
وہ محبت ریز لمحے مجھ کو یاد آتے رہے

کیا بتاؤں دوست کیا شے تھی وہ دنیائے خیال
اک تماشا تھا کہ وہ آتے رہے جاتے رہے

ہمتوں نے ساتھ چھوڑا تھک کے رک جانا پڑا
دشتِ الفت میں کچھ ایسے بھی مقام آتے رہے

خانقاہیں، مسجدیں، مندر، کلیسا، بتکدے
ہم بہر پہلو دلِ وحشی کو سمجھاتے رہے

جس قدر دیتا تھا صابر دل کو درسِ ترکِ شوق
اتنے ہی ان کی محبت کے پیام آتے رہے

کروپٹکن کا نراجی نظریہ

نیاز فتحپوری

نراج یا انارکزم کا مفہوم یہ ہے۔ کہ افراد انسانی اس طرح زندگی بسر کریں کہ ان پر کسی حکمراں جماعت کا تسلط و اقتدار قائم نہ ہو لیکن یہاں فوضویت یا نراج سے مقصود ایک خاص "اجتماعی" مذہب ہے جو چند علمی نظریات (THEORIES) کی بنا پر قائم ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نظریات صحیح نہ ہوں لیکن ان سے انکے مخترعین کی وسعت نظر و جدت پسندی ضرور ثابت ہوتی ہے۔

فوضویت جسے انگریزی میں انارکزم کہتے ہیں اپنی تاریخ کے لحاظ سے قدیم ہو یا جدید لیکن اس میں شک نہیں کہ متاخرین میں اس کا سب سے بڑا حامی کروپٹکن تھا۔ اور چونکہ اس کا مذہب متانت و علمی سنجیدگی سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے مختصراً اس کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کروپٹکن کون تھا؟

یہ بمقام ماسکو ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۶ء تک فوجی افسر رہا پھر پیٹرو گراڈ میں آکر ۱۸۷۱ء تک اس نے ریاضیات کا مطالعہ کیا (اس زمانہ میں وہ جمعیت جغرافی کا سکریٹری بھی تھا) اس کے بعد ۱۸۷۲ء میں بلجیم پہونچ کر مزدور جماعت کا ممبر بن گیا۔ اور اسی سال پیٹرو گراڈ واپس آکر ایک خفیہ انجمن کا رکن ہو گیا۔

حکومت کو جب خبر معلوم ہوئی تو اسے گرفتار کر لیا لیکن ۱۸۷۶ء میں وہ کسی طرح جیل سے بھاگ کر انگلستان پہونچا اور دوسرے سال سوئزرلینڈ چلا گیا۔ وہ یہاں ۱۸۸۱ء تک مقیم رہا جب یہاں سے بھی نکالا گیا تو وہ پھر فرانس و انگلستان کے مختلف مقامات میں پھرتا رہا اور ۱۸۸۳ء میں حکومت فرانس نے اسے اس الزام پر گرفتار کر لیا۔ کہ اس کا تعلق کسی خفیہ

انجمن سے تھا جب ۱۸۸۶ء میں آزاد ہوا تو پھر انگلستان آگیا اور یہیں پر سکونت اختیار کر لی۔ کروپٹکن کے اجتماعی خیالات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

(۱) اساس مذہب۔ (۲) قوانین کے متعلق اس کی رائے (۳) سلطنت یا حکومت کے متعلق اس کا مذہب (۴) ملکیت یا سرمایہ دار جماعت کی نسبت اس کا خیال

اساس مذہب اس کا خیال ہے کہ۔ انسان (یعنی اجتماع انسانی) کی غایت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ اور اس کا مستقبل ماضی سے زیادہ شاندار اور روشن نظر آئے۔ اس نے اپنے مذہب کی بنیاد نظریہ تحول یا نشوو ارتقا پر قائم کی ہے۔ یعنی انسان بھی تمام زندہ یا جامد مخلوقات کی طرح ایک دائمی تحول و ارتقا کی حالت سے گزر رہا ہے۔

اس کا اعتقاد تھا کہ (۱) ارتقاء انسانی کی رفتار اکثر تدریجی ہوتی ہے لیکن بعض وقت ایک فوری تغیر اور ناگہانی انقلاب بھی نظام بشری میں پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) ہر چند بشریت کا موجودہ نظام، چند اجتماعی قوتوں کے توازن و تناسب کا نتیجہ ہے لیکن اگر ان مجتمعہ قوتوں میں سے کوئی قوت علیحدہ ہو جائے۔ تو باقی ماندہ قوتیں کام جاری رکھتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ یہ متفقہ اجتماع نظام بشری میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے جس سے مقصود اس فوت شدہ توازن کا اعادہ ہوتا ہے۔

(۳) چونکہ بشریت کی راہ عمل اور حصول مقاصد میں بہت سے موانع پیش آتے ہیں۔ اس لیے وہ مصلحین جو انسانیت کو اس کے مقصود حقیقی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ ان موانع کا سخت مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے مرکز کو نہیں چھوڑتے۔ پھر چونکہ موجودہ سیاسی اقتصادی اور اجتماعی نظام ارتقاء بشری کے بالکل منافی ہے۔ اس لیے وہ کہتا تھا کہ وہ وقت بالکل قریب ہے جب دنیا میں۔ ناگہانی انقلابات پیدا ہوں اور بشریت کو دوزخ وجود سے نکال کر ایک روشن مستقبل کی شاہراہ پر لگا دیں۔

قوانین کے متعلق اس کی رائے

اس مسئلہ میں اس کا خیال تھا کہ ارتقار بشری کا تقاضہ ہے کہ موجودہ قوانین کو باطل کر دیا جائے کیوں کہ قوانین اجتماع بشری کو مراتب ارتقار حاصل کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ ہرچند ان قوانین میں اصحاب املاک کے ساتھ اجتماع بشری کی بھی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔لیکن اصحاب املاک کے ساتھ جس رواداری کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ وہ جمہور کے لیے سخت نقصان رساں ہے۔

ان قوانین کا مقصد صرف یہ ہے۔کہ اصحاب املاک اور سرمایہ داروں کا تسلط جمہور پر قائم رکھا جائے۔یہی وجہ ہے کہ بشریت بجائے ارتقار کے صرف ایک مرکز پر قائم نظر آتی ہے۔ اگر ان قوانین پر غور کیا جائے جن کے آگے انسان سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ تو ان کی تین قسمیں نظر آئیں گی۔

(۱) وہ قوانین جو ملکیت کے حامی ہیں۔(۲) وہ قوانین جو حکومت کے معاون ہیں۔ اور (۳) وہ قوانین جو افراد کی حمایت کرتے ہیں۔لیکن جب ان اقسام کی تحلیل کی جاتی ہے۔ تو نتیجہ وہی ایک نکلتا ہے کہ "نظام بشری کو ان سے سخت نقصان پہونچ رہا ہے"

پہلی قسم کی غایت یہ ہے کہ مزدوروں اور کاریگروں کو ان کی واقعی اجرت سے محروم رکھا جائے۔اور اصحاب املاک کو ان کے حقوق غصب کرنے کی اجازت دی جائے۔اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے۔کہ صاحب املاک صرف مزدوروں اور کاریگروں کے حقوق کے غاصب نہیں ہیں۔ بلکہ تمام اجتماع بشری کے بھی مجرم ہیں

دوسری قسم کے قوانین کا مقصد صرف یہ ہے کہ سرمایہ داروں اور امیروں کی اعانت کی جائے تاکہ ان کا تسلط جمہور پر قائم رہے اور اس مقصد میں شخصی دستوری اور جمہوری تمام حکومتیں متفق نظر آتی ہیں۔

تیسری قسم کے قوانین جو افراد کی حمایت کرتے ہیں۔ اپنی غایت کو پورا نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ قوانین مجرم کو سزا دے کر اُسے آیندہ ارتکاب جرم سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن

تجربات شاہد ہیں۔ کہ سزا کبھی مجرم کو ارتکاب جرم سے باز نہیں رکھتی۔ جو شخص جوش انتقام یا فاقہ کی وجہ سے کسی جرم کا اقدام کرتا ہے۔ اس کی نظر ہرگز عواقب پر نہیں ہوتی۔ بڑے شہروں میں ایک ایک دن کے اندر کئی مجرموں کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ اور اسی دن وہاں متعدد واقعے قتل کے ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جیل خانوں میں مقید رکھنے کی رسم مجرموں کے اخلاق کو اور زیادہ خراب کر دیتی ہے۔ اور جب تک تعزیر کے موجودہ اصول بدل نہ جائیں گے۔ اس وقت تک انسداد جرائم محال ہے۔

اسی بنا پر کروپٹکن کا خیال ہے کہ نظام بشری کے آیندہ انقلابات انسان کو قوانین سے بے نیاز کر دیں گے۔ کیونکہ پابندی قوانین فطرت انسان کے منافی ہے۔ قوانین کو ظاہر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور بشریت دور قوانین سے قبل ہزاروں برس تک اپنے نظام کو قائم رکھ سکی ہے۔ اس زمانہ میں نظام بشری کا شیرازہ انسان کی صرف چند فطری عادات سے مرکب تھا۔ جب سے افراد انسانی غالب و مغلوب، تابع و متبوع دو فریق تقسیم ہو گئے ہیں اسی وقت سے غالب فریق نے تسلط قایم رکھنے کے لیے قوانین وضع کرنا شروع کیے اور فوجی طاقت کے ذریعہ سے عام افراد پر ان کا نفاذ کیا لیکن اب وہ وقت قریب ہے کہ انسان قانون کی پابندی چھوڑ دے۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ جو قانون کی عامیانہ پابندی کے بالکل مخالف ہیں اور جب تک کسی قانون کی غرض و مصلحت متحقق نہ ہو جائے اس پر کاربند ہونا ضروری نہیں سمجھتے

پھر جب دنیا سے قانون اٹھ جائے گا تو انسان صرف اپنی فطری عادات پر قایم رہے گا جو ارادہ عام کے تحت ظہور میں آئیں گی۔ اور ان کے نفاذ کے ضامن وہ روابط و باہمی تعلقات ہوں گے جو اشتراک عمل اور باہمی سعی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور مخالفین کی سزا صرف یہ ہوگی کہ انھیں ہیئت اجتماعی سے خارج کر دیا جائے۔

حکومت کے متعلق اس کی رائے

کروپٹکن کو یقین ہے۔ کہ سلطنتوں کا خاتمہ بہت جلد ہونے والا ہے۔ جس کے بعد نوع انسان

کے لیے ممکن ہوگا۔ کہ وہ ترقی کے انتہائی مدارج تک پہونچ جائے۔

وہ کہتا ہے کہ سلطنتوں کا وجود کسی تاویل سے بھی مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ حکومت بجائے اس کے کہ مالدار لوگوں کے تسلط کو روکے قوی کو ضعیف پر ظلم کرنے سے باز رکھے، افراد کے مساعی عامہ کو اور زیادہ کچلتی ہے ان کے حقوق پامال کرتی ہے۔ اور اس مقصد کے لیے وہ اپنی فوجوں سے کام لیتی ہے۔ فوجوں کے مصارف اگر اس کی آمدنی سے پورے نہیں ہوتے تو دوسروں سے قرض لیتی ہے۔ جس کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے۔

سلطنتوں کے وجود سے بہت بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ آپس میں برسرپیکار ہوتی ہیں اس نزاع کا بڑا اثر صرف غربا پر پڑتا ہے کیونکہ نتائج جنگ اگر اچھے ثابت ہوں تو ان میں عام رعایا کا کوئی حصہ شامل نہیں ہوتا۔ درانحالیکہ جان دینے کے لیے انہیں کے سامنے دست سوال پھیلایا گیا تھا۔ پھر لطف یہ کہ اس مسئلہ میں تمام حکومتیں خواہ وہ جمہوری ہوں یا شخصی سب برابر ہیں اسی لیے یہ بالکل محال ہے کہ وہ طبقہ جو اپنے کو حکومت کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مصلحت عامہ اور جمہور کے مفاد میں کوشش کرے

اس میں شک نہیں کہ اس وقت متعدد اقسام کی آزادیوں کا نام لیا جاتا ہے۔ (مثلاً حریت مجالس حریت صحافت، حریت حقوق) لیکن ان تمام حریتوں سے صرف اسی صورت میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ وہ حکومت وارکان حکومت کے خلاف نہ ہوں۔ اور وجود حکومت کو معرض خطرہ میں نہ ڈالتی ہوں۔ ورنہ جلسے روک دیے جاتے ہیں صحافت مقید ہوجاتی ہے افراد قوم گرفتار کر لیے جاتے ہیں اور حکومت بہ جبر ان کے گھروں کی حرمت کو زائل کر دیتی ہے۔

حکومت اس اعتبار سے کہ وہ ایک نظام اجتماعی ہے۔ تاریخ بشری میں اس کا وجود زیادہ قدیم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اب پھر حکومتوں کے شیرازہ میں اختلال پیدا ہو رہا ہے۔ اقوام حکومتوں کے جابرانہ اقتدار سے آزاد ہونے کے لیے اپنی پوری کوششیں

صرف کر رہی ہیں۔ اور کوئی جماعت، کوئی قوم ایسی نہیں ہے۔ جو اپنے اندر استقلال ذاتی پیدا کر کے آزادانہ زندگی کی تمنی نہ ہو۔ تاکہ اُسے کسی خاص فرد یا جماعت کے سامنے ذلت کے ساتھ سرِ عجز جھکا دینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

جب دنیا سے حکومتیں مفقود ہو جائیں گی تو ان کے بدلے ایک حیات اجتماعی قائم ہوگی۔ جو اپنے مصالح مشترک۔ حقوق و واجبات کا پورا لحاظ کرے گی اور حقوق افراد میں انتہائی مساوات سے کام لے گی۔ پھر اس کے تحت بہت سی جماعتیں قائم ہوں گی اور ہر جماعت کے افراد حقوق و واجبات میں مساوی اور مصلحت مطلوبہ میں مشترک قرار پائیں گے۔ ہر فرد جماعت کے ساتھ طے شدہ شرائط کے لحاظ سے تعلق رکھے گا۔ اور شرائط مذکورہ کے نفاذ کے لئے عدالتوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ بلکہ ارتباط عام یا شیرازہ قومی قائم کرنے کے لئے باہمی احتیاج کافی ہوگی۔ ہر جماعت کا فرد اپنے فرائض کو با اختیار انجام دے گا۔ فرائض متعلقہ کی انجام دہی میں کسی دوسرے کا محکوم نہ ہوگا۔ الغرض بہت جلد یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ حصول حریت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان کسی کام میں اپنی طرف سے کسی اور کو وکیل یا نمایندہ نہ بنائے بلکہ بذات خود اس کے اہتمام و انصرام کے لئے آمادہ ہو۔

ان اصول پر عمل کرنے کے بعد جماعتیں وہی کام انجام دے سکیں گی۔ جو حکومت انجام دیتی ہے۔ اور اگر کبھی ایسے کاموں کے اجراء کی ضرورت ہوگی جنھیں کوئی خاص جماعت انجام تک نہیں پہنچا سکتی تو یہ جماعتیں آپس میں شریک ہو کر اس کو پورا کریں گی اور اس میں شک نہیں کہ اس طرح وہ موجودہ نظام حکومت سے زیادہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گی۔

ملکیت کے متعلق کروپٹکن کا خیال

وہ کہتا ہے۔ کہ ملکیت انفرادی کا ازالہ بھی ضروری ہے مستقبل میں صرف اشتراکی ملکیت ہی چاہئے۔ کیونکہ یہی انفرادی ملکیت وہ بلائے بد ہے جو بشریت کو مدارج کمال سے دور رکھتی ہے۔ اور یہی وہ مصیبت عظمیٰ ہے جس کی بدولت آج ہزاروں مزدور۔ بڑے بڑے شہروں میں بے کار

پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ انفرادی ملکیت چھوٹے زمینداروں کے لئے نہایت ضروری و مفید ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ زمیندار کا عہد زریں ختم ہو چکا۔ آج کل دنیا کے اکثر ملکوں میں زمیندار کی حالت یہ ہے کہ وہ رات دن قرض کی مصیبت میں گرفتار رہتا ہے۔ کبھی زمین رہن رکھتا ہے۔ کبھی اپنا ضروری سامانِ معاشرت بیچتا پھرتا ہے۔ گویا اس کا کام ہی یہ ہے۔ کہ وہ قرض خواہوں کا حساب درست رکھے اور بس۔

انفرادی ملکیت کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے دنیا میں امیروں کا طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جو دوسروں کی مشقت پر نہایت آرام سے زندگی بسر کرتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ہیئت عامہ میں سب سے زیادہ باعث فساد یہی طبقہ ہے۔

حق ملکیت بھی حکومت و قانون کی طرح بالکل جدید بدعت ہے۔ اس سے قبل ہر چیز مشترک تھی۔ اس لئے اب پھر انفرادی ملکیت کو چھوڑ کر ملکیت اجتماعی کے اصول کی طرف لوٹنا چاہیے۔ اور زمانے کا عام رجحان بتا رہا ہے کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب عام طبقہ مال داروں کی بے شمار دولت پر قبضہ کرلے گا۔ اور جاہ و دولت کا یہ اعتباری افتخار خاک میں مل جائے گا۔

عہد حاضر میں بالشوزم کے جو خیالات معلوم ہوئے ہیں وہ بھی بالکل یہی ہیں جو کروپٹکن نے ظاہر کئے ہیں لیکن سوال صرف نظریات بنانے اور بگاڑنے کا نہیں ہے بلکہ انھیں قابلِ عمل ثابت کرنے کا ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ کہ فوضویت کے یہ خیالات نہایت دلچسپ ہیں۔ اور استدلال بھی نہایت خوبصورت ہے لیکن دیکھنا یہ ہے۔ کہ اس پر عمل کیونکر ممکن ہے اور پہلے کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ افراد بشری میں غالب و مغلوب، تابع و متبوع کی تفریق کیونکر پیدا ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے۔ اگر وہ اسباب اب بھی

موجود ہیں تو فطرت کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کے پیدا کئے ہوئے علل بیکار ثابت ہوں اور ان کا کوئی نتیجہ نہ پیدا ہو۔

برتری و تفوق کا مسئلہ نیا نہیں ہے۔ بلکہ عہد عتیق میں بھی اسکا سراغ ملتا ہے۔ اس لئے اگر آج ہم اس امتیاز کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اگر تمام افراد انسان کو ایک سطح پر لے آنے کے متمنی ہیں تو اس کی تدبیر صرف یہی ہے۔ کہ اسباب تفوق کو اس قدر عام کر دیا جائے کہ ہر شخص اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت کا مالک ہو جائے اور دیگر افراد انسانی اس کو نظر انداز نہ کر سکیں۔ ورنہ یوں تو وہی جہل و علم کی جنگ ہوگی۔ وہی ضعف و قوت کا مقابلہ ہوگا۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ ایک اور صرف ایک ہی ہوا ہے۔

الجغرافیہ
(ایک تعارف)

ایس۔ ایم۔ رفیع اللہ

تاریخی اعتبار سے جغرافیہ جدید علمی حیثیت اختیار کرنے سے پہلے متعدد علمی منازل سے گزرتا رہا اور قدرتی طور پر ہر منزل یا دور میں اس کا ایک مخصوص مفہوم ہوتا تھا جو پچھلے اور آئندہ دونوں نظریات سے کچھ حد تک مختلف تھا چنانچہ بطلیموس کے دور کا جغرافیہ ایسے علم اقالیم پر مبنی تھا جس کی بنیاد اس فلسفہ پر تھی کہ جغرافیہ ایک علم آفاقی اور مضمون ارضی ہے اس فلسفہ کے دونوں جز اہم بھی ہیں اور حقیقت سے قریب بھی لیکن صرف اسی وقت جب بعید از قیاس اور چکر دار تاویلات کو راہ دی جائے کیونکہ اس فلسفہ کا پہلا جزو غیر واضح اور خاصا مبہم ہے کسی علم کو محض آفاقی کہدینے سے اس علم کا صحیح تعارف نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کی راہیں اور میدان متعین ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ تعریف الفاظ کے نظم کے اعتبار سے جتنی شاندار ہے اتنی ہی جلد یہ فراموش کردی گئی حالانکہ نویں اور دسویں صدی کے عرب جغرافیہ دانوں میں بطلیموس کے نظریات کا خاصا اثر قائم رہا لیکن تعارفی نظریہ بدل کر کچھ زیادہ واضح ہو گیا اور ایک مرتبہ پھر جغرافیہ کی تعریف ماضی کی طرف گھوم گئی قدیم یونانی طرز کے مطابق جغرافیہ کی تعریف اس کے نام کے تجزیہ میں مضمر سمجھی جانے لگی اس کا مقصد زمین کے مختلف حصوں کے حالات کا علم حاصل کرنا قرار پایا چنانچہ علم آفاقی اور مضمون ارضی، سے گھٹ کر صرف مضمون ارضی، رہ گیا نتیجہ کے طور پر اس کے بڑے عالم دنیا کے مسافر بنے مسلم عربوں نے اور بعد میں یورپی لوگوں نے بڑے بڑے سفر اختیار کئے اور نئے نئے حالات و مقامات دریافت کیے۔ جغرافیہ کی حدود کو وسیع کیا اور اس میں عظیم الشان معلومات کا اضافہ کیا یہ علم ترقی کے نئے منازل طے کرنے لگا ہر جویائے علم جو سفر پر جاتا تھا اپنی معلومات سے جغرافیہ کے

ذخیرہ علمی میں اضافہ کرتا تھا لیکن قطع نظر اس اضافہ کے جو بدیہی ہے لیکن اعدادی اس علم میں کوئی مستقل قسم کا ٹھوس اور بنیادی اضافہ نہیں ہوا سفرنامے جن پر اس کی ترقی کی بنیاد پڑی تھی اکثر و بیشتر حکایتی انداز پر تھے ان میں مقامات کے نام وہاں کے جمادات و نباتات وحیوانات کے سرسری حالات اور لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں کے بیانات بکھرے ملتے ہیں تنظیم سیاسی طرز معاشی نظام مدن مذہبی رسومات و عقائد وغیرہ کے تذکرہ بھی ملتے ہیں یہ سب کچھ ملتا ہے اور اس کی اہمیت اور قدر سے انکار کھلی حقیقت کے انکار کے مترادف ہے لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ علم جغرافیہ کو ابھی تک کوئی ایسا انداز فکر اور بنیادی نظریہ نہیں حاصل ہوا تھا جو اس کی انفرادیت کو ممیز و ممتاز کرتا۔ خام مواد تو بہت اکٹھا ہوگیا تھا لیکن ابھی اس کو ایسے ڈھنگ پر منظم کرنے کا طریقہ نہیں دریافت ہوا تھا کہ جس کے متعلق بلاتذبذب یہ کہا جا سکتا کہ یہ حالات وواقعات کے جائزہ تجزیہ و ترکیب کا خاص جغرافیائی انداز ہے اس مسئلہ کو یوں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً نباتات کا مطالعہ ایک عالم نباتات BOTANIS بھی کرتا ہے اور عالم کیمیا CHEMIST بھی ایک طبیب بھی کرتا ہے اور ایک عالم کاشتکاری بھی یہ سب ہی ایک عنوان یعنی نباتات سے بحث کرتے ہیں لیکن سب کی رائیں مختلف ہوتی ہیں ان کے انداز فکر الگ ہوتے ہیں ان کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور وہ ایسا انداز مطالعہ اختیار کرتے ہیں جو ان کو اس متعین منزل تک پہنچا دے چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ علوم اپنی اعلیٰ بلندیوں پر عنوانات کی بنیاد پر اتنے ممتاز نہیں ہوتے جتنے اپنے فلسفے کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ یہ سوچنا کچھ درست نہیں کہ کائنات کے اجزائے ترکیبی کا مختلف علوم کے درمیان بٹوارہ ہوگیا ہے مختلف چیزوں کے حقوق مختلف علوم کے لیے محفوظ ہوگئے ہیں علوم کے درمیان امتیاز قائم کرنے کی یہ بنیاد کچھ مضبوط نہیں چنانچہ بہرا س تنظیم علم کے لیے جو اپنی مکمل انفرادیت کا دعویٰ رکھتا ہو یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے اندر ایسا مرکز فلسفہ رکھے جو کسی اور طرز علم میں کما حقہٗ اور من حیث الکل نہ پایا جاتا ہو کچھ اسی قسم کی کمی ہے جو ابن خلدون کا کال رٹر اور وان ہمبولڈ کے زمانے سے پہلے تک کے جغرافیہ میں بری طرح محسوس ہوتی ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ علم مسالک ممالک یا بلاد و مقامات جغرافیہ کے میدان خصوصی نہیں تھے۔ کرہ ارض مختلف خطوں میں تقسیم اور ہر خطہ کا تفصیلی مطالعہ (جس حد تک بھی ممکن تھا) یقیناً ایک ایسا امتیاز تھا جس نے جغرافیہ کی انفرادیت کو قائم کیا اور قائم رکھا لیکن محض انفرادیت اور مستند علمی انفرادیت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ علمی انفرادیت کے ضوابط و معیار مقرر ہیں اس کے اصول بڑی حد تک مستقل ہیں۔ موجودات کا تجزیاتی مشاہدات کی بنیاد پر استدلال اور استدلال کی روشنی میں استنباط جو کسی مخصوص نظم علمی کی طرف رہنمائی کرے وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے علمی انفرادیت مرکب ہوتی ہے کائنات کے کسی جزو کا محض مشاہدہ یا محض بیان اس تنظیم مشاہدہ کو موجود تو کرسکتا ہے لیکن اس میں انفرادی علمی علویت اور درج اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب اس تنظیم مشاہدہ کی تہ میں کوئی معقول مقصد بھی ہو اور جس حد تک پہنچنے کے لیے ان مشاہدات کو مخصوص طرز فکر اور طریقہ استدلال کے ساتھ اس طرح مربوط کردیا جائے کہ مستور حقائق جو ظاہری حقائق کے امتزاج کی تہ میں گم رہتے ہیں سامنے آجائیں۔ چنانچہ ہمبولٹ وغیرہ سے پہلے تک جغرافیہ کو انفرادیت ضرور حاصل تھی اس کا میدان بھی الگ تھا لیکن اس میں وہ معیاری علویت نہیں پیدا ہوئی تھی جس کے بھروسہ پر وہ علمی انفرادیت کا سچا مستحق ہونے کا دعویٰ کرسکتا۔ بڑی حد تک یہی وجہ ہے کہ ایک دو صدی قبل تک جغرافیہ کو نصاب تعلیم میں ثانوی حیثیت بھی مشکل ہی سے حاصل تھی لیکن یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہنی نہیں تھی ابن خلدون اور رٹر جیسے عالموں کی گہری نگاہوں نے ان تاروں کو دیکھ لیا جن میں جغرافیائی معلومات کو پرو کر علمی سطح پر ابھارا جاسکتا تھا ان حکیموں نے اس فلسفہ کو مربوط کیا جو ابتک بری طرح بکھرا ہوا تھا۔ ایسے طرز فکر کی بنا ڈالی جو جلد ہی جغرافیہ کا مستند مرکزی فلسفہ بن گیا۔ اس بنیاد پر عمارت قائم کرنے کا کام ویڈال ڈی لا بلاش فریڈرک ریٹزل اور جین برونہز کے ہاتھوں انجام پایا۔

ابتداء آفرینش سے انسان کی یہ کوشش رہی کہ وہ نظام کائنات میں اپنے مقام کو پہچانے کائنات اور کائنات کے اجزاء ترکیبی کی علت و غایت سمجھے طبعی طاقتیں اور ان کا مسلسل ظہور انسانی

تجسس کو بیدار کر رہا تھا۔ قدیم انسان اپنی بساط کے مطابق زندگی اور ماحول کے درمیانی رشتہ کے راز کو حل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ علم اور علمی تجسس کی بنیاد در اصل اسی سعی پیہم کا نتیجہ ہے ماحول کے مختلف اجزا کے مطالعہ سے مختلف علوم پیدا ہوئے اور وہ بنیادی تجسس مختلف سمتوں اور شعبوں میں بٹ گیا۔ ہر شعبہ بڑھ کر اور ترقی پاکر ایک مستقل علم بن گیا اسی حقیقت سے متاثر ہو کر پروفیسر بروزنے آج سے تقریباً تیس سال پہلے اپنے خطبہ صدارت میں بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ جغرافیہ کو ام العلوم کا خطاب دیا۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ نئے نئے علوم کے پیدا ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ابتدائی تجسس بکھر کر شعبہ جاتی بن گیا۔ ہر تنظیم علم کے ماہر نے اپنے دائرہ کے اندر رہ کر اس مسئلہ کا حل تلاش کیا۔ مطالعہ ماحول کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم یونانیوں کے زمانے سے آج تک اس مسئلہ پر جتنی تحقیقات ہوئی ہے اور جتنی تصانیف کی گئی ہیں ان میں شاعروں سے لے کر قانون دانوں تک مصوروں سے لے کر سیاست داں تک ادیب سے لے کر سائنس داں، ڈاکٹر تک اور فوجی افسر سے لے کر فلسفی تک ہر شعبہ خیال کے عالم کا حصہ ہے ہر مصنف و محقق نے اپنے اپنے ضبط علمی کے مطابق نظریات قائم کیے اور انھیں کو سب سے زیادہ حقیقت کے قریب سمجھا۔ فرینکلن تھامس نے اپنی لاجواب تصنیف ENVIRONMENTAL BASIS OF SOCIETY میں اس مسئلہ کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے کم و بیش ۱۵۰ مصنفین کا حوالہ دیا ہے جن میں اکثریت غیر جغرافیہ دانوں کی ہے اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماحول کا مطالعہ عالموں کے ذہنوں میں کتنا اہم تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس معاملے میں کتنی عصبیت برتی جاتی تھی اس میں شک نہیں کہ ہر عالم انسانی زندگی اور اس کے جغرافیائی ماحول کے رشتہ کے راز کو کھولنے میں دلچسپی لیتا تھا اس کی تحقیقات میں منہمک تھا لیکن یہ مسئلہ بذات خود اس کے مخصوص ضبط علمی کا نکتہ مرکزی نہ تھا۔ اسکے علم کا بنیادی فلسفہ اور مقصد نہ تھا چنانچہ مختلف شعبہ جاتی تحقیقات میں کوئی رابطہ پیدا نہ ہو سکا یہاں تک کہ لا بلاش اور برونز جیسے عالم جغرافیہ دانوں کی کاوشوں اور علمی تحقیقات نے ان بکھرے ہوئے نتائج اور نظریات کو عالمانہ انداز میں مربوط و منسلک کر کے علم جغرافیہ کے مخصوص فلسفہ کو قائم کیا جو آج بھی اصولی اعتبار سے جغرافیہ کا

بنیادی مرکزِ خیال سمجھا جاتا ہے HUMAN GEOGRAPHY یا انسغرافیہ اسی فلسفہ کا نام ہے
جب سب سے پہلے انسان نے زمین پر پہلا قدم رکھا تو روحِ ارضی نے اس کا استقبال ان الفاظ میں کیا

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ　　مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

یہ دعوت مطالعہ تھا انسان نے اسے قبول کیا اپنے ماحول کو دیکھا اس کا مطالعہ کیا اور سمجھا اسکے تقاضے پہچانے اپنی ضروریات زندگی کو محسوس کیا۔ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے تگ و دو شروع ہوئی۔ کائنات کے دو عظیم ترین عنصر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ تصادم پیہم سے انسان کے سامنے زندگی کی نئی نئی راہیں کھلیں۔ مشکلات سامنے آئیں ان کے حل تلاش ہوئے انسان نے ہر اُس رکاوٹ کو جو اس کی زندگی کی سُبک روی اور سہولت کے راہ میں حائل ہوئے حتی المقدور دور کرنے کی کوشش کی اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی میں بھی ایسی لچک پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ معقول حد تک آسانی کے ساتھ ماحول کے وسیع تقاضوں کے مطابق ڈھل سکے چنانچہ اس دہرے طریقے سے انسان نے اپنی زندگی کی تشکیل شروع کی کچھ ماحول کی پیدا شدہ پابندیاں سہیں اور کچھ اپنی جاری کی ہوئی پابندیاں ماحول پر عائد کیں انسان اور ماحول میں ایک نہ مٹنے والا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس رشتہ کا تفصیلی و تشریحی مطالعہ مختصر الفاظ میں انسغرافیہ کی تعریف ہے۔

اصولی اعتبار سے دنیا میں صرف دو بڑی طاقتیں بروئے کار ہیں ایک میں صلاحیت شعوری دوسری اس سے یکسر خالی۔ ایک اپنے اظہار میں سوجھ بوجھ قوت اور فیصلہ کو دخل دیتی ہے دوسری اپنے اظہار میں قطعی بے شعور ہے۔ مثال کے طور پر بقول برونھز یہ بارشیں یہ ہوائیں اور آندھیاں یہ دریا اور سمندر یہ کوہ اور صحرا یہ نباتات و حیوانات اپنے فرائض میں اسی طرح منہمک رہتے خواہ انسان زمین پر قدم رکھتا یا نہ رکھتا یعنی یہ قوتیں اپنے اظہار کے سلسلے میں ذرہ بھر بھی انسان کی موجودگی پر منحصر نہیں معلوم ہوتیں ان کا ایک نہج قائم ہے اور اس پر یہ بغیر کسی شعور و فہم کے جاری و ساری ہیں ان کو نہ مقصد سے غرض ہے نہ مفاد سے نہ اس کی پرواہ ہے کہ وہ نقصان کا سبب ہیں یا ہو سکتی ہیں یہ بقول برونھز وحشی 'WILD' طاقتیں اصولی اعتبار سے آج بھی اسی طرح اپنا ظہور کرتی

لیتی ہیں جس طرح انسانی زندگی زمین پر شروع ہونے سے پہلے کرتی رہی ہوں گی۔ قدرت نے اس وحشی طاقت کے خلاف توازن پیدا کرنے کے لیے ایک عاقل اور ذہین عہ طاقت انسان کی شکل میں پیدا کی اس ذہین قوت نے ماحول کی قوتوں کی باگوں کو ایک ایک کر کے تھاما اور ان کے رخ بتدریج اپنی خواہش اور اپنی ضروریات کے مطابق موڑے وہ طاقتیں جو باعث تباہی و بربادی لاتی تھیں اب زندگی بخشنے لگیں انسان نے اپنی فہم و ذکا سے پورے ماحول کو ایک گودام میں تبدیل کر کے رکھ دیا جس میں سے اپنی بساط اور ضروریات کے مطابق خام مال حاصل کرنا اس کی زندگی کا جزو اعظم بن گیا حالات نے اسکو اس کی زندگی کے خاکے دیے اور اس نے انھیں حالات کی مدد سے ان خاکوں میں رنگ بھرے۔ چنانچہ یہ کہنا کچھ زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا کہ ایک طاقت دوسری طاقت سے مخاصمت رکھتی ہے یہ دونوں دوش بدوش اور شانہ بشانہ چلتی نظر آتی ہیں ایک طاقت مواد مہیا کرتی ہے دوسری زندگی کی تشکیل۔ اس باہمی تفہیم و مفاہمت کو ایک دفعہ سمجھ لیا جائے تو بہت سے اختلافات جو انسجغرافیہ میں انسان اور ماحول کے درمیان رشتہ کے مسئلہ تک پیدا ہو گئے ہیں بڑی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔

انسانی زندگی اور طبعی ماحول کے درمیان رشتہ کی نوعیت کا مسئلہ نہایت اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اس سلسلہ میں متعدد مکتب خیال پیدا ہو چکے ہیں ہر مکتب اپنے انداز خوبیاں اور خامیاں رکھتا ہے اس لیے قطعیت کے ساتھ کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی علمی دیانت داری کی رو سے کیا جانا چاہیئے بعض محققین کا میلان اس طرف ہے کہ انسان ماحول کے آگے قطعی غلام کی سی حیثیت رکھتا ہے اسکی زندگی ماحول سے منضبط ہوتی ہے ماحول اپنے اثرات میں قطعیت رکھتا ہے انسان اپنی جسمانی دماغی روحانی غرض ہر قسم کی زندگی کی ساخت میں ماحول سے قطعیت کے درجہ تک متاثر ہوتا ہے اس مکتب خیال کے زمرہ میں ارسطو۔ بکل۔ مانٹیسکو

عہ برونھز نے اس قوت کے لیے کوئی اصطلاح نہیں استعمال کی ہے لیکن میں WILD FORCE مقابل میں WISE FORCE کے استعمال کو قطعی منطقی سمجھتا ہوں۔

ریٹزل۔ سیمپل۔ ہنٹنگٹن۔ وغیرہ کے نام خصوصیت کے مالک ہیں۔ یہ ماحول کے اثرات کے سلسلے میں بے حد انتہا پسند اور تشدد پسند ہیں۔ ان کے بالکل برعکس محققین کی ایک دوسری جماعت ماحول کو یکسر غیر موثر مانتی ہے ان کا نظریہ ماحول پرستوں کی عین مخالف حدود کو چھوتا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی میں علاقائی تنوع نسلی ساخت کا نتیجہ ہے اس میں ماحول کو کوئی دخل نہیں ان علمار کی شدت پسندی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ایک مقام پر پیرسن نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان کی زندگی کی تشکیل اور اسکے علاقائی اختلافات میں ماحول کا دخل ۱۷ فی صدی سے بھی کم ہے ان میں اکثر عالموں کا خیال ہے کہ انسان کو قدرت نے مختلف علاقائی ماحولوں میں مختلف نسلی خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا تاکہ بنیادی طور پر ہی اس کی زندگی اور قدرتی ماحول میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے ان مکاتب خیال کے دلائل اور تفصیل۔ اور حسن و قبح سے یہاں بحث نہیں یہ بذات خود ایسے عنوانات ہیں جن پر پورے طور پر تبصرہ کرنے کے لیے الگ الگ مضامین کی ضرورت[۲۲] ہے۔

ان دو انتہا پسند جماعتوں کے درمیان عالمان جغرافیہ کی ایک تیسری جماعت ہے جو امکانات کی قائل ہے ان کے نزدیک انسان اور ماحول کے درمیان کوئی جھگڑا یا مخاصمت نہیں ہے ماحول نہ غلام ہے نہ آقا نہ بے حد موثر ہے نہ بالکل غیر موثر اسی طرح انسان ماحول کا نہ بالکل آقا ہے نہ بالکل غلام نہ وہ اس سے قطعی آزاد ہے اور نہ اس پر قطعی منحصر انسان بے پناہ ذہنی صلاحیتوں کا مالک ہے اور ماحول بے پناہ مادی دولتوں کا۔ یہ انسان کی اپنی صلاحیت ضرورت اور فیصلہ پر منحصر ہے کہ وہ ان دولتوں میں سے کون کون سی دولت کس کس طرح اپنے کام میں لائے۔ گویا قطعیت کے ساتھ کوئی پابندی ماحول کی طرف سے انسان پر عائد نہیں ہے وہ امکانات انسان کے آگے پیش کرتا ہے ان امکانات کو مادی حقیقت میں تبدیل کر دینا انسان کا کام ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان اور ماحول کے مسئلہ پر کسی مقررہ نظریہ سے غور کرنا بنیادی غلطی ہے وہ حقائق کو حقائق کی صورت میں مطالعہ

---

۲۲ اس پر میرا انگریزی زبان میں ایک علیحدہ مضمون بعنوان CHIEF SCHOOL OF HUMAN GEDGRAPHY ہے۔

کر کے غیر جانبدارانہ نتائج اخذ کرنے کے قائل ہیں۔ اس مکتب خیال میں لا بلاش اور برونھز بے حد ممتاز ہیں۔

گو کہ یہ موقعہ مکاتیب خیال کی تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے لیکن یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ اسی ایک رشتہ کی تشریح پر پورے انسفرافیہ کی بنیاد قائم ہے انسان کی زندگی اور قدرتی ماحول دونوں لاتعداد اجزاء ترکیبی سے مرکب ہیں چنانچہ انسفرانیہ کے حدود کے اندر انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی تشریح اور ماحول کے ہر جزو کی تفصیل داخل ہے اس تشریح و تفصیل کا مقصد انسان کو نظام کائنات میں اس کا اپنا صحیح مقام سمجھانا ہے تاکہ موجودہ زندگی کی ساخت کو جانچا جائے اور آئندہ زندگی کے نقشے زیادہ معقول اور منظم طریقہ سے تیار کئے جائیں۔ پورا ماحول معہ اپنی بے پایاں دولتوں کے انسان کے تصرف کیلئے ہے یہ صرف انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ اپنے لیے بہتر سے بہتر راہ قائم کرے اور یہ اسی وقت صحیح طور پر ممکن ہے جب وہ اپنے اور اپنے ماحول کے رشتوں کو بلا کسی علمی عصبیت کے زیادہ سے زیادہ سمجھے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں ۔۔۔ یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں ۔۔۔ تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

علی گڈھ نئے ہندوستان میں

منظور الحسن برنی

ملک کی ہنگامہ آرا بڑی بڑی بستیوں اور رونق افشا ماں کے مرکزوں سے الگ تھلگ، علی گڈھ کی چھوٹی موٹی طرب انگیز دنیا ہندوستان کی رومان پرور قصباتی زندگی کا ایک مثالی نمونہ پیش کرتی ہے۔ دانش کدۂ علی گڈھ کے قیام، اس کی مسلسل مساعی اور دلچسپیوں نے اک خاموش فضا میں پچھلے اسّی برس سے تربیت ذہن اور تہذیب گری کا جو ناقابل فراموش فرض انجام دیا ہے وہ قومی زندگی اور ملکی تعمیر و ترقی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ علی گڈھ کا جغرافیائی وقوع کچھ ایسا ہے کہ یہ بالکل فطری انداز پر ذہن کی پرورش اور دماغی بالیدگی کے لئے بڑی موافق زمین فراہم کرتا ہے۔

علی گڈھ میں شام مصر اور شب شیراز کی رنگا رنگیوں کے پہلو میں اگرچہ ارمانوں کی خادریں سجائی جاتی ہے۔ لیکن نوجوان طالب علموں کی عام زندگی کھیل کود، پڑھائی لکھائی، یونین کے ہنگاموں، الکشن کی مار پٹائی اور کامن روم کی چیخ و پکار سے آگے نہیں بڑھتی۔ نہ یہاں چاندنی چوک ہے نہ حضرت گنج، یہاں انار کلی، کلفٹن اور میرین ڈرائیو بھی نہیں ہے اگر ٹہلتے ہوئے گئے بھی تو تقوی پارک تک جو بہار افزا بھی ہے اور پرسکون بھی۔ جہاں حسن فطرت کی جلوہ سامانیاں بھی ہیں اور کیف و سرور کے سربستہ خزانے بھی لیکن بازاری شور و غل، آبادی کے ہمہمے اور ٹراموں، موٹروں اور بسوں کی گھڑگھڑاہٹ دور دور تک سنائی نہیں دیتی۔

یونین کے سالانہ انتخابات علی گڈھ کی زمین کو دیوانوں کا دشت جنوں بنا دیتے ہیں۔ دسمبر جنوری کے

کڑکتے جاڑوں میں یہاں رومانوں کے شہر طرب کی مستی چھلکتی نظر آتی ہے۔ اور امتحان سے کچھ پہلے نمائش کے دوران میں علی گڈھ اپنا چولا بدل کر جان نثار "پروانوں" کی بزم و فا بھی بنتا ہے اور سال میں کبھی کبھی ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب کسی نہ کسی دلنواز تقریب کے سامان فراہم ہو جاتے ہیں۔ کوئی اعلیٰ معیار کا ادبی اجتماع: بڑے پیمانے پر کوئی علمی یا سائنسی جلگٹ، کسی عظیم شخصیت کی آمد، کھیل کا کوئی بڑا مقابلہ یا ورزشوں کا کوئی اچھوتا مظاہرہ یہ ایسے مواقع ہیں جو علی گڈھ کی مختصر سی دنیا میں ہجوم نشاط بھی ہوتے ہیں اور عرفان نظر کا سامان بھی۔ جسمانی نشوونما اور ذہنی آسودگی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے۔ ان نت نئی تقریبوں میں جامعہ کے نوجوان دلوں کی کلیاں زعم خود حسن ٹپکانے لگتی ہیں، پھولوں سے جوانی ابلنے لگتی ہے اور توازن جذبۂ و فکر سے جب زمین رنگ و بو ہموار ہو جاتی ہے تو اس سے علم، عمل، فکر اور حسن و عشق کے وہ سوتے پھوٹتے ہیں جو ہندوستان ہی نہیں دنیا کے گوشے گوشے سے جوئے حیات کے مانند گزرتے ہیں۔ یہ سوتے جہاں نوجوان دلوں کو حریت نفس و فکر سے معمور کرتے ہیں وہیں زندگی آموز ترانوں کی دُھن سے میں وطن کے حریت پسند مجاہدوں کو جام جہاں نما بخشتے ہیں۔ غرض علی گڈھ کے اس چمن میں نونہالوں کی گل پوش امنگوں کا سہاگ، اپنی محدود وسعت کے باوجود، شروع سال ہی سے اتنا چنچل اور شوخ ہو جاتا ہے کہ بس دیکھتے ہی بن پڑتا ہے۔

لیکن یہ سال اس حیثیت سے بہت ممتاز رہا کہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے وقفے کیساتھ مسلسل تقاریب کا ایک لامتناہی سلسلہ وجہ زندگی رہا ہے۔ آغاز سال ہی سے ہند اور بیرون ہند کے ارباب علم و فضل، مشاہیر بساط سیاست، والیان تخت و تاج، پادشاہ و ملکہ، اور ناموران میدان بازیاں، اس مرکز علم و ادب میں اس طرح آتے رہے گویا ایک خوشگوار ماحول کے جلو میں شادکامیوں کا اک کارواں چلا آتا ہے یا پھر شفاف نیلگوں آسمان پر خوشنما دودھیا کہکشاں بکھری پڑی بہار دکھا رہی ہے۔

یہ تقریبیں، جلسے جلوس، مہمانوں کے خیر مقدم وقتی طور پر تو خوشگوار تھے ہی لیکن ان کا اور تابناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے علی گڈھ کو بہتر اور نمایاں طریقے پر دنیا کے علمی، سیاسی اور ثقافتی حلقوں سے روشناس کیا ہے اور اس زبردست کام کی انجام دہی کے لئے بہتر زمین فراہم کی ہے جو علی گڈھ کے ساٹھ منتہائے نظر اور بنیادی جبر کی حیثیت رکھتا ہے۔

دراصل ہندوستان کی لمبی زندگی میں علی گڈھ اور تحریک علی گڈھ ایک نادر اور غیر معمولی تجربہ ہے یہاں ہندوستانی تمدن کے اس رخ کو جو ہندو مسلمان کے صدیوں کے اختلاط سے ظہور پذیر ہوا ہے، نئے قالبوں میں، اور زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق کرنے میں ایک بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اس ادارے کے قیام کی ضرورت پیش آئی۔ نوے سال تک ایک خاص نہج کے پیش نظر، وقت کے مطابق اور تغیرات کے ساتھ ساتھ اس ادارے نے مشرق اور مغرب کے خوشگوار امتزاج کے لئے کام کیا۔ انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد ہندوستان میں جمہوریت کے اصولوں کی وسیع تر عملی تعبیر کے سلسلے میں یہ ادارہ سرگرمی ضبط و نظام اور خالص ذہنی اور تہذیبی حیثیت سے سرگرم کار رہا ہے۔

دراصل نئے ہندوستان میں علی گڈھ نہ صرف ایک نادر تجربہ ہی ہے بلکہ مختلف نظریہ ہائے فکر کے اختلاط اور ہندو مسلم اتحاد کی تجربہ گاہ بھی ہے۔ ملک کے کونے کونے سے دوستداران علم و فضل کشاں کشاں علی گڈھ کی طرف مقناطیسی کشش کی طرح کھینچے چلے آتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ چین، انڈونیشیا، ملایا، برما، نیپال، انڈوچائنا، سیلون، عراق، پاکستان، وسطی افریقہ، مصر، سوڈان جنوبی افریقہ، الجزائر اور دوسرے کئی ملکوں کے سپوت یہاں زیر تعلیم ہیں۔ ہندوستانی طلبہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی دہریہ اور غیر دہریہ غرض ہر مذہب اور نقطۂ نظر کے ماننے والے یہاں موجود ہیں لیکن ان کی اقامتی زندگی میں برادرانہ سلوک اور ہم وطنی کا جذبہ بڑی حد تک معنی خیز تعبیر کے مصداق ہے۔ ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کہ علی گڈھ کی اس چھوٹی موٹی دنیا میں جمہوریت

اور ربط باہمی کا غیر معمولی تجربہ ہو رہا ہے وہ ہندوستان کے دوسرے تعلیمی اور تہذیبی اداروں کے لئے مشعل راہ ہے۔ علی گڈھ اس معنی میں بذات خود امنگوں اور آرزوؤں کی ایک داستان ہے مفصل بھی اور مختصر بھی۔ ایک جمہوری نظام کی حقیقی تعبیر ہے اور محبت وخلوص کی جیتی جاگتی تصویر، جہاں ہر وقت انسانی زندگی کو نئی نئی قدریں اور جدید ترین قوتیں ملتی رہتی ہیں۔

یہ سال علی گڈھ کی اسّی سالہ زندگی میں تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ یوں تو شروع سال ہی سے دعیبز، جمال سلیم، حبشی، جواہر لعل، سمپورنانند، سید محمود، منشی، پانیکر، فضل علی، علی اصغر حکمت اور دوسرے اکابرین علم وسیاست کی آمد آمد کا سلسلہ جاری رہا ہے لیکن جلالۃ الملک شاہ ابن سعود اور شہنشاہ ایران اور ملکہ ثریا پہلوی کے ورود ہائے مسعود سے جامعہ کی زندگی میں نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ شاید آج سے پچاس پچپن سال ادھر کا واقعہ ہے جب پہلے غیر ملکی فرمانروا، ظل اللہ امیر حبیب اللہ خاں بالقابہ، والی افغانستان علی گڈھ آئے تھے۔ وہ علی گڈھ کا بچپن تھا۔ جوانی گذر گئی اب جب دوبارہ جوانی کے آثار نظر آئے تو ایک نہیں دو دو مطلق الحکم شاہنشاہوں نے علی گڈھ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ وہ یہاں اس طرح آئے گویا بچھڑے بھائیوں سے ملنے کے لئے بڑا بھائی کہیں آ جائے۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کی سالانہ نشست بھی اس دفعہ یہیں عمل میں آئی۔ عالمی یونیورسٹی سروس کا انڈین نیشنل سیمنار بھی اس سال علی گڈھ میں منعقد ہوا جس میں ہندوستان کی ۲۶ یونیورسٹیوں نے شرکت کی۔

بین الاقوامی جغرافیائی سیمنار کا انعقاد علی گڈھ کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور پھر چونکہ یہ دنیا بھر میں پہلا بین الاقوامی سیمنار تھا اس لئے اس کی اہمیت تاریخ عالم میں بھی بڑھ جاتی ہے۔ خصوصاً علوم جغرافیہ کے ماہرین اور شریک ہونے والے ملکوں کیلئے اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

یہ ۱۹ر اگست کی ایک سہانی شام تھی جب ہم طلبا یونین ہال میں شری یو این دھیبر کے

خیر مقدم کے لیے جمع ہوئے تھے۔ شری دھیبر کانگریس صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک جانے پہچانے سیاست داں، ایک آزمودہ اور تجربہ کار مدبر اور اعلیٰ صلاحیتوں والے قومی راہنما کی حیثیت سے بھی ہمارے درمیان اس طرح بیٹھے تھے گویا چھوٹے بھائیوں کی لمبی چوڑی برادری میں بڑا بھائی آگیا ہو اسی لئے شاید صدر عابد اللہ غازی نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا تھا " دھیبر بھائی! مجھے آپ کو دھیبر صاحب یا شری دھیبر کے بجائے دھیبر بھائی کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے اس لئے کہ واقعی آپ ہمارے بڑے بھائی ہیں" ہمارے درمیان موجود ہیں

سر پر کھدر کی گاندھی ٹوپی، کھدر کا کرتہ دھوتی اور ہلکے پھلکے چپل پہنے خالص کانگریسی اسٹائل میں دھیبر بھائی مغرب سے ذرا پہلے ہمارے پاس پہنچے۔ صدر نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی قومی، ملکی اور جماعتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خراج تحسین ادا کیا۔ علی گڈھ کی جمہوریت نوازی اور اتحاد آمیز زندگی سے متعلق غازی صاحب نے مفصل بحث کی۔ شری دھیبر نے خالص گنگا جمنی ہندوستانی میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا " علی گڈھ آنے سے پہلے مجھے یہاں کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں تھیں۔ یہاں آکر وہ سب ختم ہوگئیں مجھے بے حد خوشی ہے کہ میں علی گڈھ ایسے اونچے تعلیمی استھان میں آپ کے درمیان موجود ہوں۔ ہندو مسلم اتحاد یقیناً ہندوستان کی قومی ترقی کے لئے بہت بڑا ہتھیار ہے جس کو علی گڈھ بڑے حسن اور خوبصورتی سے نباہ رہا ہے اور مجھے امید ہے وہ اسی طرح نباہتا رہے گا۔ اس بڑے ادارے میں ہمیں جمہوریت کو طاقتور بنانے کے پورے موقع ملے ہیں۔ اس یونیورسٹی نے ہمیشہ غیر معمولی صلاحیتوں کے پیکر پیدا کرکے ہندوستان میں اپنا وقار اور بھرم قائم رکھا ہے۔ میں اس بات پر آپ سب کو بدھائی پیش کر رہا ہوں"

ہوسکتا ہے وہ کہانیاں علی گڈھ تاریخ کے اوراق کی زینت بن کر رہ گئی ہوں لیکن اس نے جو مجاہدین آزادی اور سر فروش کفن بردوش سپاہی پیدا کئے ہیں وہ آج بھی اسی طرح مستعد نظر آتے ہیں۔ گویا ابھی آزاد نہیں ہے۔ علی گڈھ کے لئے یہ حقیقت سوہان روح

بنی ہوئی تھی آج بھی علی گڈھ ملک کی کروٹ کے ساتھ انگڑائی لینا چاہتا ہے ۔ صدر یونین نے طلبہ کے عام مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا" آج شاید ہماری ماتر بھومی ہمارے خون کی قربانی چاہتی ہے ۔ علی گڈھ نے ایسے مبارک موقعوں پہ نہ صرف دامے، درمے اور سخنے ہی ملک اور قوم کی خدمت کی ہے بلکہ بے دریغ اپنا خون بلیدان کرکے ان کو کامیابی عطا فرمائی ہے ۔ ہم عہد رفتہ کی قسم کھا کر آج مصمم ارادہ کرتے ہیں کہ جب تک گوا کو مکمل طور پر آزاد نہیں کرالیں گے کبھی سکھ کی نیند نہیں سوئیں گے،، ان جملوں نے آگ پر تیل کا کام کیا اور متوالان آزادی نے اپنے خون سے دستخط پیش کرکے حب الوطنی کا وہ نادر نمونہ پیش کیا جسے علی گڈھ بقید حیات فراموش نہیں کرسکتا۔

مصر کے نائب وزیر اعظم ہز اکسی لینسی ونگ کمانڈر جمال سلیم بالقابہ پروگرام کے مطابق ۱۷ ستمبر کو علی گڈھ پہونچ گئے اس دن علی گڈھ میں نئی روح کارفرما تھی نئے ہندوستان میں نئے مصر کی نئی زندہ قوم کا عظیم عوامی راہنما علی گڈھ پہونچا تھا ۔ طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے محترم مہمان نے انھیں نصیحت کی کہ عملی سیاست سے وہ ہمیشہ کتراتے رہیں چونکہ ان کے لئے یہ بہت مضر ہوگا ۔ کچھ مصلحت پسند نوجوان ذہنوں کو اپنے مقصد کے لئے لوٹ لیتے ہیں ۔ اسلام کے اعلیٰ اصول امن کا پرچار کرتے ہیں طلبہ کو ان پر کاربند ہونا چاہئے ۔ نہ کہ نام نہاد اسلامی تنظیموں سے ملحق ہوجائیں جو مطلب نکالنے کے لئے انھیں آڑ بنالیتی ہیں ۔ اسلامی اصولوں کے پرچار اور ضبط و نظم کے سلسلے میں علی گڈھ بہت کچھ کرسکتا ہے ۔ وہ بین الاقوامی شہرت کی عظیم درس گاہ ہے جہاں مجھے آنے کا بے انتہا شوق تھا اور خدا کا شکر ہے میں جلد ہی وہاں پہنچ گیا۔"

۲۹ راکتوبر کو حالانکہ گرمی کم تھی، چھٹی بھی تھی لیکن ایک غیر معمولی مہمان کی آمد کی خبر سن کر زندگی میں حرارت آگئی تھی ۔ چاروں طرف سوٹ میں ملبوس اونچی رام پوری ٹوپیاں لگائے انڈونیشائی طلبہ تگ و دو میں مصروف تھے ۔ ساڑھے دس بجے اسپیشل ٹرین ڈاکٹر محمد حتی، جمہور انڈونیشا کے نائب صدر اور ان کے وزیر وزرا کو لے کر علی گڈھ پہنچ گئی ۔ تمام دن مختلف

مشاغل میں مصروف رہنے کے بعد چار بجے شام کو مہمان موصوف نے طلباء کو خطاب فرمایا۔ جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ منظور احسن برنی نے آیت مقدسہ کا ترجمہ پہلے انڈونیشائی بھاشا میں پھر انگریزی اور اردو میں کیا، "سے سنگھ یاں اور نگ اور نگ مسلم، اڈالہ برسوڈارا۔ سپایا میرے کا میم کوت پر ڈار مین ڈینگن سوطوا۔ سوڈ لائمر۔ ڈان تاکو تالاللہ موڈا سوڈاہن کامو میم پراول رحمت یعنی یقیناً تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ پس ملا دو اپنے بھائیوں کو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

ڈاکٹر صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس یونیورسٹی کے متعلق بہت عرصے سے سنتا چلا آیا تھا پہلی بار جب میں فرانس میں تھا اس وقت اس کے متعلق سنا تھا۔ اس عظیم تاریخی ادارے نے ملکی آزادی قومی ترقی اور اسلامی ہند کی تعلیمی، تہذیبی، اور ثقافتی زندگی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کی اہمیت سے ہندوستان کی تاریخ میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ مجھے علی گڈھ ایسے مرکز علم وفضل میں آتے ہوئے کئی مسرتوں کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں سے قوم کے معماروں کا جو جتھا بھی نکلا ہے اس نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی قومی زندگی میں نام ہی پیدا کیا ہے بلکہ ایک خاموش انقلاب کی دعوت بھی دی ہے۔

امن عالم پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ "امن کا باہمی ربط انسانی روح سے ہے جو بیرونی خطرات اور شبہات سے پاک ہو۔ اسلام عالمی امن کا حل اس طرح پیش کرتا ہے کہ دنیا کو ایک رشتہ ملت میں منسلک ہو جانا چاہیئے۔ جب تک دنیا ان اصولوں پر عمل نہیں کرے گی امن ناممکن اور بالکل ناممکن ہے۔ ایثار، رواداری، محبت اور اخوت۔ امن عالم کے وہ ستون ہیں جو اسلام قانونی طور پر اسلامی معاشرت میں پیدا کرتا ہے۔ اسلامی اسپرٹ کا انحصار صداقت، مساوات اور اتحاد پر ہے۔ یہی وہ اصول ہیں جن کو اپنا کر ہم دنیا میں قومی سیاسی اور معاشرتی زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا آج مسلمان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ بجائے طاقتور ملکوں سے بھیک مانگنے کے قانونی اور جائز طور پر اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے

عالمگیر جہاں کی داغ بیل ڈال دے"۔

ابھی نومبر کے گلابی جاڑوں نے قدم ہی جمائے تھے کہ طلبہ کی بوڑھی پری انجمن میں کلالی سرگرمیاں پھر جاری ہوگئیں ۸ ر نومبر کو لنکا کے سفیر سر تستا ایڈون علی گڈھ سے عقیدت کا خزانہ لے گئے۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ مبارک ساعت بھی آپہنچی جب ہمارے محبوب وزیر اعظم جواہر لعل نہرو یونیورسٹی لائبریری اور سیفی ہوسٹل کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے علی گڈھ آپہنچے۔ حالانکہ سردیوں نے پوری فضا میں گلاب سا چھڑک دیا تھا لیکن طلبہ کے چہرے فرط مسرت اور جوش محبت سے اس طرح تمتا رہے تھے گویا چڑھتے سورج سے سبزہ زار میں زندگی دوڑ گئی ہو۔ ذاکر صاحب نے کہا۔

"جب گرمی تپتی ہوئی پیاسی زمین پر برسات کی گھنگھور گھٹا منڈلاتی ہے تو اس کا ذرہ ذرہ زندگی کی ایک چھپی لہر سے کانپنے لگتا ہے پر اس گھٹا کے خیر مقدم کے لئے وہ لفظوں سے کام نہیں لیتی۔ جب خزاں کی مردنی کے بعد پودوں کی رگوں میں دوڑنے والا رس اور ٹہنیوں میں جھجک جھجک کر ٹھٹک ٹھٹک کر جھانکنے والی کلیاں باد بہاری کا خیر مقدم کرتی ہیں تو مارے خوشی کے کھل پڑتی ہیں مگر ان کا جوش نو خیر مقدم کے لئے لفظ نہیں ڈھونڈ پاتا۔ جب بہار کے قافلے کی پہلی چڑیا چمن میں پہنچتی ہے تو سارا چمن فرط خوشی سے لہلہاتا ہے مسکراتا ہے پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں اپنی سادگی اور نادانی میں اس رنگین مطلب کو لفظوں میں ادا کرنے کھڑا ہو گیا ہوں پر جانتا ہوں یہ کہتے نہیں بنے گا پھر بھی مجھے یقین ہے پنڈت جی اسے سمجھ لیں گے۔

پنڈت جی میں سب سے زیادہ آپ کا خیر مقدم، آپ کی قوم کے ان ہونہاروں کی طرف سے کروں گا جن پر اس یونیورسٹی کا سارا کاروبار چل رہا ہے۔ آج ان کی روشن آنکھیں اور دنوں سے زیادہ روشن دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے کہ آپ کو سامنے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن جب آپ سامنے نہیں ہوتے تو یہ اپنے دلوں میں آپ کی محبت اور عقیدت کا خزانہ چھپائے رہتے ہیں۔ آزادی کی راہ میں آپ کی قربانیاں غلامی کی زنجیریں کاٹنے میں آپ کی جاں بازیاں

ان کے دلوں کو گرماتی رہی ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ انھیں آپ سے کچھ ایسا لگاؤ ہے ایسی محبت اور ایسی عقیدت ہے کہ جب یہ اپنی جوانی کے جوش میں یا اپنی جلد بازی میں حالات سے گھبرا جاتے ہیں یا اپنے بڑوں سے مایوس ہونے لگتے ہیں تو آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ یہ گھبرا بھی جاتے ہیں اور مایوس بھی ہو جاتے ہیں ۔ تب بھی آپ کی ذات کے ساتھ انھیں اپنی آرزوؤں، اپنے دلولوں اور اپنے ارادوں کی تصویر نظر آتی ہے ۔ اس لئے جب آپ ان سے مایوس ہونے لگتے ہیں تو ان کا دل ٹوٹ سا جاتا ہے ۔ یہ ہم سے جاتے ہیں پنڈت جی! ان سے غلطیاں ضرور سرزد ہوتی ہیں لیکن کیا ہم بڑوں سے کچھ کم غلطیاں ہوتی ہیں ۔ اپنے ملک کی محبت اپنی قوم کی سرفرازی کی آرزو اور اس کے مستقبل پر یقین اور نیکی خوبی اور انصاف کی لگن ان کے ریشے ریشے میں بھری ہوئی ہے ۔ ان کی طرف سے میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں اگرچہ ان کی آنکھوں کی گرم گرم چمک، ان کے نورانی چہروں کی دمک اور ان کے پر ارمان دلوں کی دھڑکن اسی تاثیر کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کرتی ہے کہ میرے لفظ ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے ۔ ان کا دل سونے کا دل ہے "

ذاکر صاحب کے درد بھرے جملوں سے پنڈت جی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ نوجوان ہونہاروں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا " میں علی گڑھ آنے کے متعلق کئی بار سوچ چکا ہوں لیکن چونکہ قریب تھا اس لئے نہ آسکا ۔ حالانکہ دور دراز ملکوں اور شہروں میں جاتا رہا ہوں ۔ اس بار میں کئی سال بعد علی گڑھ آیا ہوں لیکن یہاں آکر آپ صاحبان کے درمیان خود کو پاکر مجھے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے ۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر کے طلبہ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ان کا کام ختم ہو گیا ۔ انھیں یقین کرنا چاہئے کہ انھوں نے امتحان پاس کر کے علم حاصل کرنے کا محض طریقہ سیکھا ہے ۔ میں نے خود دس فی صدی یونیورسٹی میں اور نوئے فی صدی اس کے باہر سیکھا ہے ۔ آپ کو اپنے مستقبل کے بارے میں ابھی سے سوچنا ہے اور طے کرنا ہے کہ آپ ملک کی خدمت کس طریقے سے کرسکیں گے "

یوں تو شروع سال ہی سے جلالۃ الملک شاہ ابن سعود کے دورۂ ہند سے متعلق خبریں گرم تھیں لیکن نومبر کے شروع ہی سے ان کے شایانِ شان استقبال کی تیاریوں نے خبروں کو یقین میں بدل دیا۔ ساری یونیورسٹی میں تازگی اور شگفتگی کی لہر دوڑ دوڑ گئی۔ امیر حبیب اللہ خاں والیٔ افغانستان کے بعد یہ دوسرا مسلمان بادشاہ تھا جو ہمارے یہاں آ رہا تھا۔ شاہ کے دورہ ہند میں علی گڑھ چونکہ خاص طور پر شامل تھا اس لئے تیاریوں میں مخصوص توجہ سے کام لیا جا رہا تھا۔ اسٹریچی ہال کو روغنی پینٹ سے نیا کر دیا گیا۔ مسجد کو دلہن بنایا گیا۔ صفائی ستھرائی، جھاڑ پونچھ، بنانا سنوارنا ہفتوں جاری رہا۔ جوبلی میدان میں چھ ہزار نشستوں کے لئے خوبصورت پنڈال تیار کیا گیا اسٹیشن کے بھی دن پھر گئے۔ شاہ کے شایانِ شان نہ سہی اپنی بساط اور بجٹ کے مطابق علی گڑھ والوں نے علی گڑھ کو خوب آراستہ کیا۔ رنگ برنگی روشنیوں سے اسٹیشن جگمگا رہا تھا۔ دیواروں میں لٹکتے ہوئے زرد بفتی اور اطلسی پردوں نے شاہی محل کی روایات کو علی گڑھ میں زندہ کر دیا تھا۔ وہاں سے یونیورسٹی تک بہت سے دروازے نصب کئے گئے جن پر عربی اور ہندی میں "شاہ سعود زندہ باد" "عرب ہند دوستی زندہ باد" وغیرہ جملے آویزاں تھے۔ سڑک کے دونوں طرف ہندوستانی عربی اور یونیورسٹی کی جھنڈیاں لہرا رہی تھی۔ عجیب چہل پہل اور بھاگ دوڑ تھی۔ علی گڑھ مجلۂ عروسی بنا دلہن کا منتظر تھا۔ یہ غالباً علی گڑھ کی زندگی میں بالکل پہلا موقع تھا۔

۳ دسمبر کے تازہ آفتاب نے شاہ کی آمد آمد کا پیغام سنایا۔ مسرت اور شادمانی سے بجتے ہوئے شادیانے اس حقیقت کی غمازی کر رہے تھے کہ یقیناً آج علی گڑھ میں علم و حکمت کا چراغ، اخلاق حسنہ کا پیکر اور حیات صالحہ کی تصویر ورود کر رہی ہے۔ شاہ معہ شاہی مہمانوں کے ۱۱ بجے پھولوں سے لدی مخصوص گاڑی میں علی گڑھ پہنچ گئے۔ سارا شہر نعرہ تکبیر سے گونج اٹھا۔ اللہ اکبر کی فلک شگاف صداؤں نے ایک سماں باندھ دیا۔ اسٹیشن سے باہر عوام جوق در جوق شاہ کے دیدار کے لئے آئے بیتاب کھڑے تھے ہزاروں ہندو مسلمان اک نظر شاہ کو دیکھنا چاہتے تھے

جیسے ہی شاہ باہر تشریف لائے۔ بے قابو عوام نے نعرے لگا لگا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ شاہ نے مسکراتے ہونٹوں سے داہنے ہاتھ کو اٹھا اٹھا کر خیر مقدم کا جواب دیا۔

سر پر عربی عمامہ، بدن پر شفاف لبادہ۔ اس پر کرم عبا اور ڈربی کے براؤن جوتے پہنے شاہ پنڈال آشریف لائے جہاں انھیں ڈاکٹر فی الحقوق، کی اعزازی سند پیش کی گئی۔

سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے فرمایا دنیا حضرت جلالتہ الملک سعود الاول المعظم کی ولادت سے ۱۵ جنوری ۱۹۰۲ء کو مشرف ہوئی۔ مجھے بڑا فخر ہے کہ حضرت صاحب الجلالہ کو ڈکٹور فی الحقوق کی اعزازی سند لینے کیلئے خدمت عالی میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ اس جامعہ کیلئے بھی بہت بڑا اشرف ہے کہ وہ دیندار، روشن خیال عادل رعایا پرور اور علم دوست بادشاہ کو اپنی اعزازی سند دے رہی ہے۔ جلالتہ الملک کی تشریف آوری کا حال یونیورسٹی میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

"ہم مجبور ہیں کہ جلالتہ الملک کے شایان شان استقبال کا انتظام نہ کر سکے"

سیدنا طاہر سیف الدین مدظلہ نے شاہ کو سند پیش کی جس کو شاہ نے نہایت احترام سے کھڑے ہو کر لیا۔ تمام پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وائس چانسلر نے شاہ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے علی گڈھ کی مختصر تاریخ اور اس کی ۸۰ سالہ زندگی پر بڑے دل کش انداز میں روشنی ڈالی پہلے عرب اور ہندوستان کے پرانے تعلقات کا ذکر کیا اور پھر فرمایا۔

یا صاحب الجلالہ۔ یہ دارالعلوم جس کو آپ نے آج اپنی تشریف آوری سے عزت بخشی ہے ہماری قومی زندگی میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ ایک بڑی ذہنی تحریک کی تاریخ ہے۔ جمود و تعطل ذہنی میں بیداری فکر کے ایک نئے دور کی داستان ہے جہل کی تاریکی میں علم کی تنویری طاقت پر اعتماد کی کہانی ہے۔ غلامی میں آزادی کی تیاری اور آزادی میں آزادی کو صالح زندگی کی تعمیر کا وسیلہ بنانے کی داستان ہے۔ انیسویں صدی عیسوی ہمارے وطن کے لئے بڑے ابتلا کا زمانہ تھا۔ برطانی استعمار کی زنجیریں زندگی کے ہر شعبے کو جکڑتی جاتی تھیں۔ خود ہماری

قومی زندگی کی اخلاقی توانائیاں مضمحل ہوگئی تھیں ۔ انفرادی نفسی نفسی نے جماعتی مقاصد کو پس پشت ڈال دیا تھا ۔ مغربی استعمار سے سیاسی نفرت و بیزاری نے مغربی علوم جدیدہ سے نفرت کا جذبہ پیدا کر رکھا تھا ۔ حوصلے پست تھے ہمتیں شکستہ تھیں ۔ اس عالم یاس میں اک پیر جواں ہمت سید احمد خاں نے تعلیم کے ذریعے احیاء ملی کا تہیہ کیا ۔ ایک چھوٹے سے مدرسے کی بنا آج سے ۱۰۰ سال پہلے ۱۸۷۵ء میں ڈالی جو پورا ثانوی مدرسہ بھی نہ تھا ۔ اس میں کل ۶۰ طلبہ تھے اس کا مجموعی خرچ ۵ ہزار روپے سالانہ تھا ۔ دو سال بعد ہی یہ مدرسہ کالج ہوگیا ۔ اور اس کے طلبہ نے ملک میں بڑا نام پیدا کیا ۱۹۲۰ء میں یہ یونیورسٹی ہوگیا آج اس کے مختلف اداروں میں ۵ ہزار سے اوپر طلبہ ہیں اور تقریباً تین سو پچاس اساتذہ ہیں اس کا سالانہ خرچ اس سال تخمیناً ۱۴۶ لاکھ روپے سے اوپر ہے ۔ اس کا کام پانچ فیکلٹیوں پر منقسم ہے ۔ علوم دین کی فیکلٹی ، آرٹس کی فیکلٹی ۱۲ مختلف شعبوں کے ساتھ ، سائنس کی فیکلٹی ۸ شعبوں کے ساتھ ۔ انجینرنگ کی فیکلٹی جس میں ۳ شعبے ہیں اور طب کی فیکلٹی جو یونانی اسلامی طب کے ایک کالج اور علاج العین کے ایک ادارے پر مشتمل ہے ۔ عورتوں کا کالج اور ان کے رہنے کے لئے اقامت گاہیں علیحدہ ہیں اس کے علاوہ تین ثانوی مدارس ہیں دو لڑکوں کے لئے ایک لڑکیوں کے لئے ۔ جس میں تقریباً ۱۵۰۰ لڑکے لڑکیاں تعلیم پاتے ہیں ۔ حال میں ایک ادارہ علوم اسلامی کا قائم کیا گیا ہے جس کے لئے ممالک عربیہ ، ایران اور ترکی سے تین پروفیسر بلائے جا رہے ہیں ۔ دارالعلوم کے پاس ایک اچھا کتب خانہ ہے جس میں ایک لاکھ کے قریب کتابیں ہیں ۔ کتب خطی کا ایک اچھا ذخیرہ ہے جس میں ۶ ہزار سے اوپر مخطوطات ہیں ۔ اس کے لئے ایک جدید طرز کی عمارت کا سنگ بنیاد ابھی ایک مہینہ ہوا پنڈت جواہر لعل نہرو نے رکھا ہے ۔ طلبہ کی اکثریت دارالعلوم کی اقامت گاہوں میں رہتی ہے اور ہم اس مل جل کر رہنے کو اپنی تعلیم کا بڑا حصہ سمجھتے ہیں ۔ طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے نئی اقامت گاہیں بنانا ہیں اور حال میں ہمارے چانسلر سیدنا طاہر سیف الدین کی توجہ اور کرم سے ایک نئی اقامت گاہ سیفی منزل کا سنگ بنیاد ہمارے محبوب وزیر اعظم نے رکھا ہے ۔ طلبہ کی ذہنی

زندگی کا مرکز ان کی یونین ہے جس کے صدر اور کابینہ کا انتخاب جمہور طلبہ کرتے ہیں اس کا انتظام تمام و کمال طلبہ کے ہاتھ میں ہے۔ کھیل اور ورزش کا خاص اہتمام ہے عام معروف کھیلوں کے علاوہ تیراکی اور شہسواری کے لئے انتظام ہے۔ ورزش کا ایک جمنازیم ہے تیراکی کے لئے ایک مسقف حوض ہے۔ صحت جسمانی کے لئے ایک اسپتال ہے اور متمول طلبی اشاف طلبہ کی فیس، دارالعلوم کی جائداد، اپنے محفوظ راس المال سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کے علاوہ مصارف کا بہت بڑا حصہ حکومت فراہم کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے توسیعی کام میں دو اہم منصوبے ہیں ایک میڈیکل کالج اور ایک زراعتی کالج کا قیام۔ میڈیکل کالج کے لئے ہمدردوں نے ۵۰ لاکھ روپیہ جمع کر کے دیا ہے۔ لیکن یہ منصوبہ زیادہ روپے کا طالب ہے۔ اندازہ ہے کل خرچ کوئی دو کروڑ روپیہ کا ہوگا۔ حکومت ہند اور صوبائی حکومت اس کے قیام کے مسئلے پر ہمدردانہ غور کر رہی ہیں۔"

سپاس نامے کے بعد شاہ نے چانسلر کی درخواست پر جو کچھ فرمایا وہ ان کے خلوص اور محبت کا مظہر ہے۔ "مجھے عرصے سے اس دارالعلوم میں آنے کی خواہش تھی جس نے آزادی کے متعدد راہنما اور سائنس کے عمدہ ماہرین پیدا کئے جن میں سے بعض سے میں مل چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آج میں یہاں ہوں اور یہ خوشی اس لئے دوگنی ہوگئی ہے کہ یونیورسٹی کی طرف سے مجھے ڈکتور فی الحقوق کی اعزازی سند دی گئی ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ اس طرح یونیورسٹی سے میرا ابدی رشتہ قائم ہوگیا ہے۔

طلبہ کو اخوت اور مساوات کے راستوں پر چلنا چاہیئے انھیں اصولوں سے اسلام دور سعود تک پہنچا تھا۔ طلبہ ان اصولوں سے اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ حاضرین زندگی کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ ور ہوں، ان کی خوش حالی بڑھے اور ان پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں۔"

سیدنا کے شکریے کے ساتھ کنووکیشن تمام ہوا۔ شام کو کرکٹ کے میدان میں شاہ کے اعزاز میں

سید نا نے عصرانہ دیا۔ جس میں چھ ہزار سے اوپر اساتذہ، طلبہ اور اراکین جامعہ شریک ہوئے۔ عصر کے بعد مسجد جامعہ میں شاہ نے نماز مغرب کی امامت فرمائی اور پھر یونین ہال میں طلبہ کو شرف نیاز بخشا۔ یہ آخری تقریب تھی شاہ کے اعزاز میں جس کے بعد پروگرام کے مطابق شاہ بنارس کے لئے روانہ ہوگئے۔

۳۱ر دسمبر کو سالانہ کنووکیشن ہو رہا تھا۔ شری سمپورنانند جو خطبہ جلسہ بھی پڑھنے کے لئے بلائے گئے تھے، سید فضل علی، سردار پانیکر، پنڈت کنزرو، علی اصغر حکمت اور غلام یزدانی صاحب کو اعزازی سندیں پیش کی گئیں۔ ڈاکٹر سمپورنانند نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ ہندوستانی کلچر جو ہندو مسلم تہذیب کے امتزاج سے ظہور میں آیا ہے۔ انسانیت کی عظیم خدمت کر سکتا ہے یہ پیام انسانیت آج دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانا ہے جسے ہماری یونیورسٹیاں اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں۔ اور یہ ذمہ داری علی گڈھ یونیورسٹی خاص طور سے پورا کر سکتی ہے۔ لیکن ایک مخصوص فرض جسے صرف علی گڈھ ہی انجام دے سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی آزادی اور کلچر کے تحفظ کے لئے، علی گڈھ کو ہندوستان کی تمام ذاتوں جماعتوں اور مذہبوں کو یکجا کرنا ہے متحد کرنا ہے اور ان میں رشتہ بھائی چارگی پیدا کرنا ہے۔ چونکہ علی گڈھ جمہوری قدروں پر اپنا تمام ڈھانچہ تیار کر چکا ہے۔

۲۵ر دسمبر سے ورلڈ یونیورسٹی سروس کا انڈین نیشنل سیمنار شروع ہوا جس میں ۲۶ یونیورسٹیوں نے حصہ لیا۔ یونین ہال میں روزانہ مقالے پڑھے جاتے تھے اور بحثیں گرم ہوتی تھیں۔ اس دوران میں بھی طلبہ میں خصوصاً کافی حرارت پائی جارہی تھی۔ اس کے فوراً بعد ۷ر جنوری ۱۹۵۶ء کو سید محمود، وزارت خارجہ کے وزیر، نے یونین ہال میں رفیع احمد قدوائی مرحوم کی تصویر کی نقاب کشائی کرتے ہوئے فرمایا کہ "ملک کی آزادی کی جد و جہد میں علی گڈھ نے جو حصہ لیا ہے وہ دوسرے اداروں اور درسگاہوں کے نصیب میں کم ہی آیا ہے لیکن لوگوں کو اس کے متعلق بے شمار غلط فہمیاں تھیں جو آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اور جب نئے ہندوستان کی نئی تاریخ مرتب کی جائے گی اس وقت علی گڈھ کو اس کا

مقام دیا جائے گا اور اسی وقت لوگ اسے آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ اس دانش گاہ میں
...ع ہی سے ایسی ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین خدمت
...ن قرار دیا تھا اور ملک و قوم کی خدمت کرتے کرتے عمریں گزار دیں۔ ان کی خدمات پر ملک
...رتا ہے۔ ان میں علی برادران، رفیع احمد قدوائی، ذاکر حسین اور دوسرے لوگ شامل ہیں۔
...دفعہ میں اور میرے دوستوں نے سر سید مرحوم کی قبر پر جا کر عہد کیا تھا کہ ہم اپنی پوری زندگی کو
...اور قوم کی خدمت کے لئے وقف کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ جب تک ملک کو غیر ملکی
سے نجات نہ دلا دیں گے آرام سے نہ بیٹھیں گے اور ہم نے ایسا کیا۔ ہمیں احساس مسرت
ہے اور فخر سے سر اونچا بھی۔"

۹ر جنوری سے ۱۶ر جنوری تک علی گڑھ میں ایک اچھوتا اور بالکل نئے قسم کا بین الاقوامی
...ع ہوتا ہے۔ افغانستان، آسٹریلیا، بلغاریہ، برما، سیلون، چین، چیکوسلاواکیہ،
...ر، فرانس، مشرقی جرمنی، مغربی جرمنی، انڈونیشیا، جاپان، پاکستان، پولینڈ، رومانیہ،
...بی افریقہ، برطانیہ، امریکہ، روس اور یونسکو کے علاوہ ہندوستان کی کم و بیش اہم یونیورسٹیوں
...جغرافیائی اداروں کے نمائندے بین الاقوامی جغرافیائی سیمینار میں شرکت کے لئے علی گڑھ
گئے تھے۔ بھانت بھانت کے رنگ کالے گورے، سرخ سپید، قسم قسم کی بولیاں روسی چینی
...یزی، فرانسیسی، عربی فارسی، اردو ہندی، بلغاری جاپانی غرض ایک رنگ بہاراں تھا
...ن زمانے میں یونیورسٹی پر چھایا تھا۔ اس سیمینار کی اہمیت یونیورسٹی کے لئے اس لئے ہی نہیں
...نہ یہ یہاں جغرافیے کے ماہرین کا پہلا اجتماع تھا بلکہ اس لئے بھی کہ یہ دنیا میں بین الاقوامی بنیادوں
...نہ اور بالکل پہلا جغرافیائی اجتماع تھا۔

اسٹریچی ہال کے سامنے دونوں طرف تمام مدعو ملکوں کے پرچم لہرا رہے تھے اور سامنے
سڑک پر دو رویہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے جھنڈے اڑ رہے تھے اندر ایک عجیب سماں
...سامنے اسٹیج تھا جس پر کیشو دیومالوی، ذاکر صاحب اور نور الدین صاحب براجمان تھے۔

سیدھی طرف ڈیلیگیٹوں کا انتظام تھا اور باقی تمام ہال میں طلبہ نہایت سکون سے افتتاحی منظر دیکھنے بیٹھے تھے ۔ وائس چانسلر نے دنیا کے آئے ہوئے جغرافیہ دانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے علی گڑھ کا ایک نیا رخ پیش کیا جو عموماً لوگوں کی نگاہوں میں نہیں ہوتا ۔ انھوں نے کہا۔

"میں آپ کا خیر مقدم اس جگہ کر رہا ہوں جو علی گڑھ کہلاتا ہے، جو ایک ضلع کا صدر مقام ہے اور گنگا جمنا دوآبے میں واقع ہے جس کا عرض البلد ۲۷° ۲۹ اور ۲۸° ۱۱ شمالی ہے جس کا طول البلد ۷۷° ۲۹ اور ۷۸° ۳۸ مشرقی ہے ۔ ضلع کے صدر مقام کا عرض البلد ۲۷° ۵۳ شمالی اور طول البلد ۷۸° ۴ مشرقی ہے ۔ جو کلکتہ سے بذریعہ ریل ۷۸۵ میل، الٰہ آباد سے بذریعہ سڑک ۳۰۸ میل آگرہ سے ۴۹ میل شمال میں اور دہلی سے ۸۰ میل دور ہے ۔ سال تین موسموں میں تقسیم ہے برسات جولائی سے ستمبر تک، سردی اکتوبر سے مارچ تک اور گرمی اپریل سے جولائی تک ۔ مئی اور جون کی بلاخیز گرمی کے لئے میں اپنے دور دراز کے مہمانوں کو متفکر نہیں کروں گا لیکن یہ ضرور بتاؤں گا کہ ان دنوں میں دور دراز کے ریگستانوں سے باد وریت کے طوفان یہاں آتے ہیں ۔ عام طور سے دو موسموں کا درجۂ حرارت زیادہ سے زیادہ ۱۱۶° اور کم سے کم ۳۷ رہتا ہے ۔ انسانی درجۂ حرارت ۹۱° اور ۹۵° بالترتیب بارش کا اندازہ "۲۶ ہے، "۵۳ سے ۹ انچ تک بارش ہوتے دیکھی گئی ہے ۔ ان گوناگوں حالات میں بھی علی گڑھ میں مکانات ہیں، دکانات ہیں ۔ دیہات ہیں قصبے ہیں ۔ کھیت ہیں اور فارم ہیں ۔ سڑکیں اور ریلیں ہیں ۔ تار اور ٹیلیفون ہیں کارخانے اور فیکٹریاں ہیں ۔ چرچ مساجد اور مندر ہیں اسکول کالج اور یونیورسٹی ہیں اور یہ سب مل کر خالص ہندوستانی کلچر کی آئینہ دار ہیں "

۱۶ رجنوری کو اس تاریخی جغرافیائی اجتماع کا آخری دن تھا ۱۸ رجنوری اترپردیش کے گورنر شری کے ایم منشی کے آنے کا دن تھا وہ معہ اپنی دھرم پتنی کے پہنچ بھی گئے اور طلبہ کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ نوجوان طلباء کو قومی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ ہندوستان

ایک خدائے واحد پر یقین رکھتا ہے اس سلسلے میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کو علی گڑھ کی عظیم تاریخی یونیورسٹی سے سبق لینا چاہئے کہ وہ اپنے جلسوں کا آغاز قرآن شریف کی تلاوت سے کرتی ہے"

چونکہ کل ہند وائس چانسلرس کانفرنس طلبا سے متعلق نہیں تھی اس لئے اس کے متعلق نہ ہم معلومات بہم پہنچا سکے اور نہ ہم اس میں دلچسپی لے سکے۔ ۱۹ر جنوری کو یہ ذاکر صاحب کی صدارت میں اسٹریچی ہال میں منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے تمام وائس چانسلر موجود تھے۔ طلبہ میں ڈسپلن اور علمی مزاج پیدا کرنے کے سلسلے میں بحثیں گرم رہیں۔

شاہنشاہِ معظم، اعلیٰ حضرت شاہ محمد رضا شاہ پہلوی۔ شاہنشاہ ایران ۲۵ر فروری کو دن کے دس بجے معہ علیا حضرت ملکۂ ایران ثریا پہلوی کے، مخصوص ٹرین میں علی گڑھ پہنچے۔ شاہ کے استقبال کے لئے پچھلے کئی دن سے بے تحاشہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پنڈال کھڑا کیا جا رہا تھا۔ جھنڈے لگائے جا رہے تھے۔ اسٹیشن کو آراستہ کیا جا رہا تھا۔ راستوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رنگین دروازے نصب کئے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر دو رویہ خوبصورت جھنڈیوں کی قطاریں باندھی جا رہی تھیں۔ ساری یونیورسٹی میں ایک بھاگ دوڑ اور تگ و دو تھی۔ دروازوں پر اردو میں "شاہ جاوید" "علیا حضرت ملکہ ایران زندہ باد" اور "خوش آمدید" کے اور ہندی میں "جگ جگ جیویں شہنشاہ" "بھارت ایران ایکتا کی جے" کے دیدہ زیب کتبے لگائے جا رہے تھے۔ اسٹریچی ہال کے عقب میں کھانے تیار کرنے والے ڈیرے ڈال چکے تھے۔ آسمان منزل میں مہمانوں کو لے جانے کے انتظامات مکمل ہو رہے تھے۔ اولڈ بوائز لاج میں شاہنشاہ اور شاہی مہمانوں کے قیام کے لئے انتظامات آخری مراحل پر تھے فلیش بنائے جا رہے تھے۔ ٹینس کے میدان میں سیدنا کی طرف سے دیئے جانے والے عصرانہ کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ یونین کی عمارت پر چراغاں ہو رہا تھا۔ حالانکہ امتحان کا بھوت سر پر سوار تھا لیکن جامعہ کے طلبا اور اساتذہ دونوں کے چہروں پر شادابی چھلک آئی تھی۔

شاہ گہرے نیلے سوٹ میں ملبوس کچھ سفید کچھ کالے بالوں کو قرینے سے بنائے، گاؤن پہنے پنڈال میں جلوس کے ساتھ داخل ہوئے۔ یہاں آنے سے قبل ہی شاہ نے بانی درس گاہ کی قبر پر عقیدت کا نذرانہ بھی پیش کر دیا تھا شاہنشاہ کے ہمراہ ملکۂ ثریا پہلوی ہلکے نیلے رنگ کے اسکرٹ (سایہ) میں سر پر مخصوص لیڈیز کیپ لگائے، ہاتھوں میں سفید دستانے پہنے اور اونچی ایڑی کا سفید جوتا پہنے پرو چانسلر نواب چھتاری کے داہنے ہاتھ پر، جلوس کے ہمراہ داخل ہوئیں۔ پنڈال شاہ ایران زندہ باد، ملکۂ ایران زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ڈائس پر بیچ میں سفید دھوپ ایسے کپڑوں میں ملبوس سیدنا تشریف فرما تھے۔ ان کے داہنی طرف شہنشاہ اور بائیں طرف ملکہ سنہری کرسیوں پر جلوہ افروز ہوئے۔ ملکہ کے بائیں طرف وائس چانسلر اور شاہ کے داہنی طرف پرو چانسلر کی کرسیاں تھیں۔ کنووکیشن شروع ہوا۔ ذاکر صاحب نے شاہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا "۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۹ء کو شاہ نے اس دنیا کو منور فرمایا۔ پہلے طہران میں، پھر سوئٹزرلینڈ میں اور پھر طہران میں فوجی اور غیر فوجی تعلیم حاصل کی اور اب ایک پاکباز، بیدار مغز مصلح اور بالغ النظر رعایا پرور بادشاہ کی حیثیت سے قوم کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔

چانسلر سیدنا نے وائس چانسلر کی درخواست پر شاہ کو ڈکٹور فی الحقوق کی اعزازی سند پیش کی شاہ نے کھڑے ہو کر سند دونوں ہاتھوں سے بڑے احترام سے لی اور سیدنا سے مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔ وائس چانسلر نے شاہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے سپاس نامہ پڑھنا شروع کیا" ایران ہمارے لئے حسن خیال، حسن آرزو اور حسن عمل کی وہ جنت ہے جس کی خوشبو سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایرانیوں کے تخیل نے مصوری موسیقی، تعمیر اور شاعری میں فن کے وہ اعجاز دکھائے ہیں جو آج بھی مسرت اور بصیرت کے خزانے ہیں۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ آج بھی روشن ہے، نوشیرواں کے عدل کی داستان آج بھی زندہ ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ عمر خیام کی رباعیات، مولانا روم کی مثنوی، سعدی کی گلستاں بوستاں، دیوان حافظ، اور لوائح جامی، البیرونی کا بے لاگ علم اور بوعلی سینا کی تیز حکیمانہ نظر، بہزاد کا موقلم، نستعلیق خط

کے دل آویز دائرے اور ایرانی قالینوں کے دلکش نقش و نگار عجم کے حسن طبیعت کے وہ لازوال کارنامے ہیں جن پر ساری دنیا فخر کرتی ہے۔ ایرانی شاعری نے ہمیں کیا کچھ نہ دیا۔ قدسی، آتشی، ہلالی، دولت شاہ سمرقندی، فراغی، صائب، ظہوری، نظیری، عرفی، ملک قمی، طالب آملی، کلیم، علی حزیں ہند کے چمن ادب میں نسیم سحری کی طرح آئے خود ہندوستان کی سرزمین سے ایسے شاعر اٹھے جن کی شہرت ایران تک پہنچی۔ مسعود سعد سلمان، شہاب الدین، امیر خسرو، فیضی، غنیمت غنی کاشمیری، نعمت خان عالی، عبدالقادر بےدل، مظہر جان جاناں، غالب شبلی اقبال اور ادیب پیشاوری کے ساغروں میں صہبائے پارس کا کیف ہے۔ فارسی کے اثر سے دہلی کے قرب و جوار کی کھڑی بولی نے وہ بال و پر نکالے کہ آج وہ "اردو" کے نام سے ہندوستان کی جدید زبانوں میں اک امتیازی شان رکھتی ہے۔

ہمارے ملک کے تعلیمی اداروں کے سامنے سچے ہندوستانی اور اچھے انسان پیدا کرنے کا عظیم الشان کام ہے اور ہمارا یقین ہے کہ ہندوستانیت انسانیت میں معاون ہوتی ہے۔ مخل نہیں ہوتی۔ اس دانش گاہ علی گڑھ کا اہم مشن یہ ہے کہ ہندوستانیت اور انسانیت کے امتزاج میں ہماری مشترکہ تہذیب کے وہ اثرات بھی رہیں جن میں مسلمانوں کے سوز و ساز اور آرزو و جستجو کا سرمایہ ہے علی گڑھ کی تعلیم و تربیت سے اور اس کے پیام و عمل سے ہندوستانی مسلمانوں کا کردار بنے گا اور وہ اپنے خون جگر کی کاوشوں سے جدید ہندوستان کی حسین تصویر میں جلال و جمال کا رنگ بھریں گے۔ ہر مذہب و ملت کے افراد یہاں موجود ہیں۔ یہاں کی اقامتی زندگی تعلیم و تربیت کا ایک اہم وسیلہ ہے اپنی زندگی کی تشکیل میں طلبہ پر خود خاص ذمہ داری ڈالی جاتی ہے اس لئے کہ انھیں ایک آزاد ملک کا شہری بنتا ہے"

شاہ یقیناً اس عزم اور قوم کے آئندہ ارادوں سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے شاہ نے فرمایا۔ مجھے علی گڈھ ایسی دانش گاہ میں آکر بڑی مسرت ہوئی ہے۔ دکتور فی الحقوق کی اعزازی سند کے ملنے سے مجھ میں علی گڈھ میں ایک لازوال رشتہ پیدا

ہو گیا ہے یہ میرے لئے اور بھی مسرت کی بات ہے - سید احمد خاں نے علی گڑھ کو قائم کر کے اسلامی ہند کی غیر معمولی خدمت کی ہے میں ان کے حضور نذر عقیدت پیش کرتا ہوں - میں چاہتا ہوں کہ علی گڑھ اور طہران کے درمیان طلبہ کا تبادلہ ہوتا رہے تاکہ وہ یہاں سے علم و عمل ، اخلاق اور محبت و ایثار کے پیکر بن کر نکلیں - میں علی گڑھ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سید نا کی جانب سے دیئے گئے عصرانہ میں شاہ ناسازی طبیعت کی بنا پر شامل نہ ہوئے ملکہ ارباب جامعہ کی معیت میں اس روح پرور عصرانہ میں تشریف لائیں جہاں ہزاروں طلبہ اساتذہ اور اراکین جامعہ ان کا انتظار کر رہے تھے - شام کو یونین ہال میں دورۂ علی گڑھ کی آخری تقریب تھی - ہال میں تل رکھنے کو جگہ ہو یا نہ ہو آدمی کا سماجانا واقعتاً کار دشوار تھا - ہال طلبہ اور طالبات سے کھچا کھچ بھرا تھا - شاہ اور ملکہ پہلوی مسلسل سوا گھنٹہ کے انتظار کے بعد یونین ہال میں تشریف لائیں - یونین کو خطاب کرتے ہوئے شاہ نے فرمایا کہ میری یہ خواہش ہے کہ میں پھر ایک مرتبہ ۲۰ سالہ نوجوان طالب علم بن جاؤں اور علی گڑھ کو اپنی تعلیمی زندگی کے لئے منتخب کروں اس کا کوئی امکان تو نہیں لیکن میری نیک خواہشات علی گڑھ کے ساتھ ہیں اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے دورۂ ہندوستان میں علی گڑھ کا نام خاص طور پر پیش کیا گیا تھا - اور میں نے بھی خاص طور پر علی گڑھ کو اپنے دورہ کا مرکز بنایا تھا - علی گڑھ اسلامی ہند کا مرکز ہے اور مشہور عالم درسگاہ ہے - خدا اس دانش گاہ کو عرصۂ دراز تک زندہ و پائندہ رکھے (LONG LIVE THIS INSTITUTION.)

شاہ دعائیں دے کر چلے گئے - اور علی گڑھ پر پوری طرح امتحانات سوار ہو گئے طلبہ اور طالبات امتحان دینے کی اور اساتذہ و استانیاں امتحان لینے کی گھاتیں تیار کرنے لگے - اپریل کے آخر تک شاید اب یہاں زندگی کی ہما ہمی اور کیف و مستی لوٹ کر نہیں آئے گی - پھر یونیورسٹی بند ہو جائے گی - تین مہینے بند رہ کر جولائی اگست میں پھر

کھلے گی۔ آئندہ سال کیا کیا ہو کون کون آئے اور کیا مشاغل رہیں خدا بہتر جانتا ہے لیکن یہ سال علی گڑھ کے لئے جتنا مبارک اور غیر معمولی ثابت ہوا ہے اس کی ۸۰ سالہ زندگی میں ایسی مثال ملنا مشکل ہے۔

خدا کرے علی گڑھ نئے انسان کی تربیت میں جو نئی پرامن دنیا کا معمار بن سکے اور انسانیت، تہذیب اور امن و آشتی کے لئے دوسروں کے دوش بدوش مساعی ہو سکے اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر کے اسے مکمل نیا انسان بنانے میں کامیاب ہو۔

جعفر مہدی تاباںؔ

غزل

کہنے کو تو ہم کہہ دیں افسانۂ غم ساقی
لیکن تیری نظروں کا کھلتا ہے بھرم ساقی

میخانہ کی راہوں کے یہ پیچ یہ خم ساقی
پینے سے بہت پہلے بہکے ہیں قدم ساقی

خود شیخ و برہمن کے ہیں قلب سیہ خانے
بدنام ہیں ناحق کو یہ دَیر و حرم ساقی

مجبور ہیں وہ اپنی معصومیٔ فطرت سے
کرتے ہیں ستم لیکن ہوتا ہے کرم ساقی

جلوؤں میں نہاتا ہے اک تاج محل بن کر
جب حد سے گذرتا ہے محبوب کا غم ساقی

حضرت محسنؔ کاکوروی

محمد عبداللطیف صدیقی سفیرؔ

اگر اودھ نے مرثیہ نگاری میں میر انیسؔ اور صوفیانہ یا عارفانہ شاعری میں شاہ تراب علی قلندرؔ پیدا کئے تو قطعاً اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نعت گوئی میں مولوی محمد محسن صاحب محسنؔ کا جواب بھی دوسرا نہ ہو سکا تمام شاعروں نے مسلمانوں نے بالعموم اور ہندوؤں نے بالخصوص اپنے دیوان کی ابتدا نعت گوئی سے کی ہے اور ہر شخص نے حسب حیثیت کچھ نہ کچھ اس صنف خاص میں لکھا ہے لیکن جو درجۂ کمال قدرت کی جانب سے محسنؒ کو نصیب ہوا وہ ہر شخص کا حصہ نہ تھا۔

حضرت محسنؒ کے علاوہ اس صنف خاص میں شہیدیؒ منشی امیر احمد مینائیؒ اور شہید بھی بہت مشہور ہوئے۔ لیکن نعت گوئی میں محسنؒ کاکوروی کا کوئی ہم پلہ نظر نہیں آتا وجہ یہ ہے کہ محسنؒ نے اپنی تمام عمر میں سوا نعت گوئی کے کچھ نہیں کہا اور جو کچھ کہا دل سے کہا۔ ان کا ہر شعر بجائے خود ایک نغمۂ پرکیف ہے جس کا اندازہ صرف ارباب ذوق ہی کر سکتے ہیں۔ حضرت محسنؒ نے اپنی ساری زندگی گوشۂ گمنامی میں بسر کی آپ نے اپنے کمال کا کسی نام و نمود اور پروپیگنڈے کے ذریعہ مظاہرہ نہیں کیا۔ عرصۂ دراز تک اہل ملک آپ کے نام سے بے خبر رہے۔ مگر گمنامی کے یہ بے حقیقت پشتے آخر کب تک شہرت کمال کے سیلاب کا مقابلہ کر سکتے تھے آخر کار دنیا نے دیکھ لیا کہ شعر و ادب کی فضا حضرت محسنؒ کے الہامی نغموں سے گونج اٹھی۔ اس مغرب زدگی کا برا ہو کہ اس نے ہمارے دل و دماغ کو ایسا متاثر کیا ہے کہ ہم ہر چیز کو مغرب کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

یورپ و امریکہ کے گمنام سے گمنام مصنفین شعرا اور دوسرے اہل کمال کی شخصیتیں ہما
غور و فکر کا موضوع بنی ہوئی ہیں لیکن ہم نے اپنے شعرا و مشاہیر کو فراموش کر دیا ہے۔ بز
برکلے اور شکسپیر کے مقالات پر ہم جان دیتے ہیں ۔ مگر امام رازیؒ و امام غزالی رشاہ
کی تصنیفات سے بے اعتنائی کر رہے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ حضرت محسنؒ کے کلام کی زیا
اشاعت کی جائے اور ان کی شرح لکھی جائے ورنہ زمانہ کی لاعلمی کو دیکھتے ہوئے یہ کو
از قیاس نہیں ہے کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ لوگ محسنؒ کے نام کو فراموش کر دیں گے
حضرت محسنؒ کو ابتدائے حیات ہی سے مذہب اور محبت خدا و رسول سے ایک خاص
پیدا ہو گیا تھا یہی سبب ہے کہ آپ نے نعت رسولؐ کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دیا
اشعار تغزل کی جان اور سلاست کی روح ہیں ان میں جابجا کیف و سرمستی بھی پائی جاتی ۔
مگر حب رسولؐ کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ۔ فارسی کے نعت گو شعرا
حضرت جامیؒ کا مرتبہ سب سے عالی ہے ۔ حضرت جامیؒ اور حضرت محسن کے کلام کا موا
کرنے کے بعد سب کو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ حضرت محسنؒ ہندوستان کے جامیؒ ہ
جناب محسنؒ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کس درجہ محبت تھی اور نعت رسولؐ کو شا
کا موضوع بنانے پر کس قدر فخر و ناز تھا اس کا اندازہ ناظرین کو مندرجہ ذیل اشعار
بخوبی ہو جائے گا اور یہ واضح ہو جائے گا کہ قدرت نے ان کو صرف نعت و منقبت
ہی پیدا کیا تھا ۔ میرے اس قول کی تصدیق خود جناب محسنؒ کے ایک شعر سے ہوتی ہے

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسنؔ — کلام نعتیہ رکھا مری زباں کے لئے

دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔

سخن کو رتبہ ملا ہے مری زباں کے لئے — زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لئے

غزلیات محسنؔ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام طور پر صاف اور سیدھے مضا
نظم کئے گئے ہیں ۔ تشبیہات و استعارات کا اس درجہ خیال نہیں کیا گیا کہ اصل مضمون ذہن

مفقود ہو جائے نہ تلازمہ و تلمیح کی پابندی کا لحاظ اس حد تک رکھا گیا ہے کہ مطلب کے خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ باقی رہے بعض دقائق طرز ادا و خوبی بیاں کی بدولت نہایت معمولی تشبیہوں میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک آفت جاں تری ادا ہے — عاشق کو قضا کا سامنا ہے
مستی اب کیجئے گلزار مناجات کی سیر — کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرتا بادل
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل — میرے ایمان مفصل کا یہی ہے مجمل
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی — نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے — صرف تیرا ہو بھروسہ تری قوت ترا بل
ہو مرا ریشہ امید وہ نخل سرسبز — جسکی ہر شاخ میں ہو پھول ہر اک پھول میں پھل
آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تا دم مرگ — شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

فلسفی کی عقل ہمیشہ دلیل کی محتاج رہتی ہے لیکن صوفی عالم کی ہر چیز کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ وہ مظہر خدا ہے اس لئے وہ نظام عالم سے براہ راست تعلق رکھتا ہے اور فلسفی بالواسطہ۔ فطرت ہمیشہ عشق الٰہی کی طرف مائل کرتی رہتی ہے لیکن اس کی صلاحیت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اس لئے وہ ان اشاروں کو نہیں سمجھتے

نام احمد بزباں ستر بلا میم بصدر — لب پہ ہو صل علیٰ دل میں مرے عز و جل
روح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل — کہ مری جان مدینے کو جو چلتی ہے تو چل

خدا کے دیدار سے انسان کو جو مدارج عالیہ حاصل ہوتے ہیں وہ تو عقل ہی میں نہیں آ سکتے۔ مرشد کا کام صرف راستہ دکھا دینا ہے اس پر چلنا سالک کا فرض ہے لیکن اگر اس کے قدم اعتدال سے ذرہ برابر بھی ہٹ گئے تو یقینی طور سے گمراہ ہو جائے گا انسان کو راہ سلوک میں ہزار ناکامیاں ہوں لیکن اس سے الگ نہیں ہونا چاہئے۔ خدا کا جلوہ صرف محاسبہ و مراقبہ سے نظر آ سکتا ہے بحث و مباحثہ سے دکھائی نہیں دے سکتا۔

کہیں جبریل اشارہ سے کہاں بسم اللہ　　　سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

فنائے جہاں و بقائے رحمٰن کے تحت میں جو کچھ لکھا ہے اس کو دیکھکر غیر ممکن ہے کہ آدمی کے آگے ناپائیداری دنیا کا عبرت آموز نقشہ نہ کھنچ جائے ۔ فرماتے ہیں ۔

رسوا کیا مرا غم دل پاش کر دیا　　　طوفان اشک نے مری مٹی خراب کی

دھبا لگا کفن کو مرے جسم زار سے　　　گاڑا مجھے زمین کی مٹی خراب کی

غم دل پاش کردہ ا کی خوبصورت ترکیب کی داد نہ دینا ظلم ہے ۔

جناب محسنؔ کے عاشقانہ اشعار میں ایک خاص کیفیت پایا جاتا ہے جو ان کے کمال شاعری کا ناقابل ابطال ثبوت ہے مگر سچ یہ ہے کہ قدرت نے ان کو نعت و منقبت کے لئے ہی پیدا کیا تھا ۔ مسجد اقصیٰ میں آنحضرت صلعم نے دوگانہ شکر ادا کیا اور ارواح انبیاؑ نے اقتدا کی ان اشعار میں اشارہ ارواح انبیاؑ کے موجود ہونے کا ہے ۔

پیش نظر جناب عالی　　　بیت المقدس کا باب عالی

وہ سرور انبیائے پیشیں　　　وہ باعث فخر شرع و آئین

مسجد کے قریب آکے اترا　　　آداب سے سر جھکا کے اترا

ایک ہاتف غیب داں خبردہ　　　اسریٰ لے سیحا نہ بعبدہ

ہر شے تھی وہاں کی حیرت افزا　　　اللہ کے گھر میں تھی کمی کیا

ظلمت کے غبار سے نمایاں　　　گرد رہ لشکر سلیماں

شان لب بام سے ہویدا　　　جان بخشی حضرت مسیحا

غزلیات محسنؔ کی سب سے بڑی خصوصیت معیار اخلاق کی بلندی ہے آپ کو تلاش سے بھی ایک شعر ایسا نہیں مل سکتا جو اعلیٰ ترین معیار تہذیب سے گرا ہوا ہو ۔

حالت نہ پوچھئے مرے شیب و شباب کی　　　دو کروٹیں تھیں عالم غفلت کے خواب کی

بربادی امنگ ہمارے شباب کی　　　مٹی خراب کی دل خانہ خراب کی

ہوسنے نہ پائی خشک بھی تردامنی مری
خشر ہیں دھوپ ڈھلنے لگی آفتاب کی

جناب محسنؔ فطرۃً ذکی الحس۔ بلند نظر اور صاحب وجد وحال تھے۔ اس لئے ان کا ایک ایک شعر بلندی خیال۔ شکوہ الفاظ۔ جوش بیان اور ندرت ادا کا ایک دلفریب مرقع ہے اسرار و معارف ان کی شاعری کا ہیولیٰ اور جوش بیان اس کا رنگ ہے مثلاً اشعار ذیل ملاحظہ ہوں

دھبا لگا کفن کو مرے جسم زار سے
گاڑا مجھے زمین کی مٹی خراب کی

سرخی کشا کے خون شہیدان عشق کی
اسے آسمان زمین کی مٹی خراب کی

مقصود آفرینش محبوب کبریا
کیا بات ہے جناب رسالتمآب کی

مضمون نعت میں پڑھو محسنؔ کوئی غزل
کیوں گل زمین شعر کی مٹی خراب کی

فلسفہ رسالت کے اس مسئلہ پر حکماء کا اتفاق ہے کہ رسول زمانہ بعثت میں تمام عمدہ خصائل انسانی کا نمونہ ہوتا ہے اس کی ذات میں تمام وہ باتیں مکمل طور پر پائی جاتی ہیں جن کا شمار محاسن میں ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک ایسا شخص گو جامۂ انسانی میں ہے لیکن صفات صمدی سے مزین ہے۔ جناب محسنؔ کا ہر شعر بجائے خود ایک نغمۂ پر کیف ہے جس کا اندازہ صرف ارباب ذوق کر سکتے ہیں ان کے کلام میں انتخاب دشوار ہے تاہم حسب ذیل اشعار کلیات محسنؔ میں سے اور اسی طرح میں منشی امیر احمد امیر مینائیؒ کے نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ابیات نعت محسن

الٰہی کس کے غم میں نکلے آنسو چشم فتّاں سے
کہ عطر فتنہ میں ڈوبا ہے رومال اس سہی قد کا

ہوا ہیں ناتواں سنکر صدائے پائے دلبر کو
مجھے کھٹکا تھا شل ہمزۂ وصل اسکی آمد کا

کنارے پر بٹھا لے مجھ کو ظالم اپنی محفل میں
گناہ شوق بیحد ہے جو میں ہوں مستحق حد کا

بنایا خامۂ مو کو ہمارے دست لاغر سے
کھنچا لیکن نہ دامن اے مصور اس سہی قد کا

اڑینگے چٹکیوں میں تیر ترکش سے جدا ہو کر
ہمارے بعد ہے اللہ تیرے ظلم بیحد کا

لکھے رو رو کے مضمون بےکسی کے دشت غربت میں — زمیں شعر پر عالم ہوا دریا پر آمد کا
تری کیا بات ہے اے شاہد پاک سخن واللہ — عجب انداز ہے ناز و ادا کا چال کا قد کا
الٰہی پھیل جائے روشنائی میرے نامے کی — بڑھا معلوم ہو لفظ احد میں میم احمد کا

ابیات نعت حضرت امیر مینائی

خدا جانے کب آنا ہو چمن میں اس سہی قد کا — بجا رکھا ہے کیوں غنچوں نے ڈنکا آمد آمد کا
کمر کا وصف کرنا صاف حال غیب کہنا ہے — دہن کی مدح لکھنا کھولنا ہے قفل ابجد کا
مگر توصیف رخسار و خط و گیسو سے کیا حاصل — وظیفہ تھا جو ان بیتوں میں ہوتا وصف احمد کا
الٰہی ہو گزر تعلیم گاہ بزم مولا میں — جھکے ایسا کہ شکل دال بن جائے الف قد کا
جو انکے دوست کا ہو دوست سب کو دوست ہوتا ہے — خدا اکا کیوں نہ عاشق ہوں وہ عاشق ہے محمدؐ کا
فنا و فقر کے مضموں تو باندھے اے امیر اچھے — سنا کوئی غزل بھی اب کہ دل مشتاق ہے حد کا

مولانا حکیم عبدالحئی مرحوم نے اپنے تذکرہ گل رعنا میں جناب محسنؒ کے حالات میں فرمایا ہے کہ "شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا ابتدا میں کچھ غزلیں بھی لکھیں اور کبھی کبھی کسی کی فرمائش سے قصیدہ یا مثنوی یا دوستوں اور بزرگوں کی تحریک سے تاریخہائے ولادت و وفات لکھیں اس کے سوا نعت کے سوا انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ کلیات ان کے بڑے بیٹے مولوی نورالحسن نیر بی۔اے ایل ایل بی نے جمع کرکے چھپوا دیا ہے اس میں سب سے پہلے ایک نعتیہ قصیدہ گلدستہ کلام رحمت ہے ۱۲۵۸ھ میں لکھا تھا اس کے بعد سراپائے رسول اکرم ہے جس کو ۱۲۶۶ھ میں تصنیف کیا تھا پھر ان کا مشہور قصیدہ جو شہیدی کے قصیدہ کے جواب میں ہے اس کو ۱۲۷۴ھ میں لکھا تھا اور منشی امیر احمدؐ امیر مینائی مرحوم نے اس کی تضمین کی ہے پھر چتر شاہنشاہی ایک ترکیب بند ہے جو واجد علی شاہ کی تعریف میں کسی دوست کی فرمائش سے اور انھیں کے نام سے لکھی تھی پھر مثنوی صبح تجلی ہے جو ۱۲۸۹ھ میں لکھی ہے پھر فغان محسن

اور نگارستانِ الفت" چھوٹی چھوٹی متفرق ... ان کو ... ۱۳۰۵ھ میں لکھا تھا۔ مدیح خیر المرسلین ان کا وہ مشہور نعتیہ قصیدہ ہے جس نے ہر گروہ سے خراج تحسین وصول کیا ہے اس کا پہلا مصرع ہے۔

"سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل"

عام طور پر ان کے کلام کا مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کا شان و شکوہ، بندش کی چستی، استعاروں کی رنگینی اور قصد طلب تلمیحات ہیں جن میں ان کے معاصرین میں کوئی ان کا شریک نہیں بلکہ اردو شاعری میں اس کا جواب نہیں۔

"مولوی احسن اللہ صاحب ثاقب نے مکتوبات امیر مینائی کے مقدمہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ منشی امیر احمد امیر مینائی سے جناب محسن کاکوروی کی سخن آفرینی اور بلاغت کلام کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ ان کا کلام ایک عالم ہے خیالاتِ نادرہ کا۔ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہوتا ہے اور ان کا ہر شعر معراجِ بلاغت ہے۔"

۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی مرتے وقت پاس انفاس جاری تھا تاریخ وفات منشی زین العابدین فرجاد نے بڑی معقول نکالی جو کہ آیہ کریمہ ہے إنہ فی الآخرۃ لمن الصالحین۔

مزار بمقام مین پوری متصل مزار مولوی حسن بخش مرحوم کے ہے۔

منظرؔ نقوی امروہوی

غزل

جب تصوّر میں وہ با دیدۂ تر آتے ہیں
کتنے موتی مرے دامن میں نظر آتے ہیں

وہ بنا دیتے ہیں، ہر دشت کو رشکِ گلزار
کوئے جاناں سے جو اک بار گذر آتے ہیں

زیست دشوار سہی، غم سے گرانبار سہی
ہم کو مرمر کے بھی جینے کے ہنر آتے ہیں

کیا عجب ہے کہ ہوا چل پڑے، بادل چھٹ جائیں
دُور دو چار ستارے سے نظر آتے ہیں

اشک آنے کو تو آتے ہیں شبِ غم، منظرؔ
اپنے دامن میں لئے نورِ سحر آتے ہیں

ایک میلہ، ایک دُنیا

امیر شرر

کتنے حسین ہوتے ہیں وہ لمحات جب ذہن عہد ماضی کی خوشگوار یادوں کی آماج گاہ بنا ہوا ہو۔ دوسرا انٹر ورسٹی یوتھ فیسٹیول ختم ہوچکا ہے اور اس کے ہنگامے بھی سرد پڑ چکے ہیں لیکن اس کی خوشگوار یادیں اب بھی ذہن کو دستک دے رہی ہیں اور اس ایک ہفتے کی ساری گہما گہمی ذہن کے عمیق گوشوں میں رچی ہوئی ہے۔ اس وقت وہ صبح یاد آ رہی ہے جب ہم پہلی بار نوجوانوں کے اس میلے میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ وہ صبح جس کا ہمیں مدت سے انتظار تھا۔ ہمیں وہ صبح بیحد حسین معلوم ہوئی شاید اس لئے کہ اس صبح کی پہلی ننھی کرن نے ہماری امنگوں کی معصوم کونپلوں کو چوم کر شگوفہ بنا دیا تھا، ایک اجنبی ماحول سے متعارف ہونے کی امنگیں، ایک ایسی تہذیب سے متعارف ہونے کی امنگیں جسے ہندوستان کے مختلف گوشوں کے طلبا، اور طالبات ترتیب دے رہے تھے۔

باوجود ان دشواریوں کے جنھیں سیلاب کی تباہ کاریوں نے ہمارے درمیان لا کھڑا کیا تھا ہم دہلی پہونچ ہی گئے۔ بس میں بیٹھ کر تو جیسے ہمارے پر لگ گئے، ہم لمحہ بہ لمحہ تال کٹورا گارڈنز سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے اشتیاق کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ دلی جو ہمیشہ سے ہماری تہذیبی اور تمدنی زندگی کا مرکز رہی ہے ہمارا خیر مقدم کر رہی تھی تال کٹورہ گارڈنز کے باہر بسوں، ٹیکسیوں اور آٹو رکشا کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔

ہم مخصوص دروازے سے تال کٹورہ باغ کے اندر لے جائے گئے۔ اندر دروازے کے بعد

داہنی طرف منتظمین کے خیمے لگے ہوئے تھے، اور ان خیموں کے پیچھے طالبات کے خیمے تھے انھیں میں ہماری درس گاہ کی طالبات بھی مقیم تھیں۔ سڑک کی بائیں جانب انکوائری آفس، ڈاک خانہ ٹیلیفون بوتھ اور ہسپتال کے خیمے تھے دروازے سے کچھ دور چل کر ایک شاہراہ تھی وہاں سے بائیں جانب کی سڑک باغ اور پارک کی طرف نکلتی تھی، داہنی جانب کی سڑک فیسٹیول کینٹین، اوپن ایر تھیٹر، اور ڈائننگ ہال کے قریب پہونچ کر زاویہ قائمہ بناتی ہوئی خیموں کے کنارے کنارے آگے جا کر ایک بار پھر زاویہ قائمہ کی شکل میں خم کھا گئی تھی۔ شاہراہ پر داہنی جانب لوہے کی سلاخوں سے بنا ہوا یوتھ فیسٹیول کا نشان ایک پلیٹ فارم پر بنا ہوا تھا جس پر LEAD ON YOUTH لکھا ہوا تھا ڈائننگ ہال کی طرف جانے والی سڑک پر داہنی جانب کنارے پر ساری درس گاہوں کے نشان لگے ہوئے تھے اور بائیں جانب مختلف درس گاہوں کے جھنڈے نصب کئے گئے تھے۔ شاہراہ پر یوتھ فیسٹیول کا نشان ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے خطوط پر مشتمل تھا جن کے ہاتھوں میں ایک مشترکہ مشعل روشن تھی۔ اسی سڑک پر نشیب میں بیشمار خیمے نصب تھے۔ یہ سڑکیں مربع کی چار لکیروں کی طرح ایک دوسرے سے جا ملتی تھیں

غرض تال کٹورہ گارڈنز میں چھوٹے چھوٹے خیموں کا ایک خوبصورت شہر آباد تھا جس پر فردوس کا دھوکا ہوتا تھا دور تک پھیلے ہوئے خیموں کے بابہ شفاف سڑکوں پر رنگ و روپ جوانی اور خوش نظمی ہمارا خیر مقدم کر رہی تھی پہلے سے دوسری درس گاہوں کے آئے ہوئے طلباء کے چہروں پر خوشی کے اثرات نمایاں ہو گئے۔ ان کی نگاہوں میں مسرتوں کے ایاغ جل اٹھے جیسے انھیں اپنے خاندان میں نئے افراد کے اضافے کی بے حد خوشی ہو۔ ہمیں ان کے نقوش جانے پہچانے نظر آئے جیسے ہم ان میں مدت سے رہتے آئے ہوں۔

"ہم اجنبی نہیں ہیں"، جیسے بے اختیار دل نے کہا۔

اور ہم اجنبی نہیں تھے، ہم ایک تھے ایک ہی ماں کی گود میں پروان چڑھے ہوئے سبھی نوجوان ایک تھے۔ اور اس وقت ہمیں اپنی عظمت کا احساس ہوا، ان نوجوانوں کی عظمت کا

احساس ہوا جو اپنے ملک و قوم کے معمار ہیں۔

شام دلہن بنی خیموں کی اوٹ میں گھوم رہی تھی اور سڑک پر علی گڈھ کی سیاہ شیروانیاں لہرا رہی تھیں۔ ہمیں اس وقت اپنی پوشش پر فخر کا احساس ہوا جب تمام نگاہیں ہماری یکسانیت میں جذب ہو گئی تھیں۔ سب ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہم کھانے کے خیمے میں ہندوستان سے آئے ہوئے دوسری درسگاہوں کے طلبا سے محو گفتگو تھے۔ چائے اور کافی کی بھینی بھینی خوشبو فضا کو معمور کر رہی تھی۔ یہ ہمارے ملک کی جاگیرتی کا دوسرا (اس سے پہلے پچھلا پہلا انٹر ورسٹی یوتھ فیسٹیول ہو چکا ہے) قدم تھا۔ اس وقت ہمیں ہندوستانی تہذیب کی ایکتا کا احساس ہوا جس کی ملک کو ترقی کے لئے اشد ضرورت ہے، یہ ہمارے لئے تواریخی موقعہ تھا کہ کشمیر کے شاداب لالہ زاروں سے لے کر راس کماری تک کے اور آسام سے لے کر گجرات تک کے سارے طلبا اور طالبات ایک دوسرے میں گھل مل رہے تھے، ان کی تہذیب، زبان اور ان کی معاشرت ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھی، سب ایک فضا میں سانس لے رہے تھے، ایک دوسرے کو سمجھنے کی سعی کر رہے تھے اور ہماری وہاں کی زندگی ملک کے درخشاں مستقبل کی آئینہ دار تھی۔ آج تک ہمارے درمیان اختلافات کا جو خلیج حائل تھا ہم اسے سرجوڑ کر پاٹنے کی کوشش کر رہے تھے اور یہی ہمارا سب سے بڑا مقصد تھا۔

۲۲ راکتوبر کی شام بھی بے حد رنگین تھی۔ ہماری نئی زندگی کی پہلی شام کے سائے بہے ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرف چہل پہل تھی، سنہری مرمریں انگلیاں سازوں کی شہرگ کو چھو رہی تھیں، نغموں کی سانسیں فضاؤں میں چہک رہی تھیں، پائل کی جھنکار کا تقطر ہواؤں میں پھیل رہا تھا اور رات راگنیوں سے معمور تھی۔ باوجود سفر کی دشواریوں کے تکان کا نام و نشان تک نہیں تھا جیسے زندگی صبح کی شبنم کے شفاف قطروں سے نکھر گئی ہے۔ ریہرسل، لطیفے، نغمے اور موسیقی ہماری خیمے کی زندگی کے اہم جزو بن گئے تھے۔ مقابلے کے پروگراموں اور کیمپ فائر کے

سے فرصت ملتی تو خیموں کی فضائیں راگ راگنیوں سے معطر ہو جائیں۔ کیمپ فائر مقابلے کے پروگراموں کے بعد ساڑھے گیارہ بجے شب کے بعد سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں مختلف درس گاہوں کے طلبا، اور طالبات الگ الگ حلقے بنا کر اپنے اپنے پروگرام پیش کیا کرتے تھے، کہیں فلمی گانے اور کہیں اس کی دھنوں کا سازینہ اور سازینہ پر رمبا سمبا کے اسٹائل پر رقص، گیت اور عوامی رقص، چورن بیچنے والے (علی گڑھ کے ارشا نانی) اور پشتو ریڈیو کے مزاحیہ مکالمے عجیب منظر پیش کرتے تھے۔ علی گڑھ کے طلبا، نے بھی دو ایک بار اس میں شرکت کی لیکن ان کی حرکات میں وہ بیباکی نہ آ سکی جو دوسری درس گاہ کے طلبا میں تھی گو ایسی شرکت کے مواقع علی گڑھ نے کم حاصل کئے کیونکہ ان کے آوٹ ڈور اپائنٹمنٹ کافی تھے اسی لئے وہ اس زندگی کا لطف کم اٹھا سکے پھر بھی کم مظاہروں کے نقطۂ نظر سے انھیں کافی کامیابی ملی۔

پھر ہم ان نصف شب کے ہنگاموں سے الگ ہو کر اس نئی زندگی کی کلپنا لئے حسین خوابوں میں گم ہو جاتے۔

۲۲ راکتوبر کو ہمارے باضابطہ پروگراموں کا پہلا دن تھا۔ نئی صبح کی زرنگار شعاعوں نے جب خیمے کے باہر سبزے پر بکھرے ہوئے شبنمی موتیوں کا منہ چوما تو آسمان کے مشرقی گوشوں میں صبح کا سونا گھل رہا تھا اور نوجوانوں کے اس میلے میں زندگی شروع ہو چکی تھی۔ نوجوانوں نے اس عظیم میلے کو دیکھ کر اس کا علم ہوا کہ ہماری قوم زندہ ہے، ابھر رہی ہے اور نوجوانوں کے دلوں میں نشاط ثانیہ کے تحفظ کا پورا پورا احساس ہے فن پنپ رہا ہے اور اصناف لطیف کی تحریک سرعت سے نوجوانوں کے دلوں میں جڑیں پکڑ رہی ہے۔ یہ ہمارے میلے کا افتتاحیہ دن تھا، ہم سب پر اضطرابی کیفیت طاری تھی اور ہم بے قراری سے شام کے منتظر تھے کیونکہ وزیر تعلیم کے دیئے گئے ایٹ ہوم کے بعد ہمارے وزیر اعظم پنڈت جی اس فیسٹیول کا افتتاح کرنے والے تھے دوپہر کے کھانے پر ہم سب بھی ایک ساتھ جمع ہوئے۔ کھانے اور ناشتے کا انتظام دیکھ کر نزول کا

زمانہ یاد آگیا جب زندگی کی ہر ضرورت کے لئے کارڈ ہوتا تھا - یہاں بھی ہمیں کھانے، ناشتے کے لئے، باہر آنے جانے اور پروگراموں میں حصہ لینے کے لئے کارڈ تقسیم کئے گئے تھے کبھی کبھی میلے میں داخلے کے وقت پہچان کے کارڈ کے بجائے راشن کارڈ سے اور کھانے کے وقت راشن کارڈ کے بجائے پہچان کے کارڈ سے بھی کام نکل آتا تھا - ان پابندیوں کے باوجود بھی کنٹرول کے زمانے کی سی بدنظمی نہیں تھی - ڈائننگ ہال میں کھانے اور ناشتے کی کافی سہولت بھی - منتظمین میں سے ایک صاحب قابل غور تھے جن کو دیکھکر مجھے ہمیشہ ایک فلمی گانا "سر پہ لال ٹوپی روسی پھر بھی دل ہے ہندوستانی" یاد آجاتا گو مجھے فلمی گانوں سے دلچسپی نہیں پھر بھی ان کے حلیے کی وجہ سے میرے ذہن میں اس گانے کی یاد تازہ ہو جاتی کیونکہ میں نے ہمیشہ ان کے سر پر فوجی وضع کی سرخ ٹوپی دیکھی اور دل بھی ان کا خالص ہندوستانی اسٹائل کا تھا، بے حد مہماں نواز اور خلیق، کھانے کے معاملے میں ہم لوگوں کے ساتھ کافی رعائتیں کرتے تھے - اس وقت بھی وہ مجسم تصویر بنے ہمارے سامنے کھڑے تھے، اور ہم چھوت چھات کی غلاظتوں سے پرے سب ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے - "سامبر" مدراسی کھانے کا اہم جزو ہے، ہمارے کشمیری بنگالی اور ہم اس سادہ انڈین ڈش سے لطف لے رہے تھے بنگالی اپنی وضع چھوڑ کر چاول کے بجائے روٹیوں اور ڈبل روٹی کی سلائسس پر بے حد خوش تھے - ہم مدراسی، بنگالی، پنجابی، آسامی کشمیری اور تمام صوبجاتی بھید بھاؤ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کی روحوں میں سرایت کر جانے کی سعی کر رہے تھے -

ہم نے زندگی کو پہلی بار اس کے حقیقی روپ میں دیکھا تھا - ہمارے کئی مشفق اساتذہ بھی ہمارے نگراں ہو کر گئے تھے مگر چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب ہم میں گھل مل گئے - ہمارے ساتھ زندگی کے نقرئی قہقہوں میں گم ہو گئے مگر جہاں ہمیں ان کے دوش بدوش کام کرنے میں خوشی کا احساس ہوا وہیں ان چند ایک شفیقوں کے رویئے پر ذہن کو ایک تلخی کا احساس بھی ہوا مگر اس تلخی کا کڑوا کسیلا احساس فوراً ہی ڈاکٹر محمد حسن صاحب کی ظرافت آمیز باتوں

قہقہوں سے معمور لطیفوں میں جذب ہوگیا سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے کبھی ہمیں یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ہم سے الگ بھی کوئی مجاز رکھتے ہیں۔ وہ علی گڈھ سے ہمارے ساتھ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں ہنستے کھیلتے قہقہے بکھیرتے دہلی آئے اور یہاں کے ہنگاموں میں بھی ان کے قہقہے معدوم نہ ہوسکے۔ ان کے اس طرز عمل نے ہماری اس نئی زندگی کو بڑا سنبھالا دیا اور زندگی کی رعنائیاں اور بڑھ گئیں۔ بہرحال زندگی کے چند گوشے تاریک بھی ہوتے ہیں اور یہ ضروری بھی نہیں وہ تاریک گوشے ہمیشہ تاریک ہی رہیں۔ وہاں کی زندگی نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے جن کا نور ان تاریک گوشوں کو اجال دے گا۔

ملاقاتیں، یہ اجتماع، اور یہ میلے ہمیں بہت کچھ دیتے ہیں۔ اس بار سب سے بڑی چیز جو ہمیں ملی وہ ہماری آزادی کا حقیقی احساس تھا۔ علی گڈھ کی زندگی کا یہ تاریک ترین پہلو رہا ہے کہ یہاں صنف لطیف اور صنف سخت دوش بدوش کبھی میدان عمل میں نہیں آئے انھوں نے یونیورسٹی کے کلچرل پروگراموں میں کبھی ایک ساتھ حصہ نہیں لیا۔ ان کے درمیان ہمیشہ دیواریں حائل رہیں مگر اس میلے نے ان دیواروں کو ڈھا دیا، ان پابندیوں کو مسدود کردیا جو انھیں ہمارے قریب آکر ہمارے ساتھ زندگی کو خوبصورت بنانے سے روکتی تھیں یہاں ہمیں آزادی بے نقاب نظر آئی۔ یہاں طالبات اپنے خیالات کا اظہار انتہائی بے باکانہ انداز میں کررہی تھیں، وہ شانہ بہ شانہ ہمارے پروگراموں میں شریک تھیں۔ یہاں ہمیں صنف نازک اور صنف سخت کی بقائے باہمی کا انتہائی کامیاب تجربہ نظر آیا علی گڈھ کی تو بات ہی اور ہے درحقیقت ہمارے ملک میں صنف نازک پر بے جا پابندیوں نے ان کے حوصلوں کو پامال کردیا تھا ان کے جوہر آہنی قیود کے بوجھ تلے دب کر فنا ہوتے جارہے تھے کہ مخلوط تعلیم نے ان کے مجروح حوصلوں کو بڑھاوا دیا اور اب یہ کلچرل اجتماع ان کی زندگی میں نئی روح پھونک رہے ہیں یہی ہمارے لئے بہت بڑی کامیابی ہے۔

شام اپنی پوری شوخیوں کے ساتھ تال کٹورہ پارک کے مخملیں لان پر ناچنے لگی جہاں ہم

تمام درس گاہوں کے طلباء اور طالبات جن کی تعداد تقریباً ۴۰۰ سے زائد تھی اور جن میں نصف سے زائد طالبات تھیں ایٹ ہوم کے لئے جمع ہوئے۔ نشاط کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ پنڈت جی کے انتظار کے لمحات رقص و سرود میں گزارے گئے مگر انتظار کی یہ گھڑیاں ساڑھے آٹھ بجے تک ختم نہ ہوسکیں اور ہم ایٹ ہوم کے بعد اوپن ایئر تھیٹر میں پہونچ گئے۔

یہ تھیٹر نوعیت کے اعتبار سے انفرادی حیثیت رکھتا ہے تقسیم ملک کے بعد ہندستان میں یہ اپنی قسم کا پہلا تھیٹر ہے جس میں معمولی پردوں کے بجائے تبدیلی مناظر کے لئے "واٹر اسکرین" کام میں لایا جاتا ہے جس کے لئے ۴۲ جیٹ (JET) کام میں لائے جاتے ہیں جن میں سے اس انداز سے پانی نکلتا ہے کہ اسٹیج جو نصف دائرے کی شکل کا ہے اور تماشائیوں کے درمیان پانی کی ایک دبیز دیوار حائل ہو جاتی ہے اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ منظر تبدیل نہ ہو جائے۔ اس وقت تک یہ تھیٹر زیر تعمیر تھا اس لئے واٹر اسکرین کے بجائے بجلی کے بڑے قمقمے ہی گل کرکے کام نکالا گیا۔

ایک ہنگامہ ہوا نہرو چاچا زندہ باد کے نعروں سے رات سہم گئی اور پنڈت جی اسٹیج پر آگئے وزیر تعلیم علالت کی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ پنڈت جی اس طرح میز پر بیٹھکر تقریر کرنے لگے جیسے ہمارے گھر کا کوئی بزرگ کھانے کی میز کی گفتگو TABLE TALK میں ہمیں کچھ اہم باتیں بتا رہا ہو۔

شب کے کھانے کے بعد ڈراموں کا افتتاح ہوا۔ یہ پروگرام مقابلے کے پروگراموں کی پہلی کڑی تھی یہ ڈرامے ملک کی مختلف زبانوں میں پیش کئے گئے تھے ان ڈراموں کو دیکھکر اندازہ ہوا کہ ادب کی یہ صنف فنا و بقا کی کشمکش میں آخری سانسیں لے رہی ہے اس کی وجہ ایکٹنگ یا تکنیک میں نہیں بلکہ کہانیوں میں تھی۔ ہمارے یہاں معیاری ڈراموں کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ سنسکرت اور جنوبی ہند کی بھاشاؤں میں تو کچھ معیاری ڈرامے ملتے ہیں مگر ہندی اردو اور دوسری زبانوں میں اچھے ڈرامے نہیں لکھے گئے اس کمی کا احساس اس وقت

اور شدت سے ہوا جب وہ چند ڈرامے دیکھے جو انگریزی ادب سے مستعار لئے گئے تھے۔ اس صنف کی بقا کے لئے ہمیں قدم بڑھانا ہے، اچھے ڈراموں کی تخلیق کرنی ہے نوجوانوں کے دلوں میں شوق پیدا کرانا ہے اور یوتھ فیسٹیول میں ڈراموں کی پیش کش اس کے لئے ایک کامیاب تجربہ ہے۔

ان تمام کمیوں کے باوجود ہمیں اچھے ڈرامے دیکھنے میں آئے۔ پونا کا "سترہ ورشی"، ناگپور کا "ڈاکٹرس ڈلیما"، اور عثمانیہ کا "دی ڈارک لیڈی آف دی سونٹ"، بہت اچھے تھے۔ اس کے علاوہ پنجاب کا "زمانہ بدلے گا"، پٹنہ کا مزاحیہ "پنکچر" اور بمبئی کا "رائڈرس ٹو دی سی" سے اخذ کیا ہوا "طوفان"، بھی قابل ذکر ہیں۔ پونا نے سترہ ورشی اپنی تمام فنی صلاحیتوں کے ساتھ پیش کیا تھا اس میں تمام ڈرامیٹک سیچویشن اور مناظر میں تسلسل برقرار تھا کرداروں کے ساتھ بھی فن کاروں نے پورا پورا انصاف کیا تھا محض پس منظر کی موسیقی انتہائی جذباتی تھی جسے اس قدر جذباتی نہیں ہونا چاہیئے تھا ہدایت کار نے بڑی ہوشیاری سے ڈرامے کی سیچویشنز کو ابھارا تھا۔ "ڈاکٹرس ڈلیما" بھی تمام خامیوں سے پاک تھا اس میں بھی ہدایت کار نے ڈرامے کے تمام مزاحیہ گوشوں کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا تھا۔ عثمانیہ کا "ڈارک لیڈی آف دی سونٹ"، ہر لحاظ سے کامیاب ڈرامہ تھا۔ ہدایت کاری، لباس کی ترتیب، اداکاری اور مناظر کی سیٹنگ ڈرامے کی جان بن گئے مکالمے کی ادائیگی کا انداز بالکل حقیقی شکسپیرانہ تھا۔ خواب کی حالت میں ٹہلنے کا منظر بڑی ہوشیاری سے پیش کیا گیا تھا۔ بمبئی کا طوفان ایک المیہ تھا ساونڈ الیفکٹ اس میں بے حد حسین تھی۔ زمانہ بدلے گا موجودہ اقتصادی مسائل پر ایک کامیاب ڈرامہ تھا مگر ہدایت کار اسے پیش کرتے وقت مناظر کے تسلسل کو برقرار نہ رکھ سکا اور "جگو" کا کردار فلمی تقلید معلوم ہوئی اس طرح یہ ڈرامہ محض میلو ڈرامہ بن کر رہ گیا۔ پنکچر کی پیش کش میں اچھی ہدایت کاری کو کافی دخل رہا جس نے کہانی کے ٹیمپو کو برقرار رکھ کے اس کے مزاح کے نقطہ عروج

(COMIC CLIMAX) کو اہم بنا دیا۔

ڈرامے کے مقابلے میں ہماری درس گاہ کی ٹیم نے بھی حصہ لیا۔ اس نے خواجہ احمد عباس کا "اناس اور ایٹم بم" پیش کیا۔ کسی ڈرامے کی کامیابی میں سب سے پہلے اچھے ڈرامے کے انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ "اناس اور ایٹم بم" ایک بے جان اور کمزور تخلیق پر معمولی سا ڈرامہ ہے یہی ڈرامے کی کمزوری ہماری ناکامی کی وجہ بن گئی۔ جب ڈرامے میں روح، حرکت اور زندگی نہیں ہوتی تو اداکاروں کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔۔ ہمارے ڈرامے اور اداکاروں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

ڈرامے کے علاوہ مقابلے کے پروگراموں میں ریڈیو پلے، کلاسیکی رقص و نغمہ اجتماعی رقص و نغمہ، سازینہ، خاکے، مجسمہ سازی و کشیدہ کاری اور مصوری کے مقابلے بھی شامل تھے صبح آٹھ بجے سے کلاسیکی نغمے، سازینہ، اجتماعی رقص اور اجتماعی نغمے کا پروگرام ہوتا اور صبح تک چلتا رہتا۔ شام اپنی دوش پر پائلوں اور گھنگروؤں کی آوازیں لاتی اور رقص کے مظاہرے ڈنر تک ہوتے پھر ڈراموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ دوپہر میں ریڈیو اسٹیشن پر ریڈیو کے فن کار اپنی صلاحیتوں کے مظاہرے کرتے۔ اس طرح ترتیب دیئے گئے پروگراموں میں ہمیں لمحہ بھر کی فرصت نہیں تھی پھر بھی وقت نکال کر کبھی کبھی تو دیکھی مقامات اور دوسری قابل دید عمارتوں کی سیر بھی ہوتی رہتی تھی۔ انڈیا گیٹ جا کر چاندنی راتوں میں تمام دن سازوں کی دھڑکنوں سے کھیلنے والے اپنے ہاتھوں میں چپو تھام لیتے اور رات بے حد حسین ہو جاتی۔

فیسٹیول کے افتتاح کے دوسرے دن سے دوسرے پروگراموں کا آغاز ہوا۔ کلاسیکی موسیقی اور کلاسیکی نغمے جو ہمیشہ سے ہماری زندگی رہے ہیں پیش کئے گئے انھیں سنکر یہ اندازہ ہوا کہ امیر خسرو اور تان سین کو جنم دینے والی یہ سرزمین اب بھی اپنی کوکھ میں بے شمار سنگیت کاروں کو جنم دے رہی ہے مغلیہ دور حکومت میں جہاں موسیقی پروان چڑھی

وہیں اس کے زوال اور سامراجی دورِ حکومت کے آغاز کے بعد اس پر مشرقی رنگ اثر انداز ہونے لگا۔ ہمارے شہروں میں مشرقی الاپ کی آمیزش نظر آنے لگی مگر یہ اثر زیادہ گہرا نہ ہوسکا اور فلمی حلقوں کے علاوہ کسی نے اس رنگ کو قبول نہ کیا اس کا اندازہ ہمیں مختلف درس گاہوں سے آئے ہوئے طلبا، اور طالبات کے مظاہرے سے ہوا۔ کلکتہ کے دیوبرت چودھری نے ستار پر اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ستار پر راگ پردیپ پیش کرتے وقت انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ پراچین بھارت کی یہ کلا اب بھی اپنے اصلی روپ میں زندہ ہے۔ ان کے مظاہرے میں فن کے تکنیکی پہلو صاف طور پر نمایاں تھے۔ علی گڈھ کے جواں سال موسیقار دنیش چندر مرجی نے بھی اپنے فن کا نہایت خوبصورت مظاہرہ کیا مگر ناگپور سے آئے ہوئے ایک طالب علم دھار دوے نے اپنی سنگیت سے ہمارے کانوں میں رس گھول دیا جلترنگ سے نکلی ہوئی سنگیت دھارائیں پچھلے سارے اثرات اپنے آغوش میں سمیٹ لے گئیں۔ ستار طبلہ اور جلترنگ کے علاوہ دنیا، بانسری اور وائلن پر بھی مظاہرے ہوئے اس طرح سازینہ کا یہ پروگرام ہماری پرانی تہذیب اور تمدن کا گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ گیا۔ کلاسیکی نغموں میں دہلی کی سروجنی پردھان نے شدھ سارنگ کے دو خیال گائے انھوں نے تان اور بول تان دونوں نہایت صفائی سے پیش کئے۔ خیال کے بول موسیقی کے امتزاج کے ساتھ بڑے رسیلے محسوس ہوئے۔ گجرات کی کلگرانی نے بھیم پلاسی کے انداز میں دو خیال گائے اس طرح موسیقی کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

پچھلے سال یوتھ فیسٹیول کے مقابلوں میں اجتماعی رقص کو خالص لوک ناچ کے روپ میں پیش کرنے کی پابندی تھی جس کی وجہ سے مقابلے میں حصہ لینے والوں کی تخلیق کا میدان تنگ ہوگیا تھا اسی لئے اس سال یہ پابندی ہٹالی گئی۔ نتیجہ کے طور پر کلاسیکی اور لوک ناچوں کا حسین امتزاج پیش کیا گیا اس پروگرام میں نوجوان ذہنوں کے تخلیقی عناصر صاف ظاہر تھے ان میں لوک گیتوں اور لوک ناچوں کو یکجا کیا گیا تھا پھر بھی وہ ناچ زیادہ مقبول ہوئے جن میں عوامی

ناچوں کا رنگ گہرا اور کلاسیکی ناچوں کا اسٹائل کم تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ لوک ناچ عوام کی روزمرہ زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں ان پر گھر کے کام کاج، کھیتوں کی محنت غم اور خوشی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ ناچ انسان کی روزمرہ زندگی کا حقیقی عکس پیش کرتے ہیں۔ لوک ناچوں اور گیتوں پر تواریخی انقلابات کا گہرا اثر پڑتا ہے ہندوستان آزادی کے بعد بھی جس اقتصادی بحران سے گزر رہا ہے اس کا اندازہ ہم ان لوک گیتوں اور ناچوں سے لگا سکتے ہیں یہ ناچ مختلف اوقات کے لئے ہوتے ہیں مثلاً کھیت کاٹتے وقت، پوجا کے وقت اور دوسرے مواقع کے لئے۔ یہ عوام کے خیالات خواہشات اور بنیادی خصوصیات کے حسین آئینہ ہوتے ہیں۔

اس پروگرام میں آگرہ نے "رس لیلا" پیش کیا جس میں منی پوری اور عوامی اسٹائل کا امتزاج ملتا تھا اور اسے رابندر سنگیت جیسے سحر کن موسیقی پر ترتیب دیا گیا تھا۔ بڑودہ نے گربا اور رس کے اشتراکی اسٹائل کا رقص پیش کیا بنارس نے چار رس پیش کئے جنھیں مختلف روشنیوں کی دھج نے اور حسین بنا دیا تھا اور انھیں لوک سروں پر ترتیب دیا گیا تھا۔ گوہاٹی کے قبائلی ناچ جس میں منی پوری اور کتھک ناچوں کا اشتراک تھا سب سے زیادہ کامیاب رہا ان کے لباس اور اسٹائل نے ہمیں چند لمحوں کے لئے آسام کے گھنے جنگلوں میں بسنے والوں کی دنیا میں بھٹکا دیا، ان کے لباس پروں سے ترتیب دے کر بنائے گئے تھے۔ ناگپور نے چھتیس گڑھ کے تہواری ناچ پیش کئے۔

اجتماعی ناچوں کی طرح اجتماعی نغموں کا پروگرام بھی عوامی اور کلاسیکی نغموں کا امتزاج رہا ہر پروگرام کے ساتھ قومی ترانے کے تین ٹکڑے بھی پیش کئے گئے۔ یہ آئیٹم اس سال پہلی مرتبہ یوتھ فیسٹیول کے مقابلے کے پروگرام میں شامل کیا گیا تھا۔ اجتماعی نغموں کا آغاز علی گڈھ نے کیا۔ علی گڈھ کا "ملہار" جھولے کا گیت ہے۔ ہمیں اپنی درس گاہ کے اس آئیٹم سے کافی امیدیں وابستہ تھیں مگر ہمارے خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ لکھنؤ کا "رسیا" "اب کی گیہوا لاد بیچ سجنیا توکے لا دیب چندری" بے حد مقبول ہوا دھن کے ساتھ ساتھ موسیقی کی ترتیب

بہت رسیلی تھی ۔ موسیقی کے تال پر کسی لڑکی کا ہوتے ہوئے رقص کرنا بہت مسحور کن تھا۔ کشمیر کا ' سنگدل یار وا،، بھی کافی مقبول ہوا ۔

ریڈیو پلے کی شمولیت دوسرے مقابلے کے پروگراموں میں ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈرامے انسانی زندگیوں پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں ۔ ریڈیو پلے میں اسٹیج کی تمام دقتیں حل ہوجاتی ہیں اور اس طرح زیادہ آسانی سے ہم زندگیوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ ریڈیو پلے کے اس پروگرام میں دہلی کا " پیسہ اور پرچھائیں " لکھنؤ کا " ایک پیسہ ایک پھول" علی گڈھ کا " انسپکٹر جنرل" اور کلکتہ کا " ڈاکٹر فاسٹس ،، قابل ذکر ہیں ۔ کرشن چندر کا لکھا ہوا " ایک پیسہ ایک پھول " اور ڈاکٹر محمد حسن کا لکھا ہوا " پیسہ اور پرچھائیں ،، جو آل انڈیا ریڈیو ڈراموں کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کر چکا ہے ہماری سماجی زندگیوں کے اچھے عکاس تھے روسی فن کار گوگول کے مزاحیہ شاہکار " انسپکٹر جنرل ،، سے موخذ علی گڈھ کا ڈرامہ بھی اچھا تھا مگر ریڈیو کے تکنیکی نکتوں سے کم علمی کی وجہ سے اس میں کام کرنے والے زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے پھر بھی یہ پہلی کوشش کافی کامیاب رہی ۔ ریڈیو ڈراموں میں گجرات ، عثمانیہ اور گوہاٹی کے اچھے ڈراموں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے ۔

یوتھ فیسٹیول میں کلاسیکی رقص کے مظاہرے بھی ہوئے ۔ اصناف لطیف میں یہ صنف سب سے پرانی تصور کی جاتی ہے ۔ مہا بھارت کے بعد اس کے قصے کافی مشہور ہوئے اور پھر رقص کی شکل میں ان قصوں کو بیان کیا جانے لگا اس طرح مذہبی قصوں اور روایتوں کو پیش کرنے کا یہ اسٹائل اپنے ارتقائی دور سے گزر کر آج کتھکالی رقص کے روپ میں ہمارے سامنے ہے ۔ کلاسیکی رقص کو ہندو دھرم نے بہت ابھارا ہے ۔ گوپی کرشن کا رقص جہاں مذہبی اہمیت رکھتا ہے وہیں اس صنعت کے اچھے رقص میں شمار کیا جاتا ہے ۔ آج بھی یہ ناچ کافی مشہور رہیں ۔

مگر یوتھ فیسٹیول کے مظاہرے سے شمبھو جی جو آج کل اس فن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں

بے حد نا امید ہوئے لڑکیوں کا مظاہرہ تو کسی حد تک کامیاب رہا مگر لڑکوں کا رقص انتہائی ناکام ہوا ان کے اسٹائل خالص کلاسیکی ہونے کے بجائے دو رقصوں کا امتزاج بن گئے۔ لڑکیوں میں بنارس کی شانتی پانڈے نے بھارت ناٹیم کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ ان کا اسٹائل خالص کلاسیکی اور بے حد حسین تھا۔ قدموں کی تھرک رفٹ ورک بالکل صحیح تھی۔ اٹکل کی بھنڈنا داس نے اڈیسی رقص پیش کیا اور کراچی دتا سنمنی پوری میں اپنے جوہر دکھائے کتھک اسٹائل کے ناچ میں دہلی کی رانی کافی مقبول ہوئیں۔

خاکے، مصوری، مجسمہ سازی، ورکشیدہ کاری وغیرہ کی نمائش بھی انھیں مقابلے کے پروگراموں کی ایک کڑی تھی۔ اس کا افتتاح ۲۴ر اکتوبر کو بیگم ہمایوں کبیر نے کیا۔ مجسمہ سازی، مصوری اور نقاشی بھی ناچ کی طرح پراچین بھارت کی مشہور کلا ہے مگر سامراجی نظام حکومت میں دوسرے اصناف کی طرح اسے بھی بڑا دھکا پہونچا ہے لیکن اب اس کے تحفظ کا احساس ایک بار پھر ہمارے دلوں میں انگڑائیاں لے رہا ہے اور یہ کلا پھر ایک بار تیزی سے ترقی کے مدراج طے کر رہی ہے۔

علی گڈھ کی طاہرہ رحمان اور اختر جہاں کے خاکے بہت خوبصورت تھے ان کے اندر بڑی چابکدستی سے ابھارے گئے تھے آئل پنٹ سے بنائی گئی تصویروں میں پنجاب کے ایف جی ڈیوڈ کا "سورج کی شعاعوں کا عکس" بہت اچھا تھا۔ اور لکھنؤ کے کمو دنا گرگی " سادھنا " چغتائی آرٹ کی اچھی نقل تھی فوٹو گرافی کے اچھے نمونے بھی دیکھنے میں آئے مجسمہ سازی میں علی گڈھ کی رابعہ زبیری اور اندرا جارس کے پلاسٹر آف پیرس سے بنائے ہوئے مجسمے بے حد حسین تھے ان میں فطری نقوش انتہائی چابکدستی سے ابھارے گئے تھے۔

ان پروگراموں کے علاوہ سمپوزیم، ایلوکیشن اور مضمون نگاری کا مقابلہ بھی ہوا۔ ۳۰ر اکتوبر کی شب کو راجکماری امرت کور نے انعامات تقسیم کئے اور یوتھ فیسٹیول کا چمکتا ہوا سورج ایک بار پھر سال بھر کے لئے غروب ہو گیا۔ مگر یوتھ فیسٹیول کی اس ہفت روزہ زندگی میں

چند چیزوں کا احساس شدت سے ہوا۔

آزاد ہندوستان میں ہمیں اپنی تہذیب اور تمدن کو فروغ دینا ہے اس تہذیب کو سنوارنا ہے جس پر سامراجی نظام نے اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے، اس تہذیب کو سنوارنا ہے جس پر آج مشرقیت کا غازہ چڑھا ہوا ہے ہمیں اپنی دیرینہ تہذیب پر چڑھے ہوئے اس غازہ کو دھو کر اسے نکھارنا ہے ہمیں ہندوستان کے عوام کو ان کی دیرینہ تہذیب کی یاد دلانی ہے ان کے اس ذہن کو نکھارنا ہے جو سامراجی غلاظتوں سے پراگندہ ہو گئے ہیں اس کے لئے ہمیں ان کے اندر جمالیاتی شعور پیدا کرنا ہوگا اور یہ سب کچھ اپنے ملک کی نشاۃ ثانیہ کو فروغ دینے ہی سے ہو سکے گا۔ یہ فرض نوجوانوں پر آتا ہے، طلباء پر آتا ہے اور درس گاہوں پر آتا ہے۔

اس بات کا بھی احساس ہوا کہ ہماری درس گاہ اس میدان میں کتنی پیچھے تھی۔ کارواں دور جا چکے ہیں اور ہم آج تک گرد راہ تک رہے ہیں ہمیں بھی قدم بڑھانا ہے تاکہ انھیں جلد سے جلد جا لیں۔ اس کیلئے ہمیں سنگیت کلا کا کوئی انسٹیٹیوشن کھولنا ہوگا، یہ کمیاں بیحد کھٹکتی ہیں۔ انھیں پورا ہونا ہے۔ کہتے ہوئے مجھے آئنسٹائن کا قول یاد آرہا ہے انسان اپنی خشک اور پھیکی زندگی میں کچھ نہیں کر سکتا۔ موسیقی زندگی کو شاداب کر کے نت نئے رنگوں سے نکھار دیتی ہے۔

علی گڈھ میں جہاں اور تمام چیزیں پنپ رہی ہیں وہاں ان اصناف کا فروغ بھی ضروری ہے اور اسی طرح ہم دوسری درس گاہوں کے دوش بدوش چل سکتے ہیں۔

اس طرح یوتھ فیسٹیول کے نقوش دل پر گہرے ہو گئے۔ وہاں کی چھوٹی سی زندگی کے میلے ختم ہو گئے یوتھ فیسٹیول کی فروزاں راتیں جلد ہی بیت گئیں پھر وہ رات بھی آگئی جس کی صبح اپنے دامن میں ہمارے لئے الوداعی لمحوں کا درد لے کے آئی تھی۔ ۳۱ راکتوبر کی صبح بھی بڑی اداس تھی، اس عظیم میلے کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور ہماری آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم اپنے دلوں میں بچھڑنے والوں سے ایک بار پھر ملنے کا ارمان لئے لوٹ رہے تھے ہم سب سے رخصت ہو رہے تھے۔

ہنگامے تھم گئے۔ میلے ختم ہو گئے مگر اس کی خوشگوار یادیں اب بھی ہمارے دل کے ننھے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں۔

ذاکر صاحب اور علی گڈھ

شاہ عبدالقیوم

"ذاکر صاحب کو جو بُرا کہتا ہے تو میں بھونچکارہ جاتا ہوں، اس کے فوراً بعد جو بات ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ یا تو یہ شخص شیطان محض ہے یا پھر ناواقف محض ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ذاکر صاحب سے واقف نہ ہوں، اس کے بعد ذاکر صاحب کے بارے میں غیر شریفانہ خیالات رکھنا یا پھیلانا شیطنت نہیں تو اور کیا ہے۔

رشید احمد صاحب صدیقی کی تحریر آج سے کوئی آٹھ برس پہلے جامعہ کے رسالے 'جوہر' میں نظر سے گذری تھی، اس وقت ذاکر صاحب جامعہ چھوڑ کر تازہ تازہ علی گڈھ پہنچے تھے، جامعہ کے ہم طالب علم علیگڈھ اور جامعہ کے بنیادی اختلافات کی وجہ سے علی گڈھ کو تو خیر شروع ہی سے بُرا خیال کرتے تھے پر ذاکر صاحب کو بھی جامعہ کو اس طرح لاوارث چھوڑ جانے پر بُرا سمجھنے لگے تھے، اور اسی غم وغصہ میں جس قدر برا ذاکر صاحب کو کہا کرتے تھے، اس سے زیادہ برا اُسے سمجھتے تھے جو ذاکر صاحب کو اچھا کہا کرتا تھا، چنانچہ اسی بنا پر بچارے رشید صاحب کو بھی جلی کٹی سنائی جانے لگیں ——— ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ذاکر صاحب سے بے انتہا لگاؤ کا ردِّ عمل ہو۔

جب شعور نے کچھ، کچھ آنکھ کھولی اور ذاکر صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع ملا، رشید صاحب کی بات پر غور کرتا ہوں کہ میں جو ذاکر صاحب کو خواہ کسی بھی شعوری یا غیر شعوری وجہ سے "بُرا" خیال کرتا تھا۔ آیا شیطان محض تھا یا ناواقف محض تو دل دوسری ہی بات کے حق میں فیصلہ کرتا ہے، اس لیے کہ جس زمانے میں ذاکر صاحب کو بُرا خیال کرتا تھا اس وقت تک عقل نہیں آئی تھی، اور چھا بھی جانتا تھا

تو اس لیے نہیں کہ ذاکر صاحب نے جامعہ کے بنانے اور قائم رکھنے کے لیے بڑی، بڑی قربانیاں دی ہیں۔ یا تعلیم کے اعلیٰ اور تعمیری کام کے لیے بڑے بڑے عہدوں اور قوم کی رہنمائی کے موقعوں کو جن کے لیے، ان کے ہم عصر ہزار جتن کرتے تھے اور جوان کو بے مانگے ملتے تھے اور بے خواہش ملتے ہیں مگر انھوں نے بے تامل چھوڑ دیے اور بے تامل چھوڑ دیتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ وہ بہت پیار کرتے تھے، کبھی کبھی ترنگ میں آکر اپنی اچکن اور ٹوپی سمیٹ ہم بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتے تھے، اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ رنگ برنگی مٹھائیاں کھلایا کرتے تھے، تعلیمی مرکز نمبر ۱ قرول باغ میں اکثر چپکے سے آیا کرتے تھے، لیکن لڑکوں کو کسی نہ کسی طرح فوراً پتہ لگ جاتا کہ ذاکر صاحب آئے ہیں، بس، پھر کسے ہوش ہے! سب ہی لڑکے خصوصاً ہم پہلی دوسری جماعت کے لڑکے تو سب سے پہلے بلا اجازت، اپنے مشفق استاد جناب محمود الحسن صاحب کی "شریرو ٹھہرو" کی صدا پر کان دیئے بغیر درجوں سے نکل بھاگتے اور جاکر چپٹ ہی تو جاتے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو سالہا سال کی مسلسل جدوجہد اور قربانیوں کے بعد ہندوستان اور پاکستان دو آزاد مطلق العنان ریاستوں کی شکل میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا۔ آزادی ملنے اور طوقِ غلامی اتار پھینکنے کی اس خوشی میں بہت سے پاگل ہو گئے اور ان کے اس پاگل پن کی وجہ سے امن وسکون اور آپس کے میل ملاپ کا شیرازہ بکھر گیا۔ جامعہ بھی جو ایک آزاد قومی ادارہ تھا، جس نے آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا تھا، اور حصول آزادی جس کا اولین نصب العین تھا، اس پاگل پن کی زد سے نہ بچ سکی شہر کے جتنے مرکز تھے وہ سب اسی آگ کی نذر ہو گئے تھے جتنے کام کرنے والے تھے وہ سب خوف وہراس کی وجہ سے پاکستان یا کہیں اور بھاگنے پر کمربستہ تھے، ہر آن جان ومال کا خطرہ تھا، دہشت سے دل بیٹھا جاتا تھا، لیکن یہ مردِ مجاہد، اپنی جگہ ڈٹا ہوا ہے، کسی سے کچھ نہیں کہتا، صرف یہ کہ "آپ جانا چاہتے ہیں ضرور جائیے! میں تو یہیں رہوں گا، موت یونہی مقدر ہے تو یونہی سہی"۔——

ایثار ووفا میں ڈوبے ہوئے ان چند جملوں میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ جامعہ جیسی متاع گراں مایہ کو چھوڑ کر جانے والے اپنے ارادوں سے باز رہے ؏ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اور سچ تو یہ ہے کہ یہ صرف ذاکر صاحب ہی کی بلند اور برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے نازک پودے کو جسے انھوں نے حوادثِ زمانہ سے بچا، بچا کر صدہا حوصلہ شکن دشواریوں کے باوجود، ۲۲ برس تک اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا، اپنے حسنِ تدبیر اور انتھک کوششوں سے پروان چڑھایا تھا، جس کو قائم رکھنے، ترقی دینے اور قوم کی ذہنی بیداری کا مرکز بنانے کے لیے جانفشانی کی تھی، بے بسی سے دوچار ہوئے تھے، قوم کی گالیاں سُنیں، رسوائی اٹھائی، حکومت کا عتاب سہا، نہ صرف بکھرنے سے بچا لیا بلکہ ابھرتے دلوں میں نئے عزائم اور نئے ولولے پیدا کر دیئے اور یکجہتی اور ایثار کی ایسی جوت جگا دی جس سے جامعہ کی بنائیں مضبوط اور مستحکم تر ہو گئیں

لیکن کچھ ہی عرصہ بعد جب یہ معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب جامعہ چھوڑ کر علی گڑھ جا رہے ہیں تو جامعہ کا ہر شخص متعجب اور افسردہ نظر آنے لگا۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کو جو بتقاضائے عمر، عقل و تجربہ میں ہم سے زیادہ تھے، اس میں بھی کوئی قومی مصلحت نظر آئی ہو اور شاید اسی لیے صبر کر بیٹھے ہوں، لیکن ہم لڑکوں کو غم کم ہوتا اور غصہ زیادہ آتا تھا، اور جب ذاکر صاحب واقعی علیگڑھ آ گئے تو ہم لوگوں نے ان سے کٹی سی کر دی، اسکول کے ساتھیوں میں اکثر ذاکر صاحب کی باتیں ہوتیں تو ہر شخص کچھ روٹھا سا نظر آتا، ہر ایک کی زبان پر ایک ہی شکوہ ہوتا اور وہ یہ کہ اس نازک دور میں ذاکر صاحب کو جامعہ چھوڑ کر علی گڑھ نہ جانا چاہیے تھا، دو ایک دوست جو ذرا زیادہ جذباتی تھے، کبھی کبھی، حدِ اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتے۔

اب ادھر کی سنیے، ادھر تقسیم ہند کے بعد سے علیگڑھ پر ایک عجیب کس مپرسی کا عالم طاری تھا، ہر چہار جانب سے مخالفت اور دشمنی کے بادل اُمڈے آ رہے تھے۔ لوگ علیگڑھ کو دوسرا پاکستان خیال کیا، یقین کرتے تھے۔ پاکستان بنانے میں جو بہت سے طلبا، اور اساتذہ پیش، پیش رہے تھے وہی بھاگنے میں بھی پیش، پیش رہے، ایک بحرانی کیفیت تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اونٹ کس کل بیٹھے گا، اور یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد کو سب سے بڑی فکر یہ دامن گیر تھی کہ ادارہ حکومت کے قبضہ میں نہ چلا جائے۔ اور دل جلوں کے ہاتھ پڑ کر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے ختم نہ ہو جائے

انہی وہ تمام علمی، ادبی اور معاشرتی خصوصیات کو جن کے لیے علیگڈھ مشہور تھا اور بجا ناز اں تھا کھو نہ بیٹھے سید احمد خاں نے جن نظریات کے پیش نظر اس ادارہ کی طرح ڈالی تھی کہیں بالکل ہی مٹ کر نہ رہ جائیں مسلمان جو پہلے ہی لوگوں کی تنگ نظری اور حالات کی چیرہ دستیوں کا شکار رہیں، اور جن کی اب تمام تر امیدیں اسی ادارہ سے وابستہ ہیں، کہیں اس آسرے سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں ——

لہٰذا اب کسی ایسے آدمی کی تلاش پڑی جس کو بے خطر اس ادارہ کی زمام کار سونپ دی جائے اور جو نئے زمانے کے مزاج اور مقتضیات کو پہچان سکے اور حوصلہ دانشمندی کے ساتھ اپنے اصلاحی اور تعمیری پروگرام کو لے کر آگے بڑھ سکے۔ ایک ایسی سنجیدہ اور پرخلوص شخصیت جو اپنی معاملہ فہمی سے علیگڈھ کی اندرونی کشاکش اور کش مکش کی کدورت دلوں سے دھو دے، یگانگت اور یک جہتی پیدا کرسکے ان لوگوں میں جو ماضی سے محض جذباتی وابستگی رکھتے ہیں اور حال کی دشواریوں سے افسردہ اور مایوس ہو جاتے ہیں، اپنی شخصیت کے اثر سے، اپنے اعلیٰ کردار اور بے کراں ایثار سے فرض کا احساس اور کام کی سچی لگن پیدا کرسکے، اور اس وقتی پژمردگی و انتشار کو ختم کرکے امید، حوصلہ اور دلجمعی کے سامان فراہم کرسکے۔

ظاہر ہے یہ حالات جامعہ ملیہ کی ابتدائی زندگی سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے، اور علیگڈھ کیلیے ایسے حوصلہ شکن حالات میں ذاکر صاحب سے زیادہ موزوں شخصیت کس کی ہو سکتی تھی۔ جامعہ کی زندگی ایک سچی کسوٹی تھی جس پر ذاکر صاحب ہمیشہ ہر معاملے میں کھرے اترے تھے، ان کے تدبیر، معاملہ فہمی خلوص اور قطعاً بے لوث ہونے کا سب ہی اعتراف کرتے تھے، ان کی چھا جانے والی شخصیت اور گرویدہ کر لینے والی سنجیدہ، پُرمغز اور سلجھی ہوئی گفتگو میں وہ تمام صفات موجود تھیں جن کی علیگڈھ کو ان حالات میں اشد ضرورت تھی، اور پھر علیگڈھ سے ذاکر صاحب کا تعلق محض حیثیت طالب علم ہی نہیں رہا وہ جس طرح اپنے زمانۂ طالب علمی میں ایک بااثر او مخلص طالب علم تھے جن کی تقریباً ہر لڑکا اور ہر استاد عزت کیا کرتا تھا اور جن کی ہر بات جو ہمیشہ معقول اور جچی تلی ہوتی مان لی جاتی

بلکہ علیگڑھ سے نکل کر جہاں بھی رہے، خواہ برلن میں خواہ جامعہ ملیہ میں، علیگڑھ سے خصوصی تعلق ہمیشہ رہا۔ جب جرمنی سے واپس تشریف لائے تو فوراً ہی مسلم یونیورسٹی کورٹ، اگزیکیوٹو کونسل اکیڈمک کونسل اور شعبۂ اقتصادیات کے ممبر منتخب کر لیے گئے، ان تمام اداروں میں جب بھی کوئی میٹنگ ہوتی تو ذاکر صاحب خاص طور سے بلائے جاتے یا جب بھی کسی مسئلے کے متعلق کوئی کمیٹی بنتی ذاکر صاحب کا نام ممبری کے لیے سب سے پہلے پیش کیا جاتا اور بے چون وچرا بڑی خوش دلی اور اعتماد کے ساتھ قبول کر لیا جاتا۔ یونیورسٹی میں جب بھی کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا، طلباء یا اساتذہ یا طلباء اور اساتذہ میں کوئی نااتفاقی پیدا ہو جاتی اور معاملہ ارباب حل وعقد کے ہاتھوں سے نکلنے لگتا تو فریقین میں مفاہمت اور فضا کی خوش گواری کا تمام بار ذاکر صاحب ہی کے دوش پر ڈال دیا جاتا، جسے ذاکر صاحب اپنی شخصیت کے جادو اور حسن تدبیر سے بطریق احسن انجام دے کر معاملہ کو رفع دفع کر دیتے۔ ان سب باتوں کے علاوہ علیگڑھ والوں پر یہ امر بھی بخوبی واضح تھا کہ ذاکر صاحب نے اپنے فکر وعمل اور بے غرض ایثار و قربانی سے جامعہ میں ایک خوشگوار ماحول پیدا کر دیا ہے، جہاں آزادی فکر ونظر ہر ایک کو حاصل ہے، جہاں شاگرد استاد سے اور اچھا استاد شاگرد سے وہ منازل ذہنی اور روحانی طے کرا دیتا ہے جو اس کے بغیر ناقابل تصور ہوتے اور جہاں اساتذہ قومی زندگی کی کلیوں کو اپنے علم، محبت اور شیفتگی سے وہ حیات بخش شبنم دیتے ہیں جن سے وہ شگفتہ ہو اٹھتی ہیں، اور آج زمانے کی تبدیلی کے ساتھ سرسید کا علیگڑھ بھی اسی ماحول کو اختیار کرنا چاہتا تھا، رشید صاحب سے پوچھئے تو وہ بھی کہیں گے کہ جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ کیا ہے اور کیا کر رہا ہے، اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں، سارا قصہ اس ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا، ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا وہ خود ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا، اپنے ایثار و قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب ہی کی طرف جھکتا ہے۔ محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برا ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے

فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقہ میں ان جیسا کوئی نہ تھا، کلرک یہ دیکھتا کہ ڈاکٹر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں، چپراسی یہ پاتا کہ ڈاکٹر اس سے زیادہ دوڑ دھوپ کرتے ہیں، بچہ یہ دیکھتا کہ ڈاکٹر صاحب سے زیادہ بچہ کوئی نہیں۔ جوان یہ محسوس کرتا کہ ڈاکٹر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں اور بوڑھا یہ جانتا کہ جب بڑھاپا ڈاکٹر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو یہ بھی سوچنا تھا کہ وہ شخصیت ایسی ہو جس نے علی گڑھ کی ارتقائی زندگی کے تینوں اہم دور دیکھے ہوں، ان کی خوبیوں اور خرابیوں سے بخوبی واقف ہو یعنی پہلا وہ دور جب نواب وقار الملک اور ان کے رفقا کالج کو باقاعدہ یونیورسٹی بنانے کی جد و جہد کر رہے تھے، انگریز جو اس ادارہ کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے تھے اور بات، بات پر ادارہ کو بند کرنے کی دھمکی دیا کرتے تھے، مختلف طور سے نواب صاحب کے خیال کی مخالفت کرتے رہے تھے جس کا لازمی نتیجہ اسٹرائک اور طلبا اور یورپین اسٹاف کے درمیان کش مکش کی صورت میں نکلا مسلمانوں کا عام سیاسی شعور بھی اب کچھ بیدار ہو چلا تھا۔ وہ لوگ جو سرسید کی تحریک کے خلاف تھے اور ان کی تعلیمی اسکیم کو قوم کے حق میں مضر خیال کرتے تھے اب سید مرحوم کے خلوص نیت اور قوم کے غمخوار ہونے کا یقین کرنے لگے تھے۔ اور یونیورسٹی کے قیام کی جد و جہد میں شریک ہو گئے تھے۔

دوسرا دور وہ ہے جس میں شبلیؒ کے ساتھ مولانا شوکت علی، اور مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی کے افق پر آفتاب بن کر چمکے، پان اسلامزم کے جذبۂ جاں گداز کے تحت مشرق وسطی کے ممالک اسلامیہ میں انگریز کی جارحانہ پالیسی اور جنگی اقدام نے انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ یہ زمانہ اس اعتبار سے سب سے اہم خیال کیا جا سکتا ہے کہ علیگڑھ سب سے پہلی بار انگریز سرکار کے خلاف اسی زمانے میں صف آرا ہوا مولانا مرحوم کی شعلہ نوائی اور گرمی گفتار نے لوگوں کے ذہن بدلنا شروع کر دیئے تھے، اور اب تمام لوگ سید کے خواب کو شرمندہ

تعمیر کرنے کے لیے کوشاں تھے، یعنی ایک آزاد قومی ادارے کی تعمیر، جس میں مسلمان اپنی دیرینہ مذہبی اور تمدنی روایات کو برقرار رکھ سکیں جو حریت قومی اور حب الوطنی کے جذبہ صادق کو اپنے اخلاق اور کردار میں سمو کر آزادی وطن کی تحریک میں اپنا حق ادا کر سکے۔ اسی زمانہ میں مولانا کی کوششوں سے گاندھی جی علیگڈھ تشریف لائے، ان کی آمد ذہنوں کے تغیر اور انقلاب کا سبب بنی، اور علیگڈھ قومی تحریک کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

اس کے بعد تیسرا دور آتا ہے جو کم از کم ہم جامعہ والوں کی نظر میں قابل نفرین ہے اور جو دراصل دانش افرنگ کی کامیابی کا نتیجہ تھا، شاطر نے چال ہی "تخت یا تختہ والی چلی تھی چنانچہ مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ نے کانگریس کے مقابلے میں اپنی ایک علیحدہ سیاسی جماعت تشکیل کرلی تھی، جس سے برس ہا برس کے ہندو مسلم اتحاد و اتفاق اور دوستی میں کھنڈت پڑ گئی۔ اس اختلاف سے ایک بار تو تحریک آزادی کی نبض ڈوبنے سی لگی، ہندوستان جو علیگڈھ سے بہت سی امیدیں لگائے بیٹھا تھا مزاج کی اس تبدیلی کے از حد دکھ پہنچا متعصب لوگوں نے علیگڈھ کے اس رویہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور اس کے خلاف آگ اگلنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، مسلم لیگ کے عروج کے ساتھ قوم پرستوں کی نفرت و حقارت بھی بڑھنے لگی، اور شاید علی گڑھ بھی خم ٹھونک کر پاکستان کی تشکیل کے لیے میدان میں کود پڑا تھا۔

ظاہر ہے ایسی شخصیت جس نے ان تینوں دوروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے نمایاں حصہ لیا تھا، کبھی موافق کی حیثیت سے کبھی مخالف کی حیثیت سے اور جو علیگڈھ کے صحیح مقصد و مقام سے بخوبی واقف ہو، اس کی خوبیوں کو جلا دینے اور اس کی خرابیوں کو مٹانے کی صلاحیت اور مخالفوں کو رام کرنے کے گر سے آراستہ پیراستہ ہو، ذاکر صاحب کے علاوہ کس میں مل سکتی تھی۔ مسلمانوں کی بنیادی ذہنی اصلاح اور زندگی کے مختلف شعبوں کے سدھار کی تحریک جو موجودہ حالات میں انھیں اجتماعی ہلاکت سے بچانے کے لیے ناگزیر ہے۔ اس بدلی ہوئی فضا میں سربراہی کر سکے۔ سرسید کے خواب کی ادھوری تعبیر کو پورا کرنے کے لیے بھی لگن، پکے ارادے اور بڑی ہمت کے ساتھ

تحریک کو زندہ کر سکے۔ مصلح اور مجدد ہونے کا دعویٰ نہ کرے بلکہ طالب حق اور خواہاں تجدید و اصلاح ہونے کا عاجزانہ اعتراف کرے، ایک ایسی شخصیت جو اپنی گرمی طبع سے عداوت کی آگ نہ بھڑکائے بلکہ اپنے سوزِ دل سے محبت کی لو لگا دے، ذاکر صاحب کے سوا کہاں مل سکتی تھی۔ چنانچہ اربابِ حل و عقد نے بے خطر باتفاق رائے ادارہ کی باگ دوڑ ذاکر صاحب کو سونپ دی ؏

زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم وہ مردِ دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ مزاج جس کا قلندرانہ

ذاکر صاحب کے علیگڈھ آنے کے بعد سے اب تک کے زمانہ پر ایک نظر ڈالیے تو کل کے علیگڈھ اور آج کے علیگڈھ میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے کتنی خوش بخت تھیں وہ گھڑیاں جن میں علیگڈھ کو ذاکر صاحب جیسی نمونہ شخصیت کی قیادت میسر آئی جس کے فیضان سے با عزت اور حوصلہ مندانہ زندگی کی نئی راہیں روشن ہو گئیں، جس کے حسن فکر و عمل نے حال کو ماضی سے زیادہ شاندار بنا دیا۔

ذاکر صاحب جب علیگڈھ آئے تو یونہی خالی الذہن نہیں چلے آئے، انھیں اس بات کا پورا، پورا احساس تھا کہ میں ایک بہت بڑی ذمہ داری اٹھانے جا رہا ہوں، ایسی ذمہ داری جس کا جواب وہ صرف قوم ہی کے سامنے نہیں بلکہ آخرت میں معبود حقیقی کے سامنے بھی ہونا ہے ایک ایسی ذمہ داری جس سے ساری قوم کی فلاح و بہبود اور عزت و وقار وابستہ ہے ان کو یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ میں ایسے لوگوں میں کام کرنے جا رہا ہوں جو بات سمجھ تو جلدی جاتے ہیں پر مانتے ذرا دیر میں ہیں، اور اگر طمطراق سے کام لیا تو بگڑ بھی بہت جلدی جاتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی اچھی طرح واضح تھی کہ میں ایک ایسے ادارہ کی باگ ڈور سنبھالنے جا رہا ہوں جس کے مخالف بہت زیادہ ہیں، سنوارنے اور نیک کام کرنے والے کم اور مجبور! اور شاید یونیورسٹی سے

بہت عرصہ متعلق رہنے کی وجہ سے ان کو یہ بھی خوب معلوم تھا کہ علی گڈھ کا ذہن پرانا جاگیر دارانہ اور روایت پرست ہے، اس سے مختلف بات خواہ وہ اس کے ہی بھلے کی کیوں نہ ہو ذرا مشکل سے جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب علیگڈھ میں بحیثیت سربراہ جو ذہنی واصلاحی وتعمیری پروگرام اپنے ساتھ لائے اور جس خلوص نیت سے انھوں نے اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ اس کا اظہار انہی کی زبانی سنئے تو شاید زیادہ واضح ہو سکے اور شاید جامعہ والوں کے بھی آنسو پونچھ جائیں۔

"مجھے دکھائی دیتا ہے کہ ہندوستانی قومی زندگی کی تعمیر میں اس ادارہ کا بہت اہم مقام ہے مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو میں جامعہ ملیہ کے کام کو چھوڑ کر جس کے ساتھ میری ساری ذہنی اور روحانی نشو و نما وابستہ ہے، علیگڈھ نہ آتا۔ میں آنے پر اور یہاں ٹھہرنے پر صرف اس لیے اپنے آپ کو راضی کر سکا کہ مجھے صاف محسوس ہوا کہ یہاں اہم قومی کام کا ایک نادر موقعہ ہے۔ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست" وہ کام ہندوستانی تدبر اور ہندستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے۔ یعنی ایک سیکولر، جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے اور کتنا دل کش کام یہ مختلف تمدنی و تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین و جمیل کل کی تشکیل میں مدد دے۔

ہمارے ملک کے سامنے ایک عظیم الشان کام ہے۔ ایک اچھی قومی زندگی کی تعمیر کا کام اس میں ضرورت ہے کہ قوت کا ایک، ایک کرشمہ خوشی خوشی اس کام میں لگا دیا جائے علیگڈھ ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں کی خدمت کے لیے جو پیش کش دے گا، اس سے متعین ہوگا ہندوستانی قومی زندگی میں مسلمان کا مقام۔ ہندستان علیگڈھ کے ساتھ جو سلوک کرے گا اسی پر بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔"

آئیے اب ذرا اسی تجربہ کی روشنی میں یہ بھی دیکھ لیں کہ ذاکر صاحب آیا گفتار ہی کے غازی ہیں یا کردار کے بھی، اور اگر واقعی دونوں کے غازی (جیسا کہ ہیں) تو پھر کیوں نا یہ بھی دیکھ لیں کہ ذاکر صاحب اپنے اعلیٰ خیالات، احساسات اور جذبات کو کس حد تک عملی شکل دے سکے، اپنی با عمل اور فکر انگیز شخصیت سے اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں کس حد تک اپنا ہی ایسا جوش وخروش اور صداقت و راستبازی پیدا کر سکے۔

ذاکر صاحب جہاں بھی رہتے ہیں یہی کوشش کرتے ہیں کہ اس جگہ زندگی کے کچھ آثار پیدا ہو جائیں، ان کا خیال ہے کہ ماحول کی خوشگواری، دل کشی اور فطری خوش رنگی نہ صرف طبیعت کے خوش رکھنے کے لیے لازمی ہیں بلکہ انسان کے اخلاق و افکار کے سنوارنے میں بھی مدد ہوتی ہیں۔ اور آج ان کا یہ خیال عمل کے سانچے میں ڈھل کر آپ ہی نظارہ ہے۔ وہ علیگڑھ جہاں کبھی دھول اڑا کرتی تھی اور دور، دور تک سبزہ و سایہ کا نشان نہیں ملتا تھا، آندھی اور لو کی سائیں سائیں سے دماغ اڑتا تھا (اور شاید اسی لیے تمام ذہن بجھے بجھے سے رہتے تھے،) آج جدھر نگاہ اٹھتی ہے، ہر طرف بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔ سبزہ گل سے عادتوں کا حسن بڑھ گیا ہے، گلاب کے خوشنما تختوں اور رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں کو دیکھ کر تھکے ہوئے دماغوں کو فرحت میسر آتی ہے ٹہنیوں میں جھولتے ہوئے غنچے جب مسکراتے ہیں تو ذہن کی کلیاں چٹکنے لگتی ہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ قدرت کی اس رنگینی اور پھول پتیوں میں بھری ہوئی حسن کاری کو دیکھ کر انسان کے دل دماغ کو سکون نصیب ہوتا ہے جو براہ راست اخلاق و اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے اور فی الحقیقت کسی بھی سماج کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا سدھارنے سے پہلے اس میں رہنے، بسنے والوں کے اخلاق و اطوار کی بہتری کی فکر کرنا چاہیئے۔ باہر کی فضا میں ترتیب اور دل کشی دیکھ کر انسان اپنے کام میں بھی سلیقہ اور نظم پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس طرح ماحول کی خوش رنگی اور نفاست سے نہ صرف صحت جسم اور صحت دماغ دونوں کی سطح اونچی ہوتی ہے بلکہ ذمہ داری کا احساس

بھی بیدار ہونے لگتا ہے۔

ذاکر صاحب نے علیگڈھ آکر سب سے زیادہ توجہ طلباء کے اخلاق کو سنوارنے اور اساتذہ کے مزاج کو بدلنے کی طرف کی ہے۔ طلباء میں تفریق مٹانے اور اساتذہ کی ان سے بے تعلقی ختم کرنے اور اپنے طلباء سے ایک بہترین دوست، مخلص ساتھی کا سا برتاؤ اور مشفق بزرگ کا سا پیار کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اور اسی طرح طلباء کو جو اکثر اپنے اساتذہ سے نالاں اور ناراض رہا کرتے تھے، ان کی عزت اور احترام کرنا سکھایا ہے۔ جامعہ کی طرح یہاں بھی ذاکر صاحب نے اساتذہ اور طلباء کو دو ہی باتیں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے یعنی اچھے استاد اور اچھے شاگرد آپس کے میل ملاپ اور مخلصانہ کوششوں سے ایک دوسرے کے ذہن اور روح کو بلند سے بلند تر منازل تک پہنچا سکتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ جب زندگی کے ساز کو کسی دوسری زندگی کا مضراب نہیں چھیڑتا اس کے نغمے خاموش ہی رہتے ہیں اچھے استاد وہ ہیں جو قوم کے نوجوانوں کو قوم کی امانت خیال کرتے ہیں، اپنے علم اور خلوص و محبت کے برتاؤ سے اچھے شہری اور کھرے انسان بنا کر قوم کو وہ متاع گراں مایہ دیتے ہیں جن کا بدل کوئی چیز مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں اقامتی زندگی کے مختلف شعبوں، اداروں اور انجمنوں سے بہت سی پرانی رسوم و روایات کو یکسر ختم کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے جن سے طلباء میں تفرقہ اور تلخی پیدا ہوتی تھی اور جو اخلاق کے سنوارنے میں مانع رہتی تھیں۔

دوسری بات جس کا ذکر ذاکر صاحب نے طلباء کے سامنے بار، بار کیا ہے وہ یہ کہ طالب علم قوموں کا مستقبل ہوتے ہیں، ملک کی امید ہوتے ہیں، اُن کی آج کی زندگی کل کی زندگی کا پتہ دیتی ہے جس قوم کے نوجوان اچھے، سچے اور با اخلاق ہوتے ہیں، جو اپنے فرائض سے آگاہ اور اپنی ذمہ داریوں سے باخبر رہتے ہیں، اور اپنی تمام صلاحیتوں کو ملک کی تعمیر میں خوشی خوشی

لگا دیتے ہیں، وہ قوم بہت خوش حال اور متمدن ہو جاتی ہے اور بہت دیر تک متمدن رہتی ہے وہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی داخل ہوتے ہیں، جس عہدہ، اعزاز اور منصب پر مامور کیے جاتے ہیں، اچھے، سچے نیک اور مخلص رہتے ہیں، اور آپس کے نفاق مٹا کر میل ملاپ اور اتفاق و اتحاد کے رشتوں کو مستحکم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اسی میں امن و ترقی ممکن ہے کسی قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے نوجوان خدمت کے جذبہ کو بھلا کر افسری کا حرص کریں۔ ہندوستان کو آج کلکٹروں اور ڈپٹی کلکٹروں کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی بے غرض خدمت اور سچی لگن سے کام کرنے والوں کی ہے، ملک آپ کا ہے، اس کی تعمیر و ترقی کے بھی آپ ہی ذمہ دار ہیں، چاہے بنائیے چاہے بگاڑیئے!!

ذاکر صاحب کے علیگڑھ آنے سے پہلے طلباء کو تحریر و تقریر کی آزادی کم تھی، پابندیاں اور سختیاں زیادہ تھیں، جن کا ردعمل کبھی کبھی کافی خطرناک شکل اختیار کر جاتا تھا۔ ذاکر صاحب کے آنے کے بعد طلباء کو ہر قسم کی سیاسی، مذہبی، اور ادبی خیالات، عقائد اور رجحانات کے اپنانے اور پھیلانے کی پوری، پوری آزادی میسر آسکی، غیر ضروری نگرانی، جرمانوں اور سزاؤں سے چھٹکارہ مل سکا، اور شاید یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ جب سے اب تک کوئی ایسا ناخوشگوار حادثہ پیش نہیں آیا۔ انسانی فطرت کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ جس کام سے اسے غلط طریقہ پر باز رکھنے کی کوشش کی جائے گی وہ کام، خواہ نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو، ہو کر رہتا ہے۔

آج کے استاد طلباء سے دور نہیں بھاگتے، بلکہ ان میں گھل مل کر ان کی مشکلات کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی فکر کرتے ہیں، ان کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں، ان کے تفریحی مشاغل میں ساتھی بن جاتے ہیں، وہ استاد اور شاگرد جن کا تعلق کل تک محض کلاس روم تک رہتا تھا، آج ایک دوسرے کے اس قدر قریب آگئے ہیں اور اس چھوٹی سی دنیا کے مختلف شعبوں میں

ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوگئے ہیں کہ سب ایک خاندان سا معلوم ہوتا ہے، اور دراصل یہی وہ بے غرض تعلق ہے جو اداروں کے استحکام اور قوموں کی ترقی اور خوش حالی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

کیا سب ذاکر صاحب کے حسن تدبیر، حسن عمل اور بے غرض کوششوں کا نتیجہ نہیں! اور کیا یہ ذاکر صاحب ہی کی بلند شخصیت اور وسعت قلب و نظر کا نتیجہ نہیں کہ اس یونیورسٹی کو آج ایک ایسا اہم قومی اور بین الاقوامی جمہوری ادارہ کہلانے کا فخر حاصل ہے، جہاں نہ صرف ہندستان کے کونے کونے سے مختلف رنگ و نسل کا مختلف عقائد و مذاہب اور مختلف وضع قطع کے سینکڑوں لڑکے، لڑکیاں اس ادارہ میں تعلیم باعث عزت سمجھتے ہیں، بلکہ دوسرے ممالک سے بھی ہر طرح کے سیاہ و سفید طلبا رکھنچے چلے آتے ہیں اور یہاں کی بے تکلف زندگی میں تعلیم و تفریح کے مختلف شعبوں اور میدانوں میں، رہنے سہنے اور کھانے پینے کی مختلف جگہوں پر ایک دوسرے کے ساتھ باہم پیار و محبت سے بلا کسی تمیز و تفریق کے اس طرح گھل مل کر رہتے ہیں گویا سب ایک ہی ہیں ——— کیا یہ تعلیم قوموں کی زندگی کے دھارے کو بدلنے اور ایک اچھے خوش حال سماج کی تشکیل کا پیش خیمہ نہیں! اور کیا ذاکر صاحب کی امتیازی شخصیت قوم کے ہم نوجوانوں کے لیے فکر و نظر کی وسعت، ایثار و قربانی کے جذبے، بے غرض خدمتِ خلق کی لگن اور حبّ الوطنی کا درس نہیں!!!

آپ ہی بتائیے کیا ذاکر صاحب نے اپنے حسن تدبیر و عمل سے، بے لوث خدمات اور بیکراں ایثار سے علیگڈھ کے حال کو ماضی سے زیادہ مستحکم اور روشن نہیں بنا دیا ——— اس علیگڈھ کو جو بجائے ایک مہذب اور متمدن قوم کے ڈپٹی کلکٹر اور کلرک پیدا کر رہا تھا۔ آج نئے ماحول کے نئے تقاضوں کے مطابق اچھے شہری اور بے غرض خادم پیدا کرکے ملک کو خوشحال بنانے اور تہذیب و تمدن کے سنوارنے میں حکومت کا ہاتھ نہیں بٹا رہا ——— آج علیگڈھ کی زمین زرخیز ہے کہ ملک و قوم کو اچھے مفکر، اچھے اور بے باک مقرر اور بے لاگ مبصر، بہترین کھلاڑی اور ذہین

ادیب وشاعر دے سکے جو اپنی تحریر و تقریر سے اپنے شعر و نغمہ سے نہ صرف ہندوستانی ادب کو سنوارنے اور تہذیب کو نکھارے اور اپنے کھیل کود سے لوگوں کے دل جیت کر اتفاق واتحاد اور بھائی چارہ کی پرانی فضا قائم کرے، بلکہ اپنے ہر فکر اور ہر عمل میں ملک کی تعمیر اور خوش حالی کو مقدم رکھے۔ سماجی زندگی کے اشتراکی ڈھانچے اور ملک کی تشکیل نو میں حکومت سے اتفاق کرے سیاسی اور معاشی مسائل کے حل کرنے میں خلوص نیت سے اپنا حق ادا کر دے خواہ وہ کسی حیثیت میں ہو۔

اور کیا یہ ڈاکٹر صاحب ہی کی خود دار شخصیت کا پرتو اور انتھک کوششوں کا نتیجہ نہیں کہ علیگڈھ آج پھر ہندستان کی قومی زندگی اور اس کی مشترکہ تہذیبی اور تمدنی روایات کی نمائندگی میں قیادت کر رہا ہے۔ قومی تحریکوں میں آج پھر علیگڈھ ہندوستان کی امیدوں کا مرکز بن گیا ہے قومی خودداری اور آزادی کے تحفظ میں آج کا علیگڈھ اپنے دشمنوں کے مدمقابل اسی طرح سینہ سپر ہے، جس طرح ایک زمانہ میں انگریز کے خلاف ہوا تھا۔ قومی ہمدردی کا جذبہ آج بھی وہی ہے جس کا اظہار علیگڈھ ۱۹۱۲ء میں کر چکا ہے جبکہ بلقان اور طرابلس کے مصیبت زدہ لوگوں کے لیے مولانا محمد علی جوہر نے چندہ کا اعلان کیا تھا اور طلباء نے ایک وقت فاقہ کر کے ہزاروں روپے جمع کر لیے تھے، جس طرح ٹرکی کی آزادی کو بچانے اور انگریزی کی جارحانہ کارروائیاں کے خلاف بیسیوں نوجوانوں کا ایک دستہ استنبول میں انگریزی گولیوں کے سامنے بے خطر سینہ سپر ہو گیا تھا ——— آج بھی گوا کی تحریک آزادی میں اپنا حق ادا کرنے کے لیے علیگڈھ کے نوجوان اپنے جوان تازہ لہو سے اپنے تمام گوا کو آزاد کرانے اور اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے غازی عبدالرحمٰن پشاوری کی طرح اپنی جان عزیز کو نثار کرنے کی قسم کھا سکتے ہیں، ایک وقت کا فاقہ کر کے ہزاروں روپے جمع کر سکتے ہیں، جن سے گوا کی جنگ آزادی میں شہید ہونے والوں کے پسماندگان کی مدد اور زخمیوں کی دوا دارو کی جا سکے۔ یو، پی اور بہار کے سیلاب زدہ، بے گھر، بے در انسانوں کے لئے اپنے تن کے کپڑے اتار کے دے سکتے ہیں، اپنا مختصر سا جیب خرچ بچا کر "نہرو فنڈ" کے لئے

سیکڑوں روپے نذر کر سکتے ہیں، آج کا علی گڑھ اپنی قوم کو سنوارنے اور ملک کو متمدن اور خوش حال بنانے کے خیال سے اپنی قوم کے غریب طلبا کی مشکلات کے حل کے لئے اپنے اخراجات گھٹا کر ہزاروں روپے سالانہ جمع کر سکتے ہیں ۔

لائق باپ کے لائق بیٹے سید محمود نے جس "اردو یونیورسٹی" کا خاکہ بنایا تھا، جس میں بڑی دور اندیشی اور حکمت و دانائی کے ساتھ ہندی اور سنسکرت کو بھی، ابتدائی کلاسوں سے لے کر اعلیٰ ترین معیار تک ایک متبادل زبان کی حیثیت دی گئی تھی، اور جس اردو یونیورسٹی کی شکل دیکھنے کو نواب وقارالملک بے تاب رہے تھے ــــــــ کیا ڈاکٹر صاحب نے اپنے حسن تدبیر سے اس خاکہ کو ایسی عملی شکل نہیں دے دی جس میں ہندی اور اردو دونوں کا خوشگوار امتزاج ہے۔ آج اگر اس دیس کی زبان اور ذریعۂ تعلیم کا پیچیدہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسی خاکہ کو اپنانے سے !

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تہذیبی تاریخ مرتب کرنا اور تحقیق و تالیف کے ذریعہ سے اس کے کارناموں کو اُجاگر کرنا، کتنا اہم اور وقیع کام ہے، جو اب یونیورسٹی نے اپنے ذمہ لیا ہے، اس سلسلہ میں حکومت سے جو تعاون ملا ہے، کیا وہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی کاموں سے دلچسپی، اور ادارہ کو حکومت اور عوام کی نگاہ میں ایک اہم تعلیمی اور تحقیقی مرکز بنانے کے جذبۂ صادق اور بے غرض کوششوں کا ضامن نہیں !

اُردو نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو سنوارنے اور نظم و نثر کے خزائن بیش بہا سے ہندوستانی شعر و ادب کو مالا مال کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، ہندوستانی فلسفہ و تاریخ، سیاست و معاشرت، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کے علوم و فنون کی اشاعت و ترقی میں جو اہم حصہ لیا ہے، ہندوستان کے سیکڑوں گاؤں اور دیہاتوں کے لوک گیتوں اور روایتی کہانیوں کو جس حسن و خوبی سے یکجا کیا ہے، اس کا اندازہ لگانا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہوگا جسے یونیورسٹی ابتک محض محدود وسائل کی بنا پر شروع نہ کر سکی تھی، لیکن اب ڈاکٹر صاحب کے اِن کاموں سے ذوق و شوق اور جد و جہد سے ایک ایسا تحقیقی شعبہ

قائم ہوسکا ہے جو نہ صرف ہند و پاک میں اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے واحد ہے بلکہ سرسید کی اُردو یونیورسٹی کے خواب کی اصل تعبیر ہے ۔

اس علی گڑھ کو جسے تقسیم ہند کے بعد فرقہ پرست اور تنگ نظر نفرت کی آگ میں جھونک جھونک خاکستر کردینا چاہتے تھے ———— کیا ذاکر صاحب نے اپنے خلوص، مصلحت بینی اور موقع شناسی کے ساتھ اپنے جسم اور دل و دماغ کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو مٹا کر نہ صرف مٹنے سے بچا لیا بلکہ ناامیدی میں امید، بے دلی میں ولولہ اور بدنظمی میں نظم پیدا کر کے علی گڑھ یونیورسٹی کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ایک امتیازی مقام پر نہیں پہنچا دیا !!!

سرور صاحب نے ذاکر صاحب کے متعلق کیا خوب کہا ہے ؎

زمانہ جس کی تلاش میں تھا، یہی ہے ہمدم وہ مرد دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ مزاج جس کا قلندرانہ
وہ جس کا دستور حق پسندی وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثار بے کراں کا ہے معترف آج تک زمانہ
جلال بھی ہے جمال بھی ہے یہ شخصیت کا کمال کہیئے
خیال میں بجلیاں پُر افشاں لبوں پہ اک دلربا ترانہ
وہ جس کی تحریر سے ہویدا جہان میں حکمت کلیمی
وہ جس کی تقریر سے جھلکتی ہوئی تب و تاب غازیانہ
سکوں ساحل سے کون دیکھے کنارِ ساحل کے کون سمجھے
کسی کا موجوں سے جنگ کرنا کسی کا طوفاں کو آزمانا
وہ جس کی چشم ستارہ بیں نے فلک بھی دیکھا جہاں بھی دیکھا
پسند لے دے کے جس کو آیا مگر کچھ اپنا ہی آشیانہ